مقالات دار العلوم ماٹلی والا

علوم القرآن (امثال القرآن، رسم عثمانی، مصحف کی ترتیب) تجوید وقراءت میں قراء گجرات کی خدمات، اجتہادات صحابہ ومقاصد شریعت، علماء گجرات کی حدیثی خدمات ، بعض محدثین گجرات کی دینی، علمی اور تصنیفی خدمات، نصاب تعلیم کی سفارشات، ختم نبوت کے سلسلہ میں حضرت نانوتویؒ کی خدمات جیسے مختلف موضوعات پر لکھے گئے چند مقالات کا مجموعہ

مقالہ نگار

(حضرت مولانا) اقبال بن محمد ٹنکاروی (صاحب مدظلہ العالی)

(مہتمم وشیخ الحدیث دار العلوم ماٹلی والا)

تفصیلات

نام کتاب: مقالات دارالعلوم ماٹلی والا

مقالہ نگار : حضرت مولانا اقبال بن محمد ٹنکاروی (صاحب)

(مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم ماٹلی والا)

صفحات : ۴۳۷

طباعت : اگست ۲۰۱۶ء مطابق ذی القعدہ ۱۴۳۷ھ (طباعت اول)

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : ۲۰۰

ملنے کا پتہ

MO.IQBAL MUHAMMAD [S.B] { Tankarvi }

DARULULOOM ISLAMIYYAH ARBIYYAH

MATLIWALA

Eidgah Road.Bharuch.GUJ. INDIA -392001

E-mail : mct_1969@yahoo.co.in

Website: www.matliwala.co.in

فہرست مضامین

امثال القرآن

تاریخ گجرات کے مختلف ادوار اور تجوید و قراءت کے احوال

رسم عثمانی اور مصاحف عثمانیہ: تعارف و تاریخ، اہمیت اور تصانیف

مسئلۂ ختم نبوت اور حضرت نانوتوی کی خدمات

صحابہ کا امتیازی وصف: اجتہادات میں مقاصد شریعت کی رعایت

قرون وسطی میں گجرات کے علمائے کرام کی حدیثی خدمات

خطبۂ افتتاحیہ

نصاب تعلیم

محدث کبیر حافظ بخاری شیخ عبدالملک عباسی بمبانیؒ

نامور عالم نورالدین بن محمد صالح صدیقی احمد آبادیؒ

شاہ وجیہہ الدین احمد بن نصر اللہ علوی گجراتی

محمد بن طاهر الفتنى فى ضوء شخصيته ومجمع بحار الأنوار

باسمہ سبحانہ وتعالی

مقدمہ

حضرت مولانا مفتی اقبال صاحب ٹنکاروی

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین ، وعلی آلہ وصحبہ اجمعین . اما بعد!

مختلف موضوعات پر لکھے گئے یہ چند مقالات کا مجموعہ ہے ، یہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری، رابطہ ادب اسلامی گجرات شاخ، جامعہ القراءات کفلیتہ کا تجوید وقراءت سمینار اور ماہنامہ صوت القرآن احمد آباد وغیرہ کے لئے لکھے گئے ہیں ،اس سے پہلے فقہی مقالات کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے،صوبۂ گجرات اور عرب مما لک کے تعلقات والا مقالہ بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

عزیزی مولانا رشید منوبری صاحب نے ان مقالات کو شائع کرنے کا تقاضہ کیا اور خود ہی سب کو جمع کر کے ترتیب دے کر میرے پاس لائے ،ان مقالات میں حضرت نانوتوی والا مقالہ مولانا رشید صاحب کا ہی تحریر کردہ ہے، بندہ نے جزوی ترمیم کر کے اس کو بھی شامل کرلیا ہے،ایک مقالہ اللغة العربية فی الهند طویل اور عربی زبان میں ہے،لہذا اس کو شامل اشاعت نہیں کیا ہے۔

بندہ ان مقالات کو قابل اشاعت نہیں سمجھتا تھا،لیکن قرآنیات اور محدثین گجرات

کے بارے میں ذہن میں یہ بات آئی کہ اپنے طالب علم بھائیوں کے فائدے کے پیش نظر اس کو شائع کرنا اپنی نجات کا ذریعہ ہو جائے، کل قیامت میں قرآن شریف میرا سفارشی بن جائے، اور وہ محدثین گجرات جو خود وقت کے بڑے مشائخ میں سے تھے، ان کی بھی توجہ شامل ہو کر پُل صراط سے گزرنا آسان ہو جائے، تو یہ سودا سستا ہے، حق تعالی اخلاص واستخلاص کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین..

اظہار تشکر:

اس موقع پر حسب سابق عزیزم مولانا رشید احمد صاحب منوبری کا ممنون ومشکور ہوں کہ آپ نے مختلف مراحل سے گزار کر ان مقالات کو قابل اشاعت بنانے کی جہد مسلسل فرمائی، اسی طرح مولانا یوسف سندراوی صاحب کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے کتابت، مسودہ، مبیضہ کے تمام مراحل کو مکمل کیا، اسی طرح مولانا یٰسین صاحب کرماڈی کا بھی مشکور ہوں؛ انہوں نے بھی چند مقالات تحریر فرما کر ممنون فرمایا، حق تعالی شانہ ان تمام حضرات کے علمی، عملی وروحانی درجات میں ترقی نصیب فرمائے۔

آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم.

۵/ ذی القعدہ ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۹/ اگست ۲۰۱۶

امثال القرآن

یہ مقالہ اردو ماہنامہ ''صوت القرآن'' کے لئے لکھا گیا تھا، اس میں امثال القرآن کی اہمیت وغرض اور اقسام پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، نیز اس علم کے فوائد اور امثال القرآن کے موضوع پر لکھی گئی تصنیفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

امثال القرآن

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين .

اعوذ بالله من الشيطن الرجيم

بسم الله الرحمن الرحیم

وتلك الامثال نضربها للناس وما يعقلها الا العالمون. (العنکبوت:۴۳)

ترجمہ: اور یہ مثالیں جس کو ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے واسطے اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے۔

ولقد ضربنا للناس في هذا القران من كل مثل لعلهم يتذكرون . (الزمر: ۲۷)

ترجمہ:۔ اور ہم نے بیان کی لوگوں کے واسطے اس قرآن میں سب چیز کی مثال تا کہ وہ دھیان کریں۔

اخرج البيهقي عن ابي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : ان القرآن نزل على خمسة اوجه : حلال وحرام ومحكم ومتشابه وامثال، فاعلموا بالحلال ، واجتنبوا الحرام، واتبعوا المحكم ، وآمنوا بالمتشابه واعتبروا بالامثال. (البرهان في علوم القرآن :ص/۴۸۶)

امام بیہقی حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قرآن کریم پانچ وجوہ پر نازل ہوا: (۱) حلال (۲) حرام (۳) محکم (۴) متشابہ (۵) امثال؛ لہذا حلال کو سیکھو اور حرام سے پرہیز کرو، محکم کی پیروی کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال سے عبرت حاصل کرو۔

وعن علی ان رسول اللہ ﷺ قال: إن الله أنزل القرآن امرًا وزاجرًا وسنة خالية ومثلاً مضروبا. (مباحث فی علوم القرآن :ص/۲۸۲)

علامہ ماوردیؒ نے فرمایا کہ قرآنی علوم میں علم الامثال بہت ہی اہم علم ہے اور لوگ اس سے غفلت میں ہیں، وہ مثال سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن جس مقصد کے لئے مثال بیان کی جاتی ہے اس سے ناواقف ہوتے ہیں جبکہ مثال بغیر ممثل کے ایسی ہے جیسے گھوڑا بغیر لگام اور اونٹنی بغیر نکیل کے ہو۔ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ مجتہد کے لئے جن علوم قرآنیہ کی معرفت واجب ہے؛ ان میں سے علم الامثال بھی ہے۔ (البرہان:ص/۴۸۶)

شیخ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ حق تعالی شانہ نے اپنے کلام میں امثال وعظ وتذکیر کے لئے بیان فرمائی ہیں، بہت سی تمثیلات ثواب وعقاب اور حسنات وسیئات کے اعتبار سے تفاوت درجات اور ان کے ثمرات ونتائج اور ترغیب وترہیب پر مشتمل ہیں۔

امثال سے یہ غرض ہوتی ہے کہ مراد کو عقل سے اس طرح قریب کردیا جاوے کہ وہ معقول کے مرتبہ سے تجاوز کر کے سامع کے ذہن میں محسوسات کی شکل اختیار کرلے، اگر کوئی معنوی خفاء ہے تو وہ بھی دور ہوجائے، اگر کسی شیٔ کی عظمت بیان کرنی ہے تو اس کی حقیقی اور واقعی عظمت نمایاں ہوجائے، اگر کسی شیٔ کی حقارت ظاہر کرنی ہے تو وہ بھی اچھی طرح

ہوجائے ،اگر پائیداری اورقوت یا ضعف وناپائیداری بیان کرنا ہےتو وہ بھی بخوبی سامعین کے ذہنوں میں راسخ ہوجائے۔

اسی لیے اللہ تعالی نے بطور امتنان وتشکر فرمایا: ”وضربنا لکم الامثال“ یعنی ہم نے تمہارے لیے مثالیں بیان فرمائیں۔

علامہ زرکشیؒ ”البرھان فی علوم القرآن“ میں فرماتے ہیں کہ امثال کی حکمتوں میں سے ایک حکمت بیان ووضاحت ہے اور یہ شریعت مطہرہ کے خصائص میں سے ہے ،علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ تمثیل معانی وحقائق کی وضاحت کے لیے ذکر کی جاتی ہیں،جس چیز کی مثال بیان کی جاتی ہے اگر وہ عظیم الشان ہےتو مثال بھی اسی انداز میں عظمت والی ہوگی اور اگر ممثل لہ حقیر ہے تو مثال بھی حقیر ہوگی ،مگر یہ عظمت وحقارت مثال کے اعتبار سے نہیں ہوتی ہے بلکہ ممثل لہ کے حال کے مطابق ہوگی ،حق کے واضح ہونے کی وجہ سے نور اور روشنی سے اور باطل کے مبہم اور غیر واضح ہونے کی وجہ سے ظلمت وتاریکی سے اس کی تمثیل بیان کی جاتی ہے، چنانچہ کفر کی کمزوری وضعف کے اعتبار سے مکڑی کے جالے سے اس کی تمثیل ذکر کی گئی ہے،اس پر مشرکین یا یہود نے اعتراض کیا کہ اللہ تعالی ایسی حقیر اشیاء کی مثال ذکر نہیں کر سکتے۔

علامہ عثمانیؒ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شرم وعار کی بات نہیں کہ اللہ تعالی مچھر یا اس سے بڑی چیز مثل مکھی اور مکڑی کی مثال بیان فرمائے ، کیونکہ مثال سے توضیح وتفصیلِ ممثل لہ مطلوب ہوتی ہے،حقارت وعظمت سے کیا بحث؟ اور یہ

مطلوب جب ہی حاصل ہوگا جبکہ مثال اور ممثل لہ میں پوری طرح پر مطابقت ہو، ممثل لہ حقیر ہوگا تو اس کی مثال بھی حقیر ہونی چاہئے ورنہ تمثیل بیہودہ سمجھی جائے گی، ہاں اگر تمثیل میں یہ ہوتا کہ مثال اور مثال دینے والے میں موافقت ضروری ہوتی تو بے وقوفوں کا یہ اعتراض چل سکتا؛ مگر اس کا تو کوئی بے وقوف بھی قائل نہ ہوگا اور تورات وانجیل وکلام حکماء وسلاطین میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں، اس کے خلاف کہنا کفار کی حماقت وعناد کی بات ہے۔(ترجمہ شیخ الہند فوائد عثمانی:ص/۷)

دوسری آیت "وتلك الامثال نضربها للناس وما يعقلها الا العالمون".
(العنكبوت : ٤٣) سے پہلے مکڑی کی مثال بیان فرمائی، پھر یہ آیت کریمہ ارشاد فرمائی، حاصل یہ ہے کہ مثالیں اپنے موقع کے لحاظ سے نہایت موزون اور ممثل لہ پر پوری منطبق ہیں، مگر سمجھدار ہی اس کا مطلب ٹھیک سمجھتے ہیں، جاہل بے وقوف کیا جانیں؟

بعض سلف سے منقول ہے کہ جب میں قرآن کریم کی کسی مثال کو سنتا ہوں اور اس کو نہیں سمجھتا ہوں تو اپنے اوپر روتا ہوں، اس لئے کہ حق تعالی شانہ فرماتے ہیں: "وما يعقلها الا العالمون" یعنی اس کو اہل علم ہی سمجھتے ہیں (گویا میں اہل علم میں سے نہیں ہوں)۔

ربیع بن انس فرماتے ہیں: مچھر کی مثال اللہ تعالی نے دنیا کے لئے بیان فرمائی ہے، مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے زندہ رہتا ہے اور جب کھا کر موٹا ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے، اسی طرح اہل دنیا جب دنیا سے خوب سیر اور سیراب ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالی ان کو پکڑتا ہے پس وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ صحیح المزاج اور سلیم الفطرت جب ان تمثیلات کو سنتے ہیں اور ان میں تفکر و تامل کرتے ہیں تو ان کی ہدایت میں اضافہ ہوتا ہے اور جن کی روح فاسد و خراب ہو چکی ہو ان کو ان تمثیلات سے کوئی نفع نہیں ہوتا، ان کی گمراہی میں اور زیادتی ہوتی ہے، اس لئے قرآن کریم نے فرمایا: "یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا"۔

لفظ "مثال" کا استعمال:

مثال کا لفظ حال، صفت اور قصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (۱) استعارۂ حال کی مثال "مثلهم کمثل الذی استوقد نارا" (توبه :۱۷) ترجمہ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔ (۲) استعارۂ وصف کی مثال "ولله المثل الاعلی". (نحل: ٦٠) ترجمہ: اور اللہ کی مثال سب سے اوپر ہے۔ "ذالك مثلهم فی التورات و مثلهم فی الانجیل. (فتح: ۲۹) ترجمہ: اور یہ ان کی مثال ہے تورات میں، اور ان کی مثال ہے انجیل میں۔ "کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلدا. (بقره :٢٦) ترجمہ: سو ان کی مثال ایسی ہے جیسے صاف پتھر کہ اس پر پڑی ہے کچھ مٹی، "کمثل العنکبوت اتخذت بیتا. (عنکبوت : ٤١) ترجمہ: جیسے مکڑی کی مثال بنالیا اس نے ایک گھر۔ کمثل الحمار یحمل اسفارا (الجمعه : ٥) ترجمہ: جیسے مثال گدھے کی پیٹھ پر لے چلتا ہے کتابیں۔ (۳) استعارۂ قصہ کی مثال: "مثل الجنة التی وعد المتقون". (رعد: ۳)، ترجمہ: اور جنت کا حال جس کا وعدہ ہے پرہیزگاروں سے۔

مِثْل اور مَثَل دونوں ایک ہے یا دونوں میں فرق ہے؟

بعض حضرات نے مِثْل اور مَثَل کو ایک ہی قرار دیا ہے، ہوسکتا ہے کہ ان کی مراد

اصل یعنی تشبیہ کے اعتبار سے ہو؛ ورنہ علامہ ابن العربیؒ مِثل اور مَثَل میں فرق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مِثل محسوسات کو تشبیہ دینے کیلئے اور مَثَل معانی معقولہ کو تشبیہ دینے کیلئے استعمال ہوتی ہے، کچھ حضرات نے دونوں کے مساوی ہونے کا انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر دونوں کو مساوی قرار دیا جاتا ہے تو دو آیات "لیس کمثلہ شیئا اور وللہ المثل الاعلی" کے درمیان تضاد نظر آتا ہے، کیونکہ پہلی آیت مثل کی نفی کرتی ہے اور دوسری اثبات کرتی ہے، امام رازیؒ نے دونوں میں یوں فرق کیا ہے کہ "مِثل" وہ ہے جو کسی شیئ کی تمام ماہیت میں مساوی ہو اور "مَثَل" وہ ہے جو ماہیت کے علاوہ بعض خارجی صفات میں دوسری چیز کے مساوی ہو۔

اقسام امثال:

علمائے تفسیر نے امثال قرآنی کو درج ذیل تین اقسام میں تقسیم کیا ہے:

(۱) الامثال الصریحہ: جس میں لفظ مثل یا تشبیہ پر دلالت کرنے والا کوئی بھی لفظ پایا جاتا ہے، یہ قرآن کریم میں بہت کثرت سے ہیں۔

(۲) الامثال الکامنہ: جس میں صراحۃ لفظ تمثیل نہ ہو لیکن اختصار کے ساتھ اچھے معانی پر دلالت کرتی ہو، تشبیہ کی طرف اس تمثیل کا وقوع صحیح ہو اس کی مثال (۱) والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا و كان بين ذالك قواما. ترجمہ: اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرنے لگیں نہ بے جا اڑائیں اور نہ تنگی کریں اور رہے اس کے بیچ میں ایک گزران۔ (۲) ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا. ترجمہ: اور نہ رکھ ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھول اس کو بالکل کھول دینا، پھر تو

بیٹھ رہے، الزام کھایا، ہارا ہوا۔ ان دونوں آیات میں میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم دی گئی ہے۔ خیر الامور اوسطھا.

(۳) الامثال المرسلۃ :۔ وہ جملے جو تشبیہ کی تصریح کے بغیر ہی امثال و کہاوت کے طور پر مستعمل ہوں، اس کی مثال بھی قرآن کریم میں بہت ہیں جیسے (۱) لکل نبأ مستقر وسوف تعلمون . (ترجمہ) ہر ایک خبر کا ایک وقت مقررہ ہے اور قریب ہے کہ اس کو جان لوگے۔ (۲) ولا یحیق المکر السئی الا باھلہ . (ترجمہ) اور برائی کا داؤ الٹے گا انہیں داؤ والوں پر۔ (۳) ھل جزاء الاحسان الا الاحسان . (ترجمہ) نہیں ہے نیکی کا بدلہ مگر نیکی۔ (۴) لمثل ھذا فلیعمل العاملون. (ترجمہ) اور ایسی چیزوں کے واسطے چاہیے محنت کریں محنت کرنے والے۔ (المدخل: ص/۴۹۶)

مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم امثال کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: قرآن کریم میں جو امثال مذکور ہوئیں ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ امثال جو کسی بات کو سمجھانے کیلئے تمثیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں، مثلاً: مثل الذین ینفقون اموالھم الخ.. اس قسم کی تمثیلات بات کو پوری طرح واضح کرنے اور مؤثر بنانے کیلئے لائی گئی ہے۔

امثال کی دوسری قسم وہ ہے جسے اردو میں کہاوت کہتے ہیں، اسی قسم کی امثال قرآن کریم میں دو طرح مذکور ہوئی ہیں، بعض تو وہ ہیں جو نزول قرآن کے بعد ہی کہاوت بنیں، گویا ان کا موجد ہی قرآن ہیں، مثلاً: ھل جزاء الاحسان الا الاحسان . ترجمہ: اچھائی کا بدلہ اچھائی کے سوا اور کچھ نہیں اور وان تعفوا اقرب للتقوی. (ترجمہ) اور معاف کر دو تو یہ تقوی کے زیادہ قریب ہے۔

کہاوتوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں صراحۃ کوئی کہاوت تو مذکور نہیں مگر آیت کے مفہوم سے نکلتی ہے، گویا وہ یا تو عوامی ضرب الامثال کا سرچشمہ ہیں یا ان کی طرف دلالت کرتی ہے، ایسی امثال کو امثال کامنہ کہا جا سکتا ہے، اس کی قرآن کریم میں بے شمار مثالیں ہیں، مثلا ایک عربی کہاوت مشہور ہے:"لیس الخبر کاعیان" شنیدہ کے بود مانندۂ دیدہ، سنا ہوا دیکھے ہوئے کے مانند کہاں ہوسکتا ہے، یہ قرآن کریم کی مندرجۂ ذیل آیت میں موجود ہے "بلی ولکن لیطمئن قلبی." اسی طرح مثل مشہور ہے "لایلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین" مسلمان کو ایک سراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا، یہ سورۂ یوسف کی اس آیت میں موجود ہے "هل امنكم عليه الا كما امنتكم على اخيه من قبل "کیا میں تمہیں اس کے بارے میں ایسا ہی امانت دار سمجھوں جیسا کہ پہلے اس کے بھائی کے بارے میں سمجھتا تھا۔ (اختصار از علوم القرآن:ص/ ۳۱۸-۳۲۰)

امثال مصرحہ:

اس کی مثال مثلا سورۂ بقرہ کی آیت "كمثل حبة انبتت سبع سنابل فی كل سنبلة مائة حبه " میں انفاق فی سبیل اللہ کے اجر کو محسوس ومشاہد صورت میں ظاہر کیا گیا کہ جس طرح زمین پر ڈالے ایک دانۂ گندم سے دنیوی کھیتی میں سات دانے انسان کو حاصل ہوجاتے ہیں اسی طرح آخرت کی کھیتی کا بھی حال ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر جس کیلئے اللہ چاہے تو ایک حسنہ کو سات سو نیکیوں کے ثواب تک بڑھاتا ہے؛ اگر انسان ایمان واخلاص کے ساتھ اللہ کے راہ میں خرچ کرے۔

لیکن یہی انفاق مال بغیر ایمان وتقویٰ محض ریاء اور حُب جاہ کیلئے کیا جائے تو اس

کی مثال: ”فمثله کمثلِ صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلدا“ تو ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو) جس پر کچھ مٹی ہو (اور اس مٹی میں دانہ ڈالنے سے کچھ گھانس پھونس سا بھی پیدا ہوگیا) پھر اس پر زور کی بارش پڑی تو اس نے اس پتھر کو (جیسا تھا اسی طرح) صاف چکنا بنا ڈالا۔

ان کلمات نے مخاطب کے سامنے اس صورت کو محسوس کر کے دکھا دیا کہ انفاق ایمان واخلاص کے ساتھ نفع بخش کھیتی کے مانند ہے اور یہی بذلِ مال اور صرفِ دولت بغیر ایمان وتقویٰ کے کسی چکنے پتھر پر تخم ریزی کی طرح ہے۔

پھر اس تمثیل کے بعد ایک اور بلیغ تمثیل اس معنی کے لئے ارشاد فرمائی کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے اعمال کو اضاعت وبربادی سے بچائے اور ان اعمال کو اس وقت کیلئے کارآمد ذخیرہ بنانے کی فکر کرے جبکہ ہر طرح بے سہارا ہوگا۔

اگر وہ منافع عاجلہ؛ حب جاہ اور احسان جتلانے کی وجہ سے اپنے اعمال کو ضائع کرتا ہے تو اس کا حال تباہی، بربادی اور حسرت ویاس میں بس ایسا ہے جیسا کہ ایک شخص کا باغ ہو جس میں ہر قسم کے پھل اور طرح طرح کے میوے ہوں، اس میں نہریں بہتی ہوں، شادابی کی کوئی حد وانتہا نہ ہو، جب وہ بڑھاپے کو پہنچا اور حال یہ کہ اس کی اولاد چھوٹی ناسمجھ ہو یعنی ایسی نہیں ہے کہ اس کو کما کر کچھ کھلاوے، تو ایسے ضعف وپیرانہ سالی اور بے چارگی کے زمانہ میں۔ جبکہ اس کی تمام تر امیدیں اسی باغ کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ناگہاں ایک آگ آئی اور بگولوں نے اس باغ کو جلا کر خاک کر ڈالا، تو یہی حال اس شخص کے نفقہ کی بربادی کا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے احسان جتائے اور ایذاء پہنچائے اور پھر امید لگائے ہو کہ قیامت میں یہ عمل میرے کام آئے گا۔

چنانچہ اس مضمون کو ان کلمات میں ارشاد فرمایا گیا: ایود احدکم ان تکون له جنة من نخیل واعناب تجری من تحتها الانهار له فیها من کل الثمرات واثابه الکبر وله ذریة ضعفاء فاصابها اعصار فیه نار فاحترقت .

کیا پسند کرتا ہے تم میں سے کوئی شخص اس بات کو کہ اس کے واسطے ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا، اس باغ کے نیچے بہتی ہوں نہریں اور ایسا باغ کہ اس مالک کے واسطے اس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور حال یہ کہ اس کو بڑھاپا پہنچا اور اس کے چھوٹے بچے ہیں ، ناگہاں اس باغ پر ایک آندھی پہنچی جس میں آگ تھی؛ پس اس نے جلا ڈالا باغ کو۔

تو اس تمثیل کے ذریعہ خداوند عالم نے لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی کے مضمون کی ایسی حقیقت واضح فرمائی کہ گویا آنکھوں سے حبط اعمال اور بربادی صدقات کا منظر نظر آنے لگا۔

اسی طرح ایمان اور عمل صالح کی پائیداری اور کفر وشرک کا ضعف واضمحلال مخاطب کی نگاہوں کے سامنے اس طرح ظاہر فرمایا گیا: الم تر کیف ضرب الله مثلا کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء تؤتی اکلها کل حین باذن ربها ویضرب الله الامثال للناس لعلهم یتذکرون. ومثل کلمة خبیثة کشجرة خبیثة اجتثت من فوق الارض ما لها من قرار . (ابراهیم:۲۴-۲۶)

کیا نہیں دیکھا اے مخاطب! کہ کیسی مثال بیان کی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی، وہ ایک پاکیزہ درخت کے مانند ہے جس کی جڑ مضبوطی کے ساتھ زمین میں قائم ہے اور اس کی شاخیں بلندی میں آسمان تک پہنچ رہی ہیں، وہ درخت اپنا پھل دے رہا ہے ہر حال اور ہر زمان میں اپنے رب کی قدرت واجازت سے، (غرض) اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے،

امید ہے کہ وہ نصیحت قبول کرلیں۔

مثال کلمہ خبیثہ (کفر وشرک) کی اس ناپاک درخت کی سی ہے جس کو زمین پر اکھاڑ پھینکا گیا، جس کے واسطے کوئی مضبوطی اور قرار نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں، طوالت کے خوف سے صرف وہ اجمالی عناوین ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو علامہ ابن قیم الجوزی نے اپنی کتاب ''امثال القرآن'' میں ذکر کیے ہیں:

(۱) منافقین (۲) مؤمنین (۳) کفار و مؤمنین (۴) دنیوی زندگی (۵) غیر اللہ کو کارساز بنانے والے (۶) اعمال کفار (۷) اصحاب ظلمات (۸) منکرین توحید ورسالت کی چوپایوں سے مثال (۹) شرک کے خلاف (۱۰) نادار غلام وشریف مالدار (۱۱) معبود حق ومعبودان باطل (۱۲) قرآن پاک میں تدبر کرنے سے اعراض کرنے والے (۱۳) غیر عامل حاملین کتاب (۱۴) مکذبین آیات (۱۵) بدگمانی وغیبت سے اجتناب (۱۶) اعمال کفار کی مثال (۱۷) کلمہ طیبہ وخبیثہ (توحید اور شرک کی مثال) (۱۸) اوثان وقول زور (۱۹) طالب ومطلوب کی بے بسی (۲۰) کفار کی مثال (۲۱) راہ خداوند تعالی میں خرچ کرنے والے (۲۲) صدقہ کو ریا کاری سے مٹانے والے (۲۳) غیر طاعت میں انفاق (۲۴) مشرک وموحد کی مثال (۲۵) حضرت لوط ونوح علیہما السلام کی عورتوں کی مثال (۲۶) حضرت مریم وآسیہ کی مثال۔

امثال کا منبہ:

حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں ابواسحاق کے حوالے سے نقل کیا

ہے کہ میرے والد نے حسین بن فضل سے عرض کیا کہ آپ عرب وعجم کی امثال قرآن کریم سے نکالتے ہیں تو "خیر الامور اوسطها" (کاموں میں بہترین اس کا درمیانی ہے) کو قرآن میں پاتے ہو؟ فرمایا: ہاں، چار جگہ پاتا ہوں:

(۱) لا فارض ولا بکر عوان بین ذلك. (البقرہ: ٦٨)

ترجمہ: نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی، درمیان میں ہے بڑھاپے اور جوانی کے۔

(۲) والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلك قواما. (الفرقان: ٦٧)

ترجمہ: اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرنے لگیں، نہ بے جا اڑائیں اور نہ تنگی کریں اور ہے اس کے بیچ میں ایک گزران۔

(۳) ولا تجعل یدك مغلولة الی عنقك ولا تبسطها کل البسط. (الاسراء: ۲۹)

ترجمہ: اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھول دے اس کو بالکل کھول دینا۔

(٤) ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بین ذلك سبیلا. (الاسراء ١١٠)

ترجمہ: اور پکار کر مت پڑھ اپنی نماز اور چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔

(۲) میں نے کہا: کیا قرآن مجید میں " من جهل شیئا عاداه" کو پاتے ہو؟ (جو

آدمی کسی چیز سے جاہل ہوتو وہ اس چیز کا دشمن ہوتا ہے) فرمایا: جی ہاں ۔

(۱) بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه .(یونس :۳۹)

ترجمہ: بلکہ وہ جھٹلانے لگے جس کے سمجھنے پر انہوں نے قابو نہ پایا۔

(۲) واذ لم یهتدوا به فسیقولون هذا افك قدیم .(الاحقاف : ۱۱)

ترجمہ: اور جب راہ پر نہیں آئے اس کے بتلانے سے؛ تو یہ اب کہیں گے: یہ جھوٹ ہے بہت پرانا۔

(۳) میں نے دریافت کیا کہ کیا احذر شر من احسنت الیه (تو جس کے ساتھ حسن سلوک کرے اس کے شر سے بچتا رہ) کو قرآن شریف میں پاتے ہو؟ فرمایا: ہاں ۔

وما نقموا الا ان اغنٰهم الله ورسوله من فضله. (التوبه: ۷۴)

ترجمہ: اور یہ سب کچھ اس کا بدلہ تھا کہ دولتمند کردیا ان کو اللہ تعالی نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے۔

(۴) میں نے دریافت کیا کہ لیس الخبر کالعیان (سنا ہوا دیکھے ہوئے کے مانند نہیں ہوسکتا) کو پاتے ہو؟ فرمایا: قال او لم تؤمن قال بلی ولکن لیطمئن قلبی .

(البقرة : ۲٦۰)

ترجمہ: فرمایا: کیا تو نے یقین نہیں کیا؟ کہا: کیوں نہیں، لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جائے میرے دل کو۔

(۵) میں نے سوال کیا کہ فی الحرکات البرکات (حرکت میں برکت ہے)اس کو پاتے ہو؟ فرمایا:

ومن یهاجر فی سبیل الله یجد فی الارض مراغما کثیرا وسعةً .(النساء: ۱۰۰)

ترجمہ: اور کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں؛ پائے گا اس کے مقابلہ میں جگہ بہت اور کشایش۔

(٦) میں نے عرض کیا: کما تدین تدان (جیسا کرے گا ویسا بدلہ دیا جائے گا) یہ ہے؟ فرمایا:

من یعمل سوءًا یجز به. (النساء: ۱۲۳)

ترجمہ: جو کوئی برا کام کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔

(۷) میں نے دریافت کیا کہ حین تلقی تدری (جب ملے گا تب پتہ چلے گا) کو پارہے ہو؟ فرمایا:

وسوف یعلمون حین یرون العذاب من اضل سبیلا . (الفرقان: ٤٢)

ترجمہ: اور آگے جان لیں گے جس وقت دیکھیں گے عذاب کو؛ کون بہت گمراہ ہے راہ سے۔

(۸) میں نے سوال کیا کہ لا یلدغ المؤمن من جحر مرتین (مؤمن ایک سراخ سے دو مرتبہ دھوکا نہیں کھا سکتا) اس کو پاتے ہو؟

فرمایا: هل آمنکم علیه الا کما امنتکم علی اخیه من قبل . (یوسف: ٦٤)

ترجمہ: کہا: میں کیا اعتبار کروں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا اس کے

بھائی پر۔

(۹) میں نے دریافت کیا کہ من اعان ظالما سلط علیه (جس نے کسی ظالم کی مدد کی وہ ظالم اس پر ہی مسلط ہوگا) اس کو قرآن شریف میں پاتے ہو؟ فرمایا: کتب علیه انه من تولاه فأنه یضله و یهدیه الی عذاب السعیر. (الحج: ٤)

ترجمہ: جس کے حق میں لکھ دیا گیا ہے کہ جو کوئی اس کا رفیق ہو سو اس کو بہکائے اور لے جائے دوزخ کے عذاب میں۔

(۱۰) میں نے سوال کیا کہ لا تلد الحیة الا حیة (سانپ کا بچہ سنپولیا) اس کو پاتے ہو؟ فرمایا:

ولا یلدوا الا فاجرا کفارا. (نوح: ۲۷) ترجمہ: اور جو جنیں گے سو ڈھیٹھ حق کا منکر۔

(۱۱) میں نے عرض کیا کہ للحیطان آذان (دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں) اس کو پاتے ہو؟ فرمایا:

وفیکم سمّٰعون لهم. (التوبة:٤٧) ترجمہ: اور تم میں بعضے ان کے جاسوس ہیں۔

(۱۲) میں نے دریافت کیا الجاهل مرزوق والعالم محروم (جاہل کو رزق دیا جاتا ہے اور عالم محروم ہوتا ہے) اس کو پاتے ہو؟ فرمایا: من کان فی الضلٰلة فلیمدد له الرحمن مدا. (مریم: ۷۵)

ترجمہ: جو بھٹکتا رہا سو چاہے اس کو رحمٰن کھینچ لے جائے لمبا۔

(۱۳) میں نے کہا کہ الحلال لايأتيك الا قوتا، والحرام لا يأتيك الا جزافا (حلال بقدر کفاف ہی ملتا ہے اور حرام بغیر اندازے کے آتا ہے) اس کو پاتے ہو؟ فرمایا:

اذ تأتيهم حيتانهم يوم سبتهم شرعا ويوم لا يسبتون لا تأتيهم . (اعراف : ١٦٣)

ترجمہ: جب آنے لگیں ان کے پاس مچھلیاں ہفتہ کے دن پانی کے اوپر اور جس دن ہفتہ نہ ہوتو نہ آتی تھیں۔ (الاتقان: ص/ ۱۰۲۹)

امثال مرسلہ: جو کہاوت کی طرح نظم قرآنی میں مستعمل ہو۔

(١) ليس لها من دون الله كاشفة . (النجم: ٥٨) کوئی نہیں اس کو اللہ کے علاوہ کھول کر دکھانے والا۔

(٢) لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون . (آل عمران: ٩٢) ہرگز نہ حاصل کر سکو گے نیکی میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ۔

(٣) الآن حصحص الحق . (يوسف: ٥١) ترجمہ: اب کھل گئی سچی بات۔

(٤) وضرب لنا مثلا ونسي خلقه. (يس:٧٨) ترجمہ: اور بٹھلاتا ہے ہم پر ایک مثل اور بھول گیا اپنی پیدائش۔

(٥) ذلك بما قدمت يداك. (الحج: ١٠) ترجمہ: یہ اس کی وجہ سے جو

آگے بھیج چکے تیرے دو ہاتھ۔

(٦) قضی الامر الذی فیه تستفتین. (یوسف: ٤١) ترجمہ: **فیصل ہوا وہ کام جس کی تحقیق تم چاہتے تھے۔**

(٧) الیس الصبح بقریب. (هود: ٨١) ترجمہ: **کیا صبح نہیں ہے نزدیک۔**

(٨) وحیل بینهم وبین ما یشتهون. (سبأ: ٥٤) ترجمہ: **اور رکاوٹ پڑ گئی ان میں اوران کی آرزو میں۔**

(٩) لکل نبأ مستقر. (الأنعام: ٦٧) ترجمہ: **ہرایک خبر کا ایک وقت مقرر ہے۔**

(١٠) ولا یحیق المکر السیئ الا باهله. (فاطر: ٤٣) ترجمہ: **اور برائی کا داؤ الٹے گا انہی داؤ والوں پر۔**

(١١) قل کل یعمل علی شاکلته. (الاسراء: ٨٤) ترجمہ: **تو کہہ ہرایک کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر۔**

(١٢) عسی ان تکرهوا شیئا وهو خیر لکم. (البقرة: ٢١٦) ترجمہ: **اور شاید کہ تم کو بری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں۔**

(١٣) کل نفس بما کسبت رهینه. (المدثر: ٣٨) ترجمہ: **ہرایک جی اپنے کئے کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔**

(١٤) ما علی الرسول الا البلغ. (المائده: ٩٩) ترجمہ: **رسول کے**

ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا۔

(۱۵) ما علی المحسنین من سبیل. (التوبہ : ۹۱) ترجمہ: نیکی والوں پر الزام کی کوئی راہ نہیں ہے۔

(۱۶) هل جزاء الاحسان الا الاحسان. (الرحمن : ٦٠) ترجمہ: اور نہیں بدلہ ہے نیکی کا مگر نیکی۔

(۱۷) کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة . (البقرة : ۲٤۹) ترجمہ: بارہا تھوڑی جماعت غالب ہوئی ہے بڑی جماعت پر۔

(۱۸) الان وقد عصیت قبل . (یونس : ۹۱) ترجمہ: اب یہ کہتا ہے اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے۔

(۱۹) تحسبهم جمیعا وقلوبهم شتی. (الحشر: ۱٤) ترجمہ: تو سمجھے وہ اکھٹے ہیں اور ان کے دل جدا جدا ہو رہے ہیں۔

(۲۰) ولا ینبئك مثل خبیر. (فاطر: ۱٤) ترجمہ: اور کوئی نہ بتلائے گا تجھ کو جیسا بتلائے خبر رکھنے والا۔

(۲۱) کل حزب بما لدیهم فرحون. (الروم: ۳۲) ترجمہ: ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے اس پر خوش ہے۔

(۲۲) ولو علم الله فیهم خیرا لاسمعهم. (الانفال: ۲۳) ترجمہ: اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا۔

(۲۳) وقلیل من عبادی الشکور . (سبأ : ۱۳) ترجمہ: اور تھوڑے ہیں میرے بندوں میں سے احسان ماننے والے۔

(٢٤) لا يكلف الله نفسا الا وسعها. (البقرة: ٢٨٦) ترجمہ: اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے۔

(٢٥) قل لا يستوى الخبيث والطيب. (المائده: ١٠٠) ترجمہ: تو کہہ دے کہ برابر نہیں ناپاک اور پاک۔

(٢٦) ظهر الفساد فى البر والبحر. (الروم: ٤١) ترجمہ: پھیل پڑی ہے خرابی جنگل میں اور دریا میں۔

(٢٧) ضعف الطالب والمطلوب. (الحج: ٧٣) ترجمہ: بودا ہے چاہنے والا اور جن کو چاہتا ہے۔

(٢٨) لمثل هذا فليعمل العملون. (الصافات: ٦١) ترجمہ: ایسی چیزوں کے واسطے چاہئے محنت کریں محنت کرنے والے۔

(٢٩) وقليل ما هم. (ص: ٢٤) ترجمہ: اور تھوڑے لوگ ہیں ایسے۔

(٣٠) فاعتبروا ياولى الابصار. (الحشر: ٢) ترجمہ: سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو۔

امثال مرسلہ کا آپسی بول چال میں استعمال کا حکم:

امثال مرسلہ کے سلسلہ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ ہمارے محاورے میں اس کا استعمال بطور امثال کے کرسکتے ہیں یا نہیں؟ امام رازیؒ لكم دينكم ولى دين کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ لوگ اس آیت کو آپسی اختلاف ونزاع کے وقت بطور مثال کے استعمال کرتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم امثال کے لئے نازل نہیں ہوا ہے

، وہ تو غور وفکر اور عمل کرنے کے لئے نازل ہوا ہے، لیکن دوسرے مفسرین نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا ہے، مثلا کوئی شخص سخت مصیبت وتکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے؛ اس سے خلاصی ونجات کی کوئی راہ نہ ہو ایسے موقع پر کہا جاوے: لیس لھا من دون الله کاشفه تو کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن علماء تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ آیات قرآنیہ سے امثال کا ذکر کرنا ہزل ومزاح اور استخفاف کے طور پر نہ ہو، چنانچہ ایسے ہی موقع کے لئے ابوعبید نے فرمایا ہے: کانوا یکرھون ان یتلو الایة عند شئ یعرض من امور الدنیا.

فوائد امثال:

امثال کی حقیقت کے ضمن میں کچھ فوائد کا ذکر اجمالا آچکا ہے، علماء کرام نے امثال قرآنیہ کے بہت سے فوائد ذکر کئے ہیں ان میں سے تذکیر ووعظ، بھلائی وخیر کی طرف ابھارنا اور برائی وشر کے کاموں سے روکنا (ترغیبات وترہیبات) عبرت، کسی عقیدہ یا مضمون کا اثبات، مدح وذم، ثواب وعقاب، کسی چیز کی عظمت وحقارت، کسی شئ کا اثبات یا بطلان، مختصر عبارت سے وسیع معنی کا پیدا ہونا (جیسے کہ امثال کا منہ ومرسلہ میں ہوتا ہے) عقلی معنی کو حسی صورت میں پیش کرنے کی وجہ سے نفس اس کو جلدی قبول کر لیتا ہے؛ کیونکہ عقلی چیزیں حسیات میں منتقل ہونے کی صورت میں ہی ذہن میں راسخ ہوتی ہیں، امثال سے حقائق کھلتے ہیں، غائب چیز مشاہدے کی شکل میں پیش ہوتی ہے۔

تمثیلات کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمثیلات کس طرح دلائل بنتی ہیں اور کن مقاصد اور کن حکمتوں کی بنا پر اور کس سطح کے اذہان کی تفہیم کی خاطر اثبات مدعا کے لئے

تمثیل کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مثلا عقیدہ شرک کے ضعف کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دی گئی ہے یا مثلا دل و دماغ اور آنکھ رکھتے ہوئے حق سے روگردانی کرنے والوں کو چوپایوں ، بلکہ ان سے بھی اضل فرمایا گیا، یا مثلا انفاق فی سبیل اللہ کے خوشگوار نتائج کو ایک بیج سے پھوٹی ہوئی سات بالیاں اور ہر بالی سے نکلے ہوئے سو دانوں سے تشبیہ دی گئی ہے، ممثل سے نفرت دلانے کے لئے جیسے غیبت کی مذمت کرنے کے لئے اس کو مردار بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر فرمایا، ممثل کی مدح مثلا صحابہ کرام کی تعریف کرتے ہوئے کزرع اخرج شطأه الخ..

صحابہ کرام کا حال بھی ابتداء میں کمیت و کیفیت میں اسی طرح تھا، پھر تدریجی طور پر دونوں حیثیات سے صرف بڑھے ہی نہیں بلکہ مضبوط بھی ہوئے ، اسی طرح ممثل کی بری صفت ذکر کرتے ہوئے اور لوگوں میں اس کے قبح کو اجاگر کرنے کے لئے مثلا بلعم بن باعوراء جس کو کتاب کا علم دیا گیا تھا لیکن اس نے دنیا کو ترجیح دی تو اس کو ہانپتے کتے کی طرح تشبیہ دی۔

ظاہر ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے جب یہ تمثیلات آتی ہیں تو وہ ہر مقام پر اس مدعا کو سمجھنا چاہتا ہے جو اس جگہ بیان کردہ تمثیل سے سمجھ میں آرہا ہے۔

امثال دعوت وتبلیغ میں بھی بہت مفید و مؤثر ہوسکتی ہیں، کیونکہ ہر زبان میں اظہار مافی الضمیر اور اثبات مدعا کے لئے تشبیہات وتمثیلات استعمال کرنے کا طریقہ رائج ہے اور کیسے افراد کو سمجھانے کے لئے کس قسم کی تشبیہ سے کام لینا چاہئے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں: انبیائے مذاہب اور حکمائے اخلاق نے تمام

طرق استدلال سے زیادہ ان امثال سے کام لیا ہے کہ یہ استدلالات منطقی سے زیادہ مؤثر اور عام فہم ہے، اس لئے قرآن مجید میں بھی نہایت کثرت سے امثال ہیں، حکماء کے چھوٹے چھوٹے مقولے اور بلغاء کے بلیغ فقرے لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں اور وہی تقریبا انشاپردازی اور ادب کی جان ہوتے ہیں، اور پھر وہ لٹریچر میں اس طرح سرایت کر جاتے ہیں کہ ان سے سیکڑوں محاورے اور تلمیحات پیدا ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید اس ایجاز اور اعجاز کا کامل ترین نمونہ ہے، اس کی سیکوں چھوٹی چھوٹی آیتیں اور حکیمانہ فقرے عربی علم ادب کے جزء بن گئے ہیں جن کے بغیر عبارت میں بلندی اور کلام میں لطف وشیرینی نہیں پیدا ہو سکتی۔

(مقالات سلیمانی: ج:۳،ص:۲۰،۲۱)

امثال القرآن کے متعلق تصانیف:

قرآن کریم کی تفسیر کے ضمن میں تمام متقدمین ومتأخرین مفسرین نے امثال کی تشریح کی ہے ان کے علاوہ کچھ حضرات نے مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں، ان میں سے ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی نیسابوری ۴۰۲ھ، ابوالحسن علی بن محمد ماوردی ۴۵۰ھ، شمس الدین ابن القیم ۷۵۴ھ وغیرہم نے امثال قرآن کے نام سے مستقل کتابیں لکھی ہیں، جبکہ علامہ ثعلبی نے کتاب الایجاز میں، جعفر بن شمس الخلافہ نے کتاب الآداب میں اور حافظ جلال الدین سیوطی ۹۱۰ھ نے الاتقان فی علوم القرآن میں مستقل ابواب میں قرآن مجید کی ضرب الامثال کو جمع کر دیا ہے۔

مراجع خاص وعام

(١) البرہان فی علوم القرآن (٢) الاتقان فی علوم القرآن

(٣) مباحث فی علوم القرآن (٤) موارد الظمآن فی علوم القرآن

(٥) المدخل لدراسة القرآن والسنة والعلوم الاسلامیہ

(٦) مناهل العرفان فی علوم القرآن

(٧) تفسیر عثمانی(ترجمہ :شیخ الهند)

(٨) علوم القرآن (٩) تفسیر ادریسی

(١٠) تفسیر رازی (١١) روح المعانی

(١٢) مقالات سلیمانی (١٣) مقدمہ تفسیر حقانی

(١٤) بیان القرآن (١٥) التحریر فی اصول التفسیر

(١٦) المفردات (١٧) تفسیر ابن کثیر

قرآن کریم کی نزولی و مصحفی ترتیب
دفعۃً وتدریجاً نزول کے احوال واسباب

صوت القرآن احمد آباد کے لئے لکھے گئے اس مقالے میں قرآن کریم کی نزولی و مصحفی ترتیب میں مستشرقین کی کاوشوں اور ریشہ دوانیوں پر مناسب تبصرہ، موجودہ ترتیب کی اہمیت، یکبارگی وتدریجی نزول کی کیفیت وحکمت، تدریجی نزول کے اسرار جیسے اہم موضوعات پر بہترین انداز میں بحث کی گئی ہے۔

قرآن کریم کی نزولی ومصحفی ترتیب

دفعۃً وتدریجاً نزول کے احوال واسباب

یہ بات اہل علم حضرات سے مخفی نہیں ہے کہ قرآن کریم کی موجودہ ترتیب اورنزولی ترتیب دونوں مختلف ہیں، جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ ﷺ کاتبین وحی صحابہؓ کرام کو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھ لیا جاوے، چنانچہ وہ حضرات آپ ﷺ کے بتائے ہوئے مقام پر لکھ کر درج کردیتے تھے، ترتیب نزول کی کوشش نہ آپ ﷺ نے فرمائی اور نہ صحابہؓ کرام نے کی؛ لہذا تکمیل نزول کے بعد لوگوں کو قطعی طور پر یہ یاد نہیں رہا کہ کونسی آیت کس ترتیب سے نازل ہوئی تھی، کتاب وسنت اور خارجی دلائل وواقعات کی روشنی میں چند آیات یا سورتوں کے متعلق تو ہم کہہ سکتے ہیں؛ لیکن مجموعی طور پر پورے قرآن کریم کی تمام آیات وسورتوں کے متعلق قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے ہیں۔

ہمارے علمائے مفسرین اور علوم القرآن خاص کر کے احکام القرآن کے مصنفین نے ترتیب نزول تلاش کر کے اس کو بیان کرنے کی محنت شاقہ برداشت کی ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں بعض روایات کی مدد سے سورتوں کی ترتیب نزول بیان کی ہے اور بقول حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم: اندلس کے ایک نامعلوم عالم کی کتاب ''المبانی فی نظم المعانی'' کا ایک مخطوط نسخہ آرتھر مبیضر نے

”مقدمتان فی علوم القرآن “ کے نام سے شائع کیا ہے اس میں بھی ترتیب نزول کی مختلف روایات بیان کی گئی ہیں، مگر یہ روایات قابل اعتماد نہیں ہیں، حضرت مولانا تقی صاحب دامت برکاتہم اس سلسلے میں مستشرقین کی کاوشوں اور ریشہ دوانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ماضی قریب میں بعض مستشرقین نے بھی ترتیب نزول معین کرنے کی کوشش کی ہے ،سب سے پہلے مشہور جرمن مستشرق نولڈیکے نے اس کام کا آغاز کیا اور اس کے بعد یہ بہت سے مغربی مصنفین کی دلچسپی کا موضوع بنا رہا، وِلیَم میور نے بھی اس سلسلے میں ایک جداگانہ کوشش کی ہے، بلکہ جے ایم راڈویل نے قرآن کریم کا جو انگریزی ترجمہ شائع کیا، اس میں سورتوں کو معروف ترتیب سے ذکر کرنے کے بجائے نولڈیکے کی مزعومہ تاریخی ترتیب سے ذکر کیا ہے، بیسویں صدی کے آغاز میں ہارٹ وگ ہرشفیلڈ نے نہ صرف سورتوں بلکہ آیتوں تک کی تاریخی ترتیب معین کرنے کی کوشش کی، رجسٹر ڈبیل نے بھی اس سلسلے میں مغربی دنیا میں کافی نام پیدا کیا، مستشرقین کی یہ کوششیں اب بھی جاری ہیں اور شاید انہی سے متأثر ہو کر بعض مسلمانوں نے بھی ترتیب نزول کی تحقیق کرنی شروع کی ہے۔(علوم القرآن: ص: ۷۰، مولانا تقی عثمانی صاحب)

دراصل مستشرق نولڈیکے NOLDEKE نے قرآن کی ترتیب زمانی غیر اسلامی طریقہ پر انجام دی ہے، اس نے اس ضمن میں ایک نئی راہ اختراع کی ہے جس سے بہت سے لوگ متأثر ہوئے ہیں؛ خصوصا تمام مستشرقین اس ڈگر پر چلتے رہے، حالانکہ یہ راہ قرآنی دراسات وعلوم کے حق میں زہر ہلاہل سے کسی طرح کم نہیں۔

ولیم مویر William Muir نے یہ کام کیا کہ نزول قرآن کے مراحل کو چھ حصوں

میں تقسیم کردیا، ان میں سے پانچ مکہ میں اور ایک مدینہ میں، مویر نے زیادہ تر رسول کریم ﷺ کی سیرت اوراس کی اسانید پر اعتماد کیا، آپ کی سیرت کا تنقیدی مطالعہ کیا اور بہت سی تاریخی معلومات جمع کردی، مگراس کے باوصف اس سے بکثرت غلطیاں صادر ہوئیں اوراس نے بہت ہی ضعیف روایات کا سہارالیا، اس ضمن میں مستشرق غریم کے ساتھ اس کا تقابل چنداں دشوار نہیں۔

ترتیب قرآن کے سلسلے میں ویل Weil کی کاوش بھی قابل ذکر ہے، جس کا آغاز اس نے ۱۸۴۴ء میں کیا اوراس کی تکمیل ۱۸۷۲ء میں ہوئی، وہ ترتیب قرآن کے ضمن میں اسلامی روایات واسانید کو کچھ اہمیت نہیں دیتا، یہی وجہ ہے کہ بلاشیر نے اس کے طریق کار کو ''یکتا اور ثمر آور'' قرار دیا ہے، نولڈیکے نے بھی اس کی پرزور حمایت کی ہے، چنانچہ ترتیب قرآن کے سلسلہ میں نولڈیکے کی کاوش کا بڑا ماخذ زیادہ تر ویل کی دراسات ہی ہیں۔

ویل نے نزول قرآن کو چار مراحل میں تقسیم کیا تھا، تین مکہ میں اور ایک مدینہ میں، نولڈیکے نے اپنی ''تاریخ القرآن'' (شائع کردہ ۱۸۶۰ء) میں اسی کا تتبع کیا ہے، البتہ ہر مرحلہ میں نولڈیکے نے اس سے معمولی سا اختلاف بھی کیا ہے، جب نولڈیکے نے مستشرق شفالی Schwally کی رفاقت سے اس کتاب کا طبعِ ثانی شائع کیا تو اس میں مزید اضافے کیے۔

مستشرقین میں سے آر، بیل R.Bell اور روڈویل Rodwell اور بلاشیر Blachere ویل سے حد درجہ متاثر ہوئے ہیں، ہماری نگاہ میں بلاشیر کا ترجمۃ القرآن اپنی علمی روح کی بناء پر منفرد حیثیت کا حامل ہے، مگراس میں یہ خامی پائی جاتی ہے کہ قرآنی سورتوں کی

ترتیب زمانی کے سلسلہ میں بلاشیر نے تکلف اور کھینچا تانی سے کام لیا ہے اور وہ خود بھی اس کا معترف ہے۔ (علوم القرآن ڈاکٹر صبحی صالح، مترجم غلام احمد حریری: ص: ۲۵۰)

دراصل مستشرقین کی ان کوششوں کے پیچھے ایک مخصوص ذہنیت کارفرما ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم ابھی تک غیر مرتب ہے، اس کی اصلی ترتیب وہ ہی ہے جس پر وہ نازل ہوا تھا، لیکن چونکہ نازل ہونے کے ساتھ اسے کتابی شکل میں لکھنے کے بجائے متفرق چیزوں پر لکھا گیا اس لئے وہ ترتیب محفوظ نہ رہ سکی، راڈویل نے اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ موجودہ ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جب متفرق تحریریں جمع کیں تو وہ انہیں جس ترتیب کے ساتھ ملتی گئیں اسی ترتیب سے وہ لکھتے چلے گئے، لہذا اس میں کسی تاریخی یا معنوی ترتیب کا لحاظ نہیں رہ سکا، اب قرآن کریم کی موجودہ ترتیب ان کے خیال میں (معاذ اللہ) ایک نقص ہے جسے وہ بزعم خود اپنی ''تحقیق'' سے دور کرنا چاہتے ہیں۔

حالانکہ واقعات کی یہ تصویر نہ صرف خیالی بلکہ واضح دلائل کے بالکل خلاف ہے، اس لئے کہ آیاتِ قرآنی کی ترتیب باتفاق وحی سے ثابت ہے، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ ﷺ کاتبین وحی کو ساتھ ہی یہ بھی بتادیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے گی، اور صحابہؓ نے قرآنِ کریم کو اسی ترتیب سے یاد کیا تھا، جو حضور ﷺ نے بتائی تھی، یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حضرت زیدؓ کو جس ترتیب سے آیتیں ملتی گئیں اسی ترتیب سے لکھتے گئے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو موجودہ قرآن میں سب سے آخری آیت ''من المؤمنین رجال صدقوا الخ..'' ہونی چاہئے تھی، کیونکہ حضرت زیدؓ کو یہ آیت سب سے آخر میں ملی، حالانکہ یہ آیت سورۂ احزاب

میں درج ہے،اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت زیدؓ اوران کے رفقاء کے سامنے جب کوئی آیت لائی جاتی تھی تو وہ اس کو اسی مقام پر لکھتے تھے جس مقام پر حضور ﷺ نے بتایا تھا۔(علوم القرآن،حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب:ص:۷۱،۷۲)

مکی ومدنی آیات وسور سے متعلق اپنے علماء کا تشدد بیان کرنے کے بعد ہم بلاشک وشبہ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قرآنی سورتوں کی ترتیب زمانی کے سلسلے میں روایات صحیحہ سے بڑھ کر دوسری کوئی چیز نہیں ہے،اس ضمن میں جو روایات وارد ہوئی ہیں وہ یا تو صحابہ سے منقول ہیں، جو وحی کے زمان ومکان کے عینی شاہد تھے یا ان تابعین سے جنہوں نے وحی کی تفصیلات صحابہ کی زبانی سنی تھیں،اس قبیل کی کوئی چیز آنحضور ﷺ سے منقول نہیں جیسا کہ قاضی ابوبکر باقلّانی نے اپنی کتاب"الانتصار"میں لکھا ہے،آنحضور ﷺ اس کے لئے مامور نہ تھے اور نہ اس علم کو خدا نے امت کے فرائض میں سے قرار دیا۔

(البرہان:ج:۱،ص:۱۹۱،الاتقان:ج:۱،ص:۱۴)

لیکن ہماری نظر میں یہ ساری کوششیں ایک ایسے کام میں اپنا وقت صرف کرنے کے مرادف ہیں جس میں کبھی یقینی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی، مذکورہ بالا مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں وہ زیادہ تر متن کے بارے میں ان کے ذاتی قیاسیات پر مبنی ہیں اور چونکہ ہر شخص کے قیاسیات دوسرے سے مختلف ہوسکتے ہیں،اس لئے ان کی بیان کردہ ترتیبوں میں بھی فرق ہے،لہذا ہزار کوشش کے باوجود ان قیاسیات سے کوئی خاص عملی فائدہ حاصل کرنا مشکل ہے۔(علوم القرآن مولانا تقی صاحب:ص:۳۷،علوم القرآن ڈاکٹر صبحی صالح،مترجم غلام حریری:ص:۲۵۳)

درحقیقت مستشرقین قرآن کریم کو عام انسانی تالیفات سے مختلف انداز میں دیکھ

کر پریشان ہیں، ان کی پریشانی کا باعث مزید یہ بھی ہے کہ حکیم وحمید خلاق عظیم نے اس کو اپنی حکمت بالغہ اور حجت دامغہ کے پیش نظر موجودہ جس ترتیب پر بھی رکھا ہے، مستشرقین کے اس کے خلاف غیر مرتب ہونے کے الزام لگانے کے باوجود آج کی مہذب یورپی دنیا اگر آسمانی کتابوں میں سب سے زیادہ کسی کتاب سے متأثر ہے تو وہ یہی قرآن عظیم ہے، اور شاید اس کی یہ ترتیب بھی اس کی شان اعجازی ہی ہے، ورنہ منظّم، مبوّب و مفصل ترتیب والی کتابوں کے کسی ایک مضمون کی چند باتیں سنکر آدمی اکتا جاتا ہے، جبکہ قرآن کریم کا ہر رکوع بلکہ بسا اوقات ایک ہی آیت مضامین کا ایسا تنوع لئے ہوئے ہوتی ہے کہ علیحدہ علیحدہ مزاج اور مختلف باطنی امراض کے شکار لوگ اس میں بیک وقت اپنے اپنے درد کا درماں اور اپنی تسکین کا سامان پاتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی گفتگو کا وہ تمام ذخیرہ جو آپ ﷺ نے دین اسلام کی تشریح میں اپنے صحابہ کے سامنے بیان فرمایا ہے، آج بھی محفوظ ہے، لیکن جب اس کو نظم قرآن کے سامنے رکھا جاتا ہے تو یہ وہم بھی نہیں گزرتا کہ یہ دونوں ایک ہی متکلم کے کلام ہو سکتے ہیں، صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے متکلم بالکل الگ الگ ہیں، تعجب ہے کہ لغت ایک، کلمات ایک، نوع ترکیب ایک، لیکن جب ان کو دوجگہ بالمقابل بشکلِ کلام دیکھا جاتا ہے تو دونوں میں نسبت تباین کی نظر آنے لگتی ہے، اگر قرآن پاک میں ذرا سا بھی آپ ﷺ کا کوئی دخل ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ جس کلام کو آپ نے خدا تعالی کا کلام کہہ کر تلاوت فرمایا تھا وہ آپ ﷺ کے عمر بھر کے کلام سے کہیں ذرا بھی ملتا جلتا نظر نہ آتا ہو۔ (الجواب الصحیح :ج:۴،ص:۷۵) اب ایک ایک آیت کو حدیثوں کے دفتروں سے ملا ملا کر دیکھ لیجئے، کیا مجال کہ کوئی آیتِ قرآنی ذرہ برابر بھی کسی حدیث سے ملتی جلتی نظر آسکے۔ (ترجمان السنۃ: ج:۴،ص:۱۶-۱۷)

قرآنی فہرست اورعناوین پر کھنے والے بہت سارے حضرات اہل علم کے معاجم اوران کے عناوین ہمارے سامنے ہیں،جس میں ایک ہی مضمون پر مشتمل تمام آیات کوحروف تہجی یا عناوین کی ترتیب پر یکجا کیا گیاہے،اگر چہ اس میں بھی یہ پریشانی ہوتی ہے کہ ایک ہی آیت کے مختلف مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کو الگ الگ مواقع پر تحریر کرنا ہوتاہے،لیکن جولذت اورآشنائی موجودہ ترتیب کو حاصل ہے اورانسانی قلوب پر جوتأثر اس ترتیب کو حاصل ہے وہ دوسری کسی بھی انسانی ترتیب کو حاصل نہیں ہے،اگر چہ ان علوم کے علاوہ دیگر علوم میں امت محمدیہ ﷺ نے ترتیب وسلیقہ مندی کے بھی وہ جوہر دکھلائے ہیں کہ دوسری کوئی امت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے،اوروہ بھی اس دور میں جبکہ یورپ اپنی تاریخ کی انتہائی تاریک عہد سے گزررہا تھا،امام بخاریؒ کی صحیح بخاری اور علامہ کاسانی کی البدائع والصنائع صرف طائرانہ مثالیں ہیں ”اولئك آبائی فجئنی بمثلهم“ جب بندوں کے علوم کا یہ حال ہے،جن کے مجموعی علوم کے بارے میں فرمایا گیا”وما اوتیتم من العلم الا قلیلا“ توعلام الغیوب کےعلوم کا تو تصور بھی نہیں کر سکتے،جس نے اپنے تکوینی علم کی صرف ایک جھلک دکھانے کے لئے حضرت موسی علیہ السلام جیسے اعلم الناس کوحضرت خضر کی شاگردگی میں بھیج کر اپنی شان کبریائی کے چند نمونے دکھلائے،اس ذات علیم وقدیر نے اپنے کلام کے بارے میں سچ فرمایا”لایأتیه الباطل من بین یدیه ولا من خَلفه، تنزیل من حکیم حمید“ اوراس ترتیب زمانی پر محنت کرنا کوئی مستشرقین کی ہی ابتدائی کوشش نہیں ہے،امت مسلمہ نے قرآن کریم سے گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے علوم قرآنی کوجن مختلف عناوین سے مزین کیاہے اس میں ترتیب زمانی بھی ہے،آپ ﷺ کی بعثت سے

لیکر وفات تک کی حیات طیبہ کومختلف ادوار میں تقسیم کر کے آیات وسوراور احکامات کے نزول کے اوقات کوبھی متعین کرنے کی بشری امکانی کوشش کی ہے، حافظ جلال الدین سیوطیؒ اور دیگر بہت سارے ماہرین علوم قرآنیہ نے اس پر بہت تفصیلی وتحقیقی گفتگو کی ہے، بندہ کے سامنے اس وقت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری صاحب کی کتاب تاریخ الاحکام ہے، جس میں آپ نے علامہ سیوطیؒ کی "الاتقان" اور دیگر کتب تفسیر کے حوالوں سے سورتوں کی ترتیب زمانی اور احکامات کی تاریخ کی تعیین کرنے کی کوشش کی ہے، طوالت کے خوف سے اس کونقل کرنا مناسب نہیں سمجھتا ہوں، حضرات اہل علم اصل کتاب کی مراجعت فرمائیں۔

نزول قرآنی (دفعۃً وتدریجاً) کے حِکَم واسرار کوموضوع بحث بنانے کا منشا یہی ہے کہ جس قرآن کریم کے اپنے نزول کے وقت کی یہ حکمتیں ومصالح ہوں، اس کی موجودہ ترتیب بھی (جوکہ خود بھی امور غیبیہ میں سے ہے) بہت ساری مصلحتوں پر مشتمل ہیں جن کا ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔

قرآن کریم کا یکبارگی وتدریجی نزول:

قرآن مجید ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے جیسے کہ ارشاد ربانی ہے:" بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ" پھرلوح محفوظ سے اس کا نزول دومرتبہ ہوا ہے: ایک مرتبہ پورا قرآن سمائے دنیا کے بیت العزت میں اور دوسری مرتبہ آپ ﷺ پر حسب ضرورت ۲۳/ سالہ مدت میں مکمل ہوا، اگر چہ یک بارگی اور تدریجی نزول کے سلسلہ میں دوسرے بھی چند اقوال امام شعبیؒ، محمد بن اسحاق وغیرہ کی طرف منسوب ہیں، اسی طرح علامہ ماوردی نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے، جس میں حضرت جبرئیل اور آپ ﷺ

کے درمیان السفرة الکرام کا واسطہ ذکر کیا ہے،لیکن حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں اور ابن العربیؒ نے احکام القرآن میں اس قول کو رد کیا ہے اور پہلے ذکر کئے ہوئے قول کو ہی ھو الصحیح المعتمد قرار دیا ہے،علامہ قرطبیؒ نے اجماع نقل کیا اور حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے الاصلح الاشھر کہا،اگر چہ امام شعبیؒ نے بھی چند بظاہر متضاد آیات میں تطبیق دینے کی غرض سے ہی نزول قرآن کریم ایک مرتبہ قرار دیا تا کہ لیلۃ القدر،لیلۃ المبارکہ اور شہر رمضان تینوں آیات کا ایک ہی مفہوم ثابت ہو،لیکن اس کے لئے ابتداءً ہی تدریجی نزول ماننے کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ تینوں آیات کا لفظ انزال ہی اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ یکبارگی نازل ہوا ہے ”انا انزلناه فی لیلة القدر ، انا انزلناه فی لیلة مبارکة ، شھر رمضان الذی أنزل فیه “ جبکہ تدریجی نزول کے لئے قرآن کریم نے ”وقرآنا فرقناه لتقرأه علی الناس علی مکث ونزلناه تنزیلا“ تنزیل کا لفظ استعمال فرمایا جو خود تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔

یکبارگی نزول کی کیفیت:

یکبارگی نزول کی کیا کیفیت تھی؟ اس بارے میں کوئی خاص نص کتاب وسنت سے ہم کو معلوم نہیں ہوسکی ہے ،شیخ ابوشامہ المقدسی نے تفسیر شفاء القلوب (علی بن حسن نیسا پوری) کے حوالے سے بعض تفسیر کی کتابوں سے اس کی کیفیت نقل کی ہے کہ علماء کرام کی ایک جماعت لیلۃ القدر میں لوح محفوظ سے بیت العزت کے نزول کے سلسلے میں فرماتی ہے کہ اس کو حضرت جبرئیل نے محفوظ کیا اور سارے آسمان والے کلام اللہ کی ہیبت سے بے ہوش ہوگئے ،افاقے کے بعد حضرت جبرئیل ان کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا: ماذا قال

ربکم قالوا الحق. اور یہ معنی اس آیت کریمہ کا ہے: حتی اذا فزع عن قلوبھم پھر جبرئیل اس کو بیت العزت کی طرف لائے اور سفرۃ کتبۃ (لکھنے والے فرشتے) کے پاس کتابت کروائی جیسے کہ قرآن کریم میں ہے "بایدی سفرۃ"، "کرام بررۃ" لیکن زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنے تدریجی نزول کا ذکر تو کیا ہے، یکبارگی نزول کے بارے میں کچھ نہیں کہا، اور کفار مکہ نے بھی قرآن کریم کے قسط وار نزول کو ہی ہدف تنقید بنایا تھا، کیونکہ وہ یہود سے سن چکے تھے کہ تورات بہ یک وقت نازل ہوئی تھی، نیز وہ پورا قصیدہ ایک ہی دفعہ سننے کے عادی تھے۔

بہر کیف قرآن کریم کے دونوں نزول کی مختلف حکمتیں اور اسرار ہیں جن کو علمائے تفسیر نے بہت اہتمام شان کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

یکبارگی نزول کی حکمت:

حکمت ربانی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ قرآن کریم دیگر کتب سے ممتاز کیا جاوے، اس لئے قرآن کریم کو دونوں نزولی اوصاف (دفعۃً وتدریجاً) سے متصف کیا، ان دونوں اوصاف کے اجتماع سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ قرآن کریم کا مقام ومرتبہ دیگر کتب کے مقابلہ میں اعلی وارفع ہے، وھذا من جملۃ ماشرف بہ نبینا ﷺ.

شیخ ابوشامہ فرماتے ہیں کہ اگر تو یہ دریافت کرے کہ یکبارگی نزول کی کیا حکمت ہے؟ تو عرض کروں گا کہ اس میں قرآن کریم اور آپ ﷺ دونوں کی عظمت وفضیلت بیان کرنا ہے اور اس سے ساتوں آسمان کے سکان کو یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ آخری رسول ﷺ پر نازل کی گئی ہے۔ (الاتقان:ج:١،ص:٦١، البرھان:ج:١،ص:٢٣٠، المرشد الوجیز ابو شامہ بحوالہ دراسات فی علوم القرآن :ص:٢٤)

علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں کہ یکبارگی نزول کی وجہ اگر کوئی دریافت کرنا چاہتا ہے تو میں یہ جواب دیتا ہوں کہ اس میں فرشتوں کے سامنے انسان کی تعظیم وتکریم مقصود ہے اور رحمت الٰہی وعنایات ربانی کے ذریعہ ان کی تعریف کرنا ہے، اسی لئے تو سورۂ انعام کے نزول کے وقت ستر ہزار ملائکہ کو اس کے ساتھ اتارا گیا اور حضرت جبرئیل کے ذریعہ سفرۃ الکرام البررۃ کے پاس املاء کروایا گیا۔

اس کے ساتھ ملائکہ وغیرہ سے اعلان کرنا تھا کہ حق سبحانہ وتعالی علام الغیوب ہے، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے، کیونکہ اس کتاب عزیز میں اشیاء کے وقوع سے پہلے ان کا تذکرہ کیا گیا، نیز آپ ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان یکبارگی نزول میں شرکت وتساوی بیان کرنا ہے اور آپ ﷺ کی مزید فضیلت بتانا ہے کہ آپ پر تدریجا بھی نزول ہوا، اس کے علاوہ وہ حق تعالی کی عزت وقدرت اور عظمت پر دال ہے کیونکہ یکبارگی کے ساتھ ملائکہ کے ذریعہ تدریجا حسب مواقع اتارنا انسانی نفسوں میں اس کی شان ربوبیت پر دلالت کرتا ہے۔

حاصل یہ کہ یکبارگی نزول میں قرآن کریم آپ ﷺ اور امت محمدیہ ﷺ کی تعظیم شان وشرافت اور فضل ومنقبت مقصود ہے، آسمان والوں کو آپ ﷺ کی ختم نبوت کی طرف آگاہ کرنا ہے اور قرآن کریم کا اختصاص مقصود ہے کہ یہ لوح محفوظ سے سماء دنیا میں یکبارگی نازل ہوا، جبکہ کتب سابقہ یکبارگی لوح محفوظ سے براہ راست حضرات انبیاء کرام پر نازل ہوئیں۔

حکیم ترمذی کا قول ہے کہ یکبارگی نزول کی حکمت یہ ہے کہ امت محمدیہ ﷺ کو

آپ کی بعثت سے رحمت کا جو حصہ عطا ہوا تھا مسلمان اس کو آسانی سے حاصل کر سکیں، اس کی شکل یہ تھی کہ آپ کی بعثت مخلوق کے لئے رحمت تھی، اور جس وقت رحمت کا دروازہ کھلا تو آپ ﷺ اور قرآن کریم دونوں ساتھ ہی باہر نکلے، لیکن قرآن شریف سمائے دنیا کے بیت العزۃ میں رکھ دیا گیا، تاکہ وہ دنیا کی حد میں داخل ہو جائے اور نبوت کو آپ ﷺ کے قلب میں جگہ دی گئی، اس کے بعد حضرت جبرئیل پہلے رسالت اور پھر وحی آپ کے پاس لے آئے؛ گویا حق سبحانہ وتعالی نے چاہا کہ آپ ﷺ کو جو رحمت کا حصہ دیا گیا آپ اس کو اپنی تحویل میں لے لیں اور پھر امت تک اس کو پہونچائے۔ (الاتقان: ج:۱،ص:۱۴۷)

نزول ثانی تدریجی نزول:

(۱) وقرآنا فرقنه لتقرأه على الناس على مكث ونزلناه تنزيلا. (سورۂ اسراء، آیت:۱۰۶) (۲) وقال الذين كفروا لولا نزل عليه القرآن جملة واحدة كذلك لنثبت به فؤادك ورتلنه ترتيلا. (الفرقان: آیت:۳۲)

تدریج کی حکمتیں

تثبیت قلب : یہ پانچ طریقے سے ہے: (۱) وحی کا تجدد اور حق تعالی کی طرف سے تکرارِ ملائکہ قلبِ رسول ﷺ کو سرور اور شرح صدر عطا کرتا ہے۔ (۲) تدریج میں حفظ وفہم کی آسانی اور احکام وحکم کی معرفت حاصل ہوتی ہے، جس سے مذکور وحی کی حفاظت پر طمانیت قلب نصیب ہوتا ہے۔ (۳) ہر مرتبہ کے نزول سے کفار کو چیلنج کیا جا رہا تھا کہ تم اس کے مثل لانے سے ہر ہر مرتبہ عاجز ہو رہے ہو، یہ فصاحت وبلاغت کی دعویدار اور غیروں پر عجمی ہونے کا طعن والزام لگانے والی غیور قوم کی ذلت کی آخری حدود

تھیں"ضاقت علیھم الارض بما رحبت" یہ معجزہ آپ ﷺ کو اپنے تبلیغی ودعوتی امور میں ہر مرتبہ بڑی قوت وتائید عطا فرماتے ہوئے، دشمنوں کو بار بار ذلیل وخاسر کرتے ہوئے، ایمان کی طرف سوچنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔(۴) آیات کے نزول میں بار بار آپ کی دعوت حقہ کی تائید اور باطل کا رد آپ کی کامیابی اور درستگی کی لذت کو دوبالا کر دیتی ہے، یہ وجہ ماقبل کی وجہ سے قدرے مختلف ہے کہ اس میں آپ کے غلبہ اور دشمن کے ہزیمت سے قطع نظر مطلق تقویت وتائید اور تثبیت قلب تھی۔ اشبه شيئ بالسلاح: وجوده في يد الانسان مطمئن له ولو لم يستعمله في خصمه ثم انتصار الانسان وهزيمة خصمه به اذا اعمله فيه مطمئن للفؤاد مريح للقلب مرة اخرى. (۵) دشمنوں کی اذیت پر آیات کا بار بار نزول کہ جب جب بھی دشمنوں کی طرف سے جس نوعیت کی بھی تکلیف پہونچی، اس کے جواب میں مختلف طریقوں سے تسلی کا سامان بہم پہنچایا گیا، کبھی انبیاء کرام کے قصے بیان فرمائے اور فرمایا:"وكلا نقص عليك من انباء الرسل مانثبت به فؤادك". (هود) کبھی نصرت اور حفاظت کے وعدے فرما کر تسلی فرمائی جیسے "واصبر لحكم ربك فانك باعيننا". (سورہ طور:۴۸) کبھی اعداء کو شکست دینے کی بشارت کے ساتھ جیسے "سيهزم الجمع ويولون الدبر". (سورة قمر:٤٥،مناهل العرفان:ج:١،ص:٥٤)

ان کو شیخ فہد بن عبدالرحمٰن الرومی اپنی کتاب دراسات فی علوم القرآن میں متعدد آیات قرآنیہ سے مزین کرتے ہوئے یوں بیان فرماتے ہیں:

(ا) تثبیت قلب

(١) اخباره ان ما جرى من الاذى قد جرى للانبياء السابقين من قبله: ولقد كذبت رسل من قبلك. (سورة الانعام:٣٤، سورة الزخرف : آيت : ٣٩،سورة آل

عمران:١٨٤)

(٢) امـر الـله تعالی بنبیه ﷺ بالصبر : ولقد كذبت رسل من قبلك فصبروا علی ما كذبوا واوذوا حتی اتهم نصرنا.(سورة الانعام : ٣٤،سورة احقاب: ٣٥)

(٣) نهيـه عـن الـحزن والضيق: واصبر وما صبرك الا بالله ولا تحزن عليهم ولاتك فی ضيق مما يمكرون . (سـورة النحل: ١٢٧،النمل: ٧ ،یٰسٓ : ٧٦، المائدة : ٤١، سورة يوسف: ١٥،١٨،٨٣،٨٤)

(٤) اخبـاره بـان الـلـه يـعصمه من الناس: والله يعصمك من الناس . (سورة المائدة : ٦٧)

(٥) تبشيـره بـالـنصر والتمكين: كتب الله لاغلبن انا ورسلی . (سورة المجادلة: ٢١،يوسف: ٢١، المائدة ٥٦،التوبة: ٤٠، غافر: ٥١،الفتح: ٣، الروم: ٤٧،النصر:١)

(٢) تيسيـر حـفـظـه وفهمـه: هـو الـذی بعـث فی الاميين رسولا منهـم.(سورة الجمعة : ٢،الاعراب: ١٥٧،١٥٨)

(٣) مساير ة الحوادث: **مسلمانوں کوپیش آمدہ ہرقسم کےمسائل،واقعات اورحوادثات ومشکلات کاحل** (١) الاجـابة عـلـی مـا يـطـرأ من اسئلة : **یہودونصاری، مشرکین اورمنافقین کےجواب میں جوآیات نازل ہوئی** ”ام حسبـت ان اصـحـاب الـكهف والرقيم كانوا من آياتنا عجبا“. (سـورة الكهف:٩، ٨٣،سورة الاسراء : ٨٥، سورة البقـرة : ١٨٩، ٢١٥، ٢١٧،٢١٩،٢٢٠،٢٢٢، سـورة الاعراف: ١٨٧، طٰهٰ : ١٠٥) (٢) مـجاراة الاقـضية والـوقـائع فی حينها ببيان حكم الله فيها عند حدوثها ”ان الذين جاء وا بـالافك عصبة منكم. (سورة الـنـور: ١١،سـورة المجادلة: ١) (٣) تـنبيـه المسلمين الی

اخـلاقهم وارشادهم الى الصواب والكمال"لاترفعوا اصواتكم فوق صوت النبي". (سورة الـحـجرات: ٢، سورة الاحزاب:٥٣) (٤) كشف حـال الـمنافقين وهتك استارهـم حتـى يـحـذرهـم المسلمون ويأمنوا مكرهـم و شرهـم. (سورة التوبة :٤٩،٥٨،٦١،٧٦) (٥) رد شبهـات اهـل الـكتـاب وابـطال كيدهـم للاسلام و المسلمين. (سورة آل عمران:٩٩،١٠٠،٧٢،٦٩، سورة البقرة: ١٠٥، سورة آل عمران: ١١٨،١١٩)

(۴) التدريج فى التشريع وتربية الامة .

(۵) استمرار التحدّى والاعجاز.

(٦) الـدلالة عـلـى مـصدر القرآن وانه من الله تعالى وليس فى قدرة البشر : ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا.(سورة النساء : ٨٢)

(٧) الاستـفـادة مـن نـزول الـقـرآن الـكـريم منجما فى مجال التربية والتـعليم: (١) مـعـرفة الـمستـوى الـذهـنـى لـلطلاب (٢) تنبيه قدراتهم الذهنية ،والنفسية، والجنسية. (دراسات فى عـلـوم الـقـرآن :ص:٢٠٧ تا ٢٢٥: مناهل العرفان فى علوم القرآن: ص:٥٤ تا ٦٣، التبيان فى علوم القرآن للصابونى:٣٣)

قرآن کریم کا تدریجی نزول اوراس کے اسرار:

حکمت ربانی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ وحی رفتہ رفتہ آپ پر نازل ہواور ہر روز آپ کوایک نئی چیز سکھاتی رہے، نیز آپ کورشد وہدایت سے بہرہ ور کرتی اورآپ کے ثبات واطمینان میں اضافہ کی موجب ہوتی رہے،اسی طرح صحابہ بھی وحی ربانی سے مستفید ہوتے اوراس کی روشنی میں اپنے اخلاق وعادات اورحالات وواقعات کی اصلاح کرتے رہے،وحی

کے احکام ومسائل ان پر یکا یک اور غیر متوقع طور پر نہیں ٹھونسے جاتے تھے، اوراس طرح وحی ان کے حالات سے ہمیشہ یک رنگ وہم آہنگ ہوا کرتی تھی، اس یگانگت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وحی رفتہ رفتہ اور حاجت وضرورت کے موقع پر اترا کرتی تھی، کبھی پانچ آیتیں اترتیں، کبھی دس یا کم وبیش، واقعۂ افک میں دس آیات کا اُترنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اسی طرح سورۂ المؤمنون کی ابتدائی دس آیات کا بہ یک وقت نازل ہونا دلائل سے ثابت ہے، اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک وحی میں وصف "غیر اولی الضرر" کے الفاظ نازل ہوئے، حالانکہ یہ مکمل آیت نہیں، بلکہ آیت کا ایک حصہ ہے، اسی طرح ایک دفعہ "وان خفتم عیلة" کے الفاظ آخر آیت نازل ہوئے، آیت کا ابتدائی حصہ قبل ازیں نازل ہو چکا تھا۔ (الاتقان: ج:۱،ص:۴۳)

قرآن کریم اسی طرح بالاقساط نازل ہوتا رہا تاکہ آنحضور ﷺ اور صحابہؓ اس کو تدریجاً پڑھیں، جوں جوں حوادث وواقعات رُونما ہوتے رہے یا کوئی انفرادی واجتماعی تقریب پیش آتی، تو قرآن کریم کا کچھ حصہ اس موقع کی مناسبت سے نازل ہو جاتا، بقول صحیح تر ۲۳ سال تک نزول وحی کا سلسلہ جاری رہا۔

حکمت تدریج کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ قران متعدد مرتبہ اور مختلف مقامات پر نازل ہوا تو اس سے قرآن کے بارے میں پھیلے ہوئے شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے، اس لئے کہ متعدد مواقع پر نزول قرآن کو تسلیم کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر مرتبہ اور ہر موقع پر اس کے وجود کو مان لیا جاتا ہے اور اس طرح اس کے وجود سے نفی وشک

کا احتمال بڑی حد تک دور ہو جاتا ہے، جب کہ یکبارگی نزول میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔
(مناہل العرفان للزرقانی: ۱/ ۳۹-۴۰)

علماء تفسیر کے نزدیک تدریجی نزول دو بڑی حکمتوں کو شامل ہے:

(۱) وحی کی آنحضور ﷺ کے احوال سے موافقت ومطابقت۔

(۲) وحی کا مسلمانوں کے حالات کے ساتھ تطابق وتوافق، اس ضمن میں اگر چہ علماء کے تعبیر و بیان میں فرق پایا جاتا ہے، مگر حاصل سب کا ایک ہے۔

وحی کے آنحضور ﷺ کے ساتھ تطابق وتوافق کے دو مطلب مراد لئے جا سکتے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ ہر واقعہ کے پیش آنے پر جب قرآن کریم نازل ہوتا تو آپ کا دل مسرور ومطمئن ہو جاتا۔ (۲) دوسرا یہ کہ اس طرح حفظ قرآن میں سہولت رہتی تھی۔

مشہور فقیہ ابوشامہ پہلی صورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: اگر دریافت کیا جائے کہ قرآن کے تدریجی نزول میں کیا حکمت ومصلحت پائی جاتی ہے اور دیگر کتب کی طرح اسے ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتارا گیا؟

تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اللہ تعالی نے خود اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ''اور کفار نے کہا کہ قرآن شریف آپ پر ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں کیا جاتا؟'' یعنی جس طرح انبیاء سابقین پر کتابیں ایک دفعہ میں نازل کی جاتی تھی، اللہ تعالی نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''ہم نے اس کو رفتہ رفتہ نازل کیا؛ تا کہ آپ کے لئے وجہ اطمینان ہو''، اس لئے کہ ہر حادثہ کے وقوع کے وقت قرآن کا نازل ہونا آپ کے دل کی تقویت کا

موجب تھا، نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس ہستی پر قرآن اُتارا جا رہا ہے خدا کے یہاں اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے، پھر بار بار فرشتے کا اور عہد بہ عہد تازہ قرآن کا نزول اس حد تک موجب مسرت ہے کہ الفاظ اس کی ادائیگی سے قاصر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ماہ رمضان میں جب آنحضور ﷺ کی ملاقات جبرئیلؑ کے ساتھ زیادہ ہوا کرتی تھی تو آپ پہلے سے زیادہ جودوکرم کا مظاہرہ کرتے تھے۔ (الاتقان: ج:۱،ص:۱۴۹)

قرآن کریم کے دل کش انداز بیان نے عربوں کو مسحور کر دیا تھا، اس میں انبیاء کے واقعات مذکور ہیں جو ان کی قوموں کے ساتھ پیش آئے، یہ واقعات مختلف اور متعدد اسالیب واطوار میں ذکر کئے گئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کی تکرار بھی لطف وحلاوت سے خالی نہیں، اکثر جگہ یہ واقعات صرف آنحضور ﷺ کی تسلی اور اطمینان قلب کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

اللہ تعالی فرماتے ہیں: و کُلّاً نقُصُّ علیك من انبآءِ الرُّسلِ ما نُثبِّتُ به فُؤادكَ . (ترجمہ) اور ہم آپ کو رسولوں کے واقعات سناتے ہیں تاکہ آپ کے لئے وہ وجہ تسلی ہوں۔ (سورۂ ہود: ۱۲۰)

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ بار بار اور طرح طرح کے رسولوں کے واقعات سنا کر آپ کو قریش مکہ کے مظالم برداشت کرنے کی تلقین کی گئی اور آپ کے لئے سکون واطمینان کا سامان بہم پہنچایا گیا ہے، کیونکہ آپ کوئی نرالے رسول نہ تھے، باقی انبیاء پر بھی بے شمار مظالم ڈھائے گئے، ان کو جھٹلایا گیا اور طرح طرح سے ستایا گیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اسی طرح قرآن تدریجی طور پر نازل ہوکر آنحضور ﷺ کے لئے صبر وثبات کا سامان بہم پہنچاتا، اور انبیائے سابقین کی پیروی کا درس دیتا رہا، گاہے صریح الفاظ میں آپ کو صبر کی تلقین کرتا۔

قرآن میں فرمایا: وَاصبِرُ علیٰ مَا یقُولون وَاھُجُرھم ھَجرًا جمیلا.

(ترجمہ) جو وہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجئے، اور ان کو چھوڑنا بھی ہو تو مناسب طریقہ سے چھوڑیے۔(سورہ المزمل:۱۰)

نیز فرمایا: فَاصبِرُ کما صبرَ اولُوا العزم من الرُّسُل.

(ترجمہ) صبر کیجئے جیسے بڑے بڑے رسولوں نے صبر کیا۔(سورہ احقاب:۳۵)

اظہار حزن وملال سے صریح الفاظ میں منع فرمایا: فَلَا یَحزُنك قولھم اِنَّا نعلمُ ما یُسرون وما یُعلنون . (ترجمہ) ان کی بات آپ کو غم زدہ نہ کردے، ہم ان کی پوشیدہ اور ظاہر باتوں کو جانتے ہیں۔(سورۂ یٰس:۷۶)

نیز فرمایا: ولا یحزنكَ قَولُھم اِنّ العزۃ للہ جمیعًا اِنہ ھو السمیعُ العلیمُ.

(ترجمہ) ان کا قول آپ کو غم زدہ نہ کردے، بے شک سب عزت اللہ ہی کے لئے ہے، وہ سننے اور جاننے والا ہے۔(سورۂ یونس:۶۵، الحجر:۸۸، النحل:۱۲۶، النمل:۷۲)

قرآن میں فرمایا: ''ہم جانتے ہیں کہ آپ ان کی باتوں سے غم زدہ ہوتے ہیں مگر وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں''۔(سورۂ انعام:۳۳)

مذکورہ صدر آیت کی تفسیر میں محدث ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: ''جب کفار مکہ نے آپ ﷺ کی تکذیب اور مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دینے کے لئے یہ آیت

نازل کی''، مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی باتیں سن کر غم زدہ ہوتے ہیں، ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں فرمایا''شاید آپ اپنی جان کو اس لئے ہلاک کر دیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے''۔

نیز فرمایا: ''یہ لوگ آپ کی تکذیب نہیں کرتے؛ بلکہ ظالم اللہ کی آیتوں کو تسلیم نہیں کرتے، یعنی حق سے عداوت رکھتے ہیں اور اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۲۹، تفسیر المنار: ۷/۲/ ۳۷۲)

قرآن کریم میں انبیاء سابقین کے جو واقعات بار بار بیان کئے گئے ہیں، ان میں یہی حکمت مضمر ہے کہ آپ حضرات انبیاء کے اُسوۂ حسنہ پر گامزن رہیں اور صبر وسکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

سید رشید رضا نے مذکورۂ ذیل آیت کی تفسیر میں یہ حقائق بیان کیے ہیں:

اللہ تعالی فرماتے ہیں: ولقد کُذِّبت رُسُلٌ مِّن قبلك فصبرُوا علی ما کُذِّبوا وأوذُوا حتی اتاھم نَصرُنا. (ترجمہ) آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا اور انہوں نے تکذیب پر صبر سے کام لیا اور انہیں ستایا گیا حتی کہ ان کے پاس ہماری امداد گئی۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۱۴)

''یہ آنحضور ﷺ کے لئے وجہ اطمینان وسکون ہے، اس آیت میں آپ کو آگاہ کیا گیا ہے کہ خدا کی سنت حضراتِ انبیاء کے بارے میں کیا رہی ہے، یا یوں کہیے کہ آپ کو یہ سنت یاد دلائی گئی اور اس کی پیروی کی تلقین کی گئی ہے، کیونکہ یہ آیت اس مضمون کی پہلی آیت نہ تھی جو اس ضمن میں نازل ہوئی، اگر یہ انسانی فطرت نہ ہوتی کہ ایک غم سے دوسرا غم زائل

ہوجاتا ہے تو سکون واطمینان کے سلسلہ میں متعدد ومتکرر آیات کے نازل ہونے کی کوئی حکمت سمجھ میں نہ آتی، ظاہر ہے کہ آپ رات کی نماز میں قرآن کریم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، بعض اوقات آپ ایک سورۃ تلاوت فرماتے اور چند دنوں کے بعد پھر اس کی تلاوت کی باری آتی، اس لئے آپ کو بار بار تسلی دلانے اور صبر کی تلقین کرنے کی ضرورت تھی، اس لئے جب حزن وملال کے اسباب متکرر ہوتے تو ان کے ساتھ دوبارہ غم کا ظہور بھی ناگزیر تھا۔ (تفسیر المنار: ج:۷، ص:۳۷)

وحی کے آنحضور ﷺ کے ساتھ تطابق وتوافق کی دوسری صورت یہ تھی کہ قرآن بالاقساط نازل ہونے سے اس کو یاد کرنا آپ کے لئے آسان ہوگیا تھا، بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں ''اطمینان قلب'' کا جوذکر کیا گیا ہے اس سے آپ کے سینہ میں قرآن کا محفوظ کرنا مراد ہے، کیونکہ آپ امی ہونے کے باعث لکھنے پڑھنے سے واقف نہ تھے اس لئے قرآن تدریجاً نازل کیا تاکہ آپ آسانی سے یاد کرسکیں، بخلاف ازیں دیگر انبیاء لکھے پڑھے ہوتے تھے، اس لئے وہ ایک ہی مرتبہ نازل شدہ کتاب کو یاد کرسکتے تھے۔ (البرہان:۱/۲۳۱)

محدث ابن فُورَک اس پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تورات بہ یک وقت اس لئے اُتاری گئی تھی کہ وہ حضرت موسی علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی جو پڑھے لکھے تھے اور قرآن کو تدریجی طور پر غیر مکتوب صورت میں اس لئے نازل کیا کہ وہ نبی امی پر نازل کیا گیا تھا''۔ (الاتقان:۱/۱۴۹، تفسیر رازی:۲/۷۹)

علامہ مکیؒ اپنی کتاب ناسخ ومنسوخ میں رقم طراز ہیں:

''قرآن کا تدریجی نزول ان کے یکا یک نازل ہونے کی نسبت أدعــی الــی

القبول ہے،اگرقرآن بہ یک وقت نازل ہوتا تواس میں بہت سے احکام ومناہی ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ،امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے جو حدیث روایت کی اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے،فرمایا: سب سے پہلے ایک سورت نازل ہوئی،جس میں جنت ودوزخ کا ذکر تھا،جب لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے تو پھر حلال وحرام سے متعلق احکام اترنے لگے اوراگر شروع ہی میں شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوجاتا تو لوگ کہتے ''ہم شراب کوترک نہیں کریں گے'' اوراگرزنا کی ممانعت نازل ہوتی تو لوگ اس کو ماننے سے انکارکردیتے ۔(الاتقان:۱:۱۵۲)

شراب اور جوا کوتدریجا اس لئے حرام ٹھہرایا گیا تھا کہ گناہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں کچھ فوائد بھی ہیں ،مگر زنا میں صرف قباحت کا پہلو ہی پایا جاتا ہے،اس لئے زنا اور سفاح (بدکاری) کی کوئی صورت بھی شرعا روانہیں ہے،یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسلام نے تمام ظاہری وباطنی فواحش ومنکرات کوحرام ٹھہرایا اسی طرح زنا کوقطعی وحتمی طور پر ممنوع قرار دیا ہے۔

اس میں شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ اسلام نے فرداور معاشرہ کی گہرائی اور سطحیت کو یکساں قرارنہیں دیا، بلکہ ان میں فرق کیا ہے، ہر وہ معاملہ جو بنی نوع انسان کے نفوس کی گہرائی میں اتر کرایک شعوری عادت کی حیثیت اختیار کرلیتا ہو یا وہ معاملہ جو معاشرہ کی گہرائی میں اتر کر ایک اجتماعی رسم یاایک سرکاری رواج کی صورت اختیار کرے،اسلام اس بارے میں مہلت اور تاخیر سے کام لیتا ہے،اسلام کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ وہ تاخیر جس میں نظم وضبط پایا جاتا ہو؛اس عجلت سے بہتر ہے جس میں ربط وضبط کا فقدان ہو۔(علوم القرآن،ڈاکٹرصبحی صالح:۸۲)

آیت کریمہ ” ولا یأتونك بمثل إلا جئنك بالحق“ کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ’’قرآن کو جبریلؑ نے بندوں کے کلام اور اعمال کے جواب میں اُتارا‘‘۔ غالبًا ترجمانِ قرآن حضرت ابن عباسؓ کا اشارہ اسی جانب ہے کہ قرآن کے تدریجی اور حسب ضرورت اور بروقت نزول نے صحابہ کی عمدہ تربیت کا سامان بہم پہنچایا۔(علوم القرآن الشیخ صبحی صالح، ترجمہ غلام احمد حریری:ص:۸۵تا۹۰)

حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ تفسیر امام رازی کے حوالے سے تدریجی نزول کی حکمتیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ قرآن آپ کے قلب پر نازل کیا، تا کہ اس تاریخی نزول سے بتدریج قلب مبارک اس درجہ قوی اور مضبوط ہوجائے کہ جس کلام الٰہی کی تجلی کو پہاڑ برداشت نہ کر سکے، اس کو آپ کا قلب مبارک بسہولت برداشت کر سکے، چنانچہ جب کبھی کوئی جدید وحی نازل ہوتی تو آپ کی بصیرت اور قوت قلب میں اور زیادتی ہوجاتی، بارانِ رحمت کا آسمان سے تھوڑا تھوڑا نازل ہونا کھیتی کی درستی اور پختگی کا سامان ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کوئی جدید آیت نازل ہوتی تو صحابہ کے ایمان میں اور زیادتی ہوجاتی۔

(۳) نیز وقتاً فوقتاً آیت کا حسب موقعہ اور حسب واقعہ اور حسب ضرورت نازل ہونا مزید بصیرت کا سبب ہے، جس سے یقین اور معرفت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے اور مراد کے سمجھنے میں سہولت ہوجاتی ہے۔(۴) نیز وقتاً فوقتاً جبریل امین کا آنا فقط آپ کے قلب مبارک کی تسلی اور تسکین کا باعث نہ تھا، بلکہ سب کے لئے موجب صد خیر و برکت تھا۔(۵) کفار دشمنی اور عداوت پر تلے ہوئے تھے، جب کوئی نیا عناد دیکھتے تو آپ پریشان ہوجاتے ،تو آپ کی تسلی کے لئے کوئی آیت نازل ہوجاتی ،جو آپ کی تقویت قلب کا باعث

ہوتی۔(٦) علاوہ ازیں قرآن کریم میں ایسے احکام بھی ہیں جن میں ناسخ ومنسوخ بھی ہیں، جن کا تعلق مختلف اوقات سے ہے، اور ظاہر ہے کہ ناسخ ومنسوخ دونوں کا بیک وقت نازل ہونا اور آن واحد میں دونوں کا جمع ہونا غیر معقول ہے۔(٧) نیز قرآن کریم کی بہت سی آیتیں مشرکین کے اعتراضات کے جوابات میں نازل ہوئی ہیں، اور ظاہر ہے کہ جواب؛ سوال اور اعتراض کے بعد ہوتا ہے اور اعتراض کے بعد شافی جواب کامل جانا خاص بصیرت اور معرفت کا سبب ہوتا ہے، نیز بہت سی آیتیں نئے واقعات کے فیصلہ کے متعلق نازل ہوئیں اور ظاہر ہے کہ فیصلہ تو واقعہ کے وقوع کے بعد ہی ہوگا۔(٨) نیز قرآن تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا تھا اور آپ کفار سے یہ کہتے کہ اگر تم کو اس کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے تو ایک آیت اس کے مثل بنالاؤ، جب کوئی آیت نازل ہوتی تو ہر بار قرآن کا اعجاز اور ان کا عجز ظاہر ہوتا، تو ثابت ہوگیا کہ جب بلغاء عرب ایک آیت کے مثل لانے سے عاجز ہیں تو پورے قرآن کے مثل لانے سے بدرجۂ اولی عاجز ہیں، مختصر یہ کہ مشرکین کا یہ اعتراض بے حاصل ہے، قرآن چاہے دفعۃً نازل ہو یا تھوڑا تھوڑا وہ ہر حال میں معجز ہے، کسی طرح نازل ہو، اس اعجاز میں فرق نہیں آتا، قرآن کریم کا نزول ایک دفعہ ہو یا متفرق طور پر، وہ بہر صورت معجز ہے۔

(معارف القرآن ادریسی: ج:٥،ص:١٨١–١٨٢، تفسیر مفاتیح الغیب: ج: ٢٤، ص :٧٩،روح المعانی : ج : ١٩،ص:١٥، ج:١٥، ص:١٨٨، الاتقان فی علوم القرآن :ج:١،ص:١٤٩، البرھان فی علوم القرآن :ج: ١، ص: ٢٢٨تا ٢٣٢)

تاریخِ گجرات کے مختلف ادوار

اور

تجوید وقراءت کے احوال

یہ مقالہ جامعہ کفلیتہ میں انعقاد پذیر سمینار میں پیش گیا تھا، اس کا کچھ حصہ پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں پیش کیا تھا، اس کے بعد ۲۰۰۲ء میں ماہنامہ صوت القرآن میں دیا گیا، پھر مزید اضافہ کر کے مختلف ادوار میں علماء گجرات کی تجویدی خدمات کو تاریخی حیثیت سے اجاگر کیا گیا ہے۔

تاریخِ گجرات کے مختلف ادوار اور تجوید وقراءت کے احوال

الحمد لأهله و الصلاة علی اهلها ، اما بعد !

محترم سامعین کرام !اس سے پہلے حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کی طرف سے ''گجرات کی علمی ،ادبی وثقافتی میراث'' کے عنوان پر ہونے والے سمینار میں ''تجوید وقراءت اور صوبۂ گجرات'' کے موضوع پر ایک مقالہ تحریر کر چکا ہوں، جو ماہنامہ صوت القرآن ۲۰۰۲ء میں، اور پیر محمد شاہ لائبریری کے جرنل نمبر:۳۰(ص:۲۵۳ تا ۲۷۰) میں شائع ہو چکا ہے، اس کے بعد بھی اس موضوع پر مزید تلاش وجستجو جاری تھی، لیکن کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکا، بلکہ صوت القرآن میں شائع ہونے والے مضمون پر بھی عدم اطمینانی محسوس ہوئی، کیوں کہ اس کا بیشتر مواد ''الثقافة الاسلامية''، ''تذکرۂ قاریان ہند''، ''گلزار ابرار''، ''مشائخ احمد آباد'' اور دیگر تاریخی کتب سے مأخوذ تھا، تذکرۂ قاریان ہند کے مصنف کی محنت قابل قدر ہے، لیکن موصوف کی تحریرات میں حوالہ جات نہیں ہیں اور کئی حضرات کا نام قراء کی فہرست میں اندازہ سے شامل کیا ہوا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ دیگر معتبر تاریخی کتابوں میں ان کے نام قرّاء میں شامل نہیں ہیں۔

اس سلسلہ میں مزید محنت اور تلاش بسیار کے بعد گجرات میں علم تجوید وقراءت کی جو تصویر ابھر کر سامنے آئی ہے، اس کو پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

گجرات میں تجوید وقراءت کی محنت کے سلسلہ میں تاریخ کی ورق گردانی کے بعد یہ محسوس ہوا کہ اس موضوع کو واضح کرنے کے لئے تاریخ گجرات کو مختلف سیاسی ودعوتی

ادوار میں تقسیم کرنا ضروری ہے، لہذا استقرائی طریقہ پر میں نے تاریخ کو چند ادوار میں تقسیم کیا ہے:

(۱)۱۵ھ سے لے کر ۱۶۰ھ تک کا دور (۲)۱۶۰ھ سے لے کر سلطان محمود غزنوی کے حملوں تک کا دور (۳) سلطان محمود غزنوی (۴۱۶ھ) سے لے کر خود مختار سلطنت کے قیام تک (۸۱۰ھ) کا دور (۴) خود مختار سلطنت کا (۸۱۰ھ تا ۹۹۲ھ) مجموعی ۱۸۲ سالہ دور (۵) دور اکبری (۹۹۲ھ) سے لے کر انگریز کے قبضہ تک کا دور (۶) انگریزی دور اور گجرات میں مدارس کی نشأۃ ثانیہ (۷) آزادی کے بعد سے لے کر تا حال۔

ان سات ادوار میں خود مختار سلطنت کا دور تمام ادوار میں واضح اور نمایاں ہے، کیوں کہ اس دور کی تاریخی کتابیں ہمارے پاس محفوظ ہیں، اسی طرح اکبر کے گجرات پر حملہ کر کے گجرات کو مرکزی سلطنت میں شامل کرنے سے لے کر انگریزی دور تک کے حالات کا بھی کچھ مواد مل جاتا ہے، اور انگریز کے مکمل قبضہ کے کچھ سالوں بعد گجرات میں مدارس کی نشأۃ ثانیہ ہوتی ہے، جامعہ اشرفیہ، جامعہ حسینیہ اور جامعہ ڈابھیل وغیرہ وجود میں آتے ہیں، تو اس دور کی تاریخ بھی ان مدارس کی روداد اور ان سے متعلق اکابر کی سوانح حیات سے معلوم ہو جاتی ہے، جب کہ آزادی کے بعد قائم ہونے والے مدارس کا حال ہمارے سامنے ہے۔

پہلا دور:

البتہ ابتدائی تین ادوار میں سب سے پہلا دور سرزمین گجرات کے لئے سب سے سنہرا اور بابرکت دور ہے، اس ۱۴۵ سالہ دور میں صحابۂ کرام، تابعین عظام اور تبع تابعین حضرات کا بکثرت ورود ہوا ہے، قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں بلند

کرنے والے حضرات تنہا مجاہد ہی نہیں بلکہ کتاب وسنت کے علوم کے ماہر بھی تھے، یہی وجہ ہے کہ خطۂ گجرات ایک روحانی وعلمی مرکز، تجارتی منڈی اور پرسکون زندگی کے لئے مناسب آشیانہ کی شکل اختیار کرتا چلا گیا، پروفیسر خلیق احمد نظامی اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے فرزند شاہزادہ محمد اعظم کو- جوان دنوں گجرات کا گورنر تھا- ایک خط میں لکھا تھا: ''گجرات کہ زیب وزینت ہندوستان است ، اہل کسب وارباب ہنر ہمہ جہت می باشند۔''

''اوراس میں کوئی مبالغہ نہ تھا، شاہ جہاں کی نظر میں اگر جونپور ''شیراز ہند'' تھا، تو عالمگیر گجرات کو ہندوستان کی حسن وزیبائش سمجھتا تھا، ابوالفضل کے بقول اس کی حیثیت ایک گلستان کی تھی، جس میں ہر رنگ وبو کے پھول مہکتے تھے، گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز، ارباب ہنر کا گہوارہ، ارشادو تلقین کا سرچشمہ، اقتصادی زندگی کی شہ رگ اورایک سرگرم تجارتی منڈی رہا تھا، روحانی اور مادی زندگی کی ساری نعمتیں یہاں جمع ہوگئی تھیں، بعض اعتبار سے تو ہندوستان کے قرون وسطی کی تاریخ میں اس کو پورے ملک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔'' (یادایام:ص:۱۱)

اسی کتاب میں سید مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے مسلمانوں کی نگاہ دوربیں گجرات کے سرسبز پہاڑوں پر پڑی تھی اوران کا یہ مطمح نظر اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ وہ گجرات پر قابض ومتصرف نہیں ہوگئے۔'' (یادایام:ص:۴۴)

مشہور سیرت نگار علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے سواحل ہند پر عربوں کی تاخت شروع ہوتی ہے، اور یہ وہ زمانہ تھا جب ہر کلمہ گو کے لب ودہن ''أخبرنا اور حدثنا'' کی خوشبو سے معطر تھے، یعنی صحابۂ کرام کا عہد تھا، اسلام کا یہ پہلا مجاہدانہ قافلہ ''تھانہ'' پر حملہ آور ہوا تھا، جو ان دنوں (بمبئی کے بجائے) بحر ہند کا آباد بندرگاہ تھا، اور اس کے بعد بھروچ (واقع گجرات) اس مقدس بحری عسکر کی دوسری منزل گاہ تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں فوجوں میں دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہستیوں کی کچھ تعداد یقیناً شامل ہوگی، اور اس لحاظ سے ہندوستان بھی ان خوش قسمت ملکوں میں ہے جن کی خاک صحبت یافتگانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں سے لگ کر ہماری آنکھوں کا کحل الجواہر بن چکی ہے۔'' (مقالات سلیمانی: ۲/۱،۲)

سات جہادی ودعوتی حملے:

پہلا حملہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی میں مسلمان بحرین کے اس علاقہ پر قابض ہو چکے تھے جس سے ہندوستان وچین کا قدیم زمانہ سے تجارتی تعلق چلا آرہا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے قبل ہی بہت سارے ہندوستانی عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل پر جمع ہو گئے تھے، غزوۃ الہند کی روایات بھی حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پیش نظر تھیں، لہذا سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حضرت حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ہندوستان روانہ کیا، حضرت حکم رضی اللہ عنہ نے تھانہ اور بھروچ پر حملہ کیا

اور فتح یاب ہوئے۔

دوسرا حملہ: حضرت عباد بن زیاد اموی (تابعی) کی سرکردگی میں ہوا، عباد حدود سجستان اور حدود ہند کے علاقوں میں داخل ہوئے اور کچھ کے رن تک پہنچے اور اس کے نواح میں کچھ عرصہ قیام کیا۔

تیسرا حملہ: محمد بن قاسم نے جب دیبل پر حملہ کر کے اس کو فتح کرلیا تو راجہ داہر وہاں سے بھاگ گیا تھا اور حدود سندھ سے نکل کر راجہ راسل کی راجدھانی ''کچھ'' کے مقام پر پہنچ گیا تھا، اس کے ساتھ کچھ کے ہی علاقہ میں فیصلہ کن جنگ ہوئی اور راجہ داہر مارا گیا، اس کے بعد محمد بن قاسم نے ہندوستان (گجرات) کے باقی علاقوں اور شہروں کو فتح کرنے کا عزم کرلیا تھا، لہذا بھیلمان پر فوج کشی کی، وہاں والوں نے مقابلہ نہیں کیا اور شرائط کے مطابق صلح کرلی، اس کے بعد محمد بن قاسم کی فوج سورٹھ (کاٹھیاواڑ) کی طرف بڑھی، سورٹھ والوں (یا اس کے کسی ٹھاکر) نے بھی بغیر مزاحمت کے مسلمانوں کی اعانت گذاری کا اعلان کردیا۔

چوتھا حملہ: ۱۰۷ھ میں عراق کے حاکم خالد عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کی حکومت سے الگ کر کے جنید بن عبدالرحمٰن کو سندھ کا حاکم بنایا گیا، (عمر بن مسلم نے سندھ کی ولایت کے درمیان کچھ کو فتح کر کے سندھ کے تابع کردیا تھا) جنید نے رادھن پور کے پاس موجود پنچاسر کو (جو سولنکی راجہ کا پایۂ تخت تھا اور سولنکیوں نے اسے چاوڑا خاندان سے چھین لیا تھا) فتح کرلیا ،سولنکی فوج یہاں سے بھاگ کر امداد کے لئے جنوبی گجرات پہنچی اور بھروچ میں جنگی تیاری کرنے لگی، جنید کو جب اس کی خبر ہوئی تو فوراً بھروچ پہنچا اور ایک ہی جنگ میں اس کا خاتمہ کردیا، پھر جنید نے بھیلمان اور گجرات کو فتح کیا، یہاں اس کو اتنا مالِ غنیمت ملا کہ زائرین

وسائلین کودینے کے بعد بھی تقریباً چار کرڑوڑ بچ گیا۔

پانچواں حملہ: جنید کے حملے کے بعد عربوں نے تقریباً ۳۰ یا ۳۲ سال تک گجرات کی طرف رخ نہیں کیا، ۱۳۲ھ میں اموی حکومت کی جگہ عباسی حکومت پر فائز ہوئے اور دمشق کے بجائے بغداد کو اپنا دارالخلافت بنایا، اس انقلاب نے ہندوستان کو عرب سلطنت سے بہت قریب کردیا، عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے ۱۴۰ھ میں ہشام بن عمر تغلبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، ہشام نے سندھ کے اندرونی حالات درست کر کے گجرات کی طرف توجہ مرکوز کی اور گجرات کے ایک مرکزی مقام بھاڑبھوٹ (جو بھروچ سے تقریباً ۱۸ر کلومیٹر دور ہے) کی طرف عمرو بن جمل کی سرکردگی میں ایک بحری فوج روانہ کی، پھر خود ہی مزید تیاری کر کے گندھار (بھروچ) پر حملہ آور ہوا، اس کو فتح کر کے چند روز قیام کیا اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی، یہ سندھ کے علاوہ ہندوستان میں پہلی مسجد تھی۔

چھٹا حملہ: ۱۴۰ھ سے ۱۵۸ھ تک عرب تاجروں کو گجرات سے کوئی شکایت نہیں ہوئی، البتہ عباسی خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ) کے تخت خلافت پر بیٹھنے کے دوسرے سال ۱۵۹ھ میں اس نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کی سرکردگی میں سرکاری اور غیر سرکاری (رضا کار) فوجوں کی ایک بڑی تعداد بھاڑبھوٹ کی طرف روانہ کی اور ۱۶۰ھ میں اس کو فتح کیا۔

ساتواں حملہ: خلیفہ مأمون اور معتصم کے زمانہ میں (۱۹۸ھ) جنوبی گجرات کے ایک مشہور سمندری مقام سندان (سنجان) پر بنوسامہ کے آزاد کردہ غلام فضل بن ماہان نے قبضہ جمایا اور اپنی خود مختار حکومت قائم کی، جو اس کے بعد اس کے لڑکے محمد بن فضل اور ماہان بن فضل کی باہمی خانہ جنگی میں ۳۰ر سال کے عرصہ میں تباہ ہوگئی۔

ان حملوں میں محمد بن قاسم کے سندھ پر حملہ کے موقع سے آپ کے ساتھ آنے والے ایک ممتاز ومشہور قاری اور محدث **''جنید بن عمرو العدوانی المکی''** تھے، جو مکہ مکرمہ کے جید ومعروف قاری تھے، علم حدیث میں بھی ان کا مرتبہ بڑا اونچا تھا، ثقہ اور کثیر الحدیث راوی تھے، آل زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے، انہوں نے حمید بن قیس سے روایت کی اور خود ان سے محمد بن عبداللہ بن قاسم نے درس حدیث لیا، قرأت مجاہد سے سیکھی، منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں جنید بن عمرو اور عبداللہ بن کثیر سے بڑھ کر کوئی قاری نہ تھا۔ آپ ان تبع تابعین میں سے تھے جو فتح سندھ کے موقع پر محمد بن قاسم کے ساتھ برصغیر وارد ہوئے تھے، محمد بن قاسم نے ساوندری کے مقام پر پہنچ کر ہراور میں قیام کیا تھا، پھر ہراور سے انہوں نے جنید بن عمرو کو فوج کے ایک دستے کا کمان دار بنا کر مخالفین اسلام کے خلاف جہاد کے لئے بھروچ روانہ کیا تھا۔

محمد بن قاسم کے حالات میں مدارس قائم کرنے اور قرآن وحدیث کی تعلیم کے لئے اساتذہ مقرر کرنے کا اہتمام دلالت کرتا ہے کہ آپ کے زمانہ میں وسطی گجرات اور کاٹھیاواڑ میں قرآن کریم کی تعلیم کا نظم ضرور ہوگا، نیز حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید جنید بن عمرو العدوانی جیسے مشہور قاری کو شہر بھروچ روانہ کرنا بھی دلالت کرتا ہے کہ آپ نے جہاد کے ساتھ ساتھ لشکر میں اپنے ذوق کے قراء حضرات بھی تیار کئے ہوں گے، کیوں کہ جب بھوکا انسان دو اور دو کے جواب میں چار روٹی سے اپنی بھوک کو نمایاں کرتا ہے، تو اتنا بڑا صاحب فن وحریص علم اپنے ذوق کو اہل شوق حضرات کے سامنے پیش نہ کرے یہ تعجب کی بات ہے، مزید یہ ہے کہ امیر لشکر ہونے کی حیثیت سے اس کو اِس کے مواقع بھی فراہم ہوں۔

شہر بھروچ میں ۱۵ھ میں صحابۂ کرام کی آمد کے بعد حضرت جنید بن عمرو کا داعیانہ ومجاہدانہ شان سے تشریف لانا فضیلت در فضیلت کو ثابت کرتا ہے، تجوید وقراءت کے اس امام کا یہ حق ہے کہ بھروچ والے اس امام فن کی قربانیوں کو ضائع نہ ہونے دیں، بلکہ فن تجوید و قراءت میں مہارت پیدا کر کے آپ کو خراج عقیدت پیش کریں۔

اسی طرح چھٹے حملہ میں آنے والے رضا کار مجاہدین میں محدث جلیل ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ قرآن وحدیث کے دیگر ماہرین بھی ضرور ہوں گے، لیکن چوں کہ ان حضرات کے حالات تاریخ بلاذری، طبقات ابن سعد اور فتوح البلدان وغیرہ میں نہایت ہی مختصر طور پر مذکور ہیں، لہذا حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

دوسرا دور:

۱۶۰ھ کے بعد سے سلطان محمود غزنوی کے حملہ تک کے حالات بھی بظاہر بہت واضح نہیں ہیں، لیکن حسن اتفاق سے سندھ میں اسلامی حکومت کے قیام اور گجرات میں ۷۷۰ء مطابق ۱۶۰ھ میں چالوکیہ خاندان کا خاتمہ ہونے کے بعد گجرات کا دکن کے راشٹ کوٹ راجاؤں کے ماتحت ہونے نے راشٹ کوٹ راجاؤں کو مسلمانوں سے قریب کر دیا، راشٹ کوٹ راجاؤں کا لقب ''ولبھ رائی'' تھا، اس خاندان کے بعض راجہ مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ اور دوست گذرے ہیں، انہیں کے عہد حکومت میں عرب تاجر اور مہاجر گجرات میں ہزاروں کی تعداد میں آئے اور مستقل اقامت اختیار کر لی، حسن اتفاق سے اس دور میں مسلمان تاجر اور مؤرخ گجرات میں آئے اور انھوں نے اپنے سفرناموں میں مسلمانوں کے جو احوال پیش کئے ہیں، ان سے محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان اس دور میں گجرات میں نہایت

اطمینان کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے اور ان کو کتاب وسنت پر عمل کرنے کی مکمل آزادی تھی، ابن خرداذبہ (آمد:۲۱۱ھ مطابق ۸۲۶ء، وفات: ۳۰۰ھ، مطابق ۹۱۲ء) نے اپنی کتاب "المسالك والممالك" میں ان راجاؤں کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح تیسری صدی ہجری کے دوسرے سیاح "سلیمان تاجر" نے اپنی کتاب "سلسلۃ التواریخ" (جس کی تکمیل بعد میں ابوزید سیرفی م:۲۳۷ھ نے کی) میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے، "بزرگ بن شہریار" نے تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں گجرات کا سفر کیا تھا، انہوں نے "عجائب الہند" میں اور مسعودی (م:۳۴۶ھ) نے "مروج الذہب ومعادن الجوہر" میں بھی کافی کچھ لکھا ہے، جس سے اس دور کی کچھ تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

علامہ سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ یاد ایام میں رقم طراز ہیں:

"اسلامی فتوحات سے قبل ہندوستان کے جس علاقہ سے عرب سب سے زیادہ متعارف تھے وہ گجرات تھا، عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے، البیرونی اور ادریسی نے یہاں کے دریاؤں اور جغرافیائی حالات پر دل چسپ روشنی ڈالی ہے۔

مسعودی (م: ۳۴۶ھ مطابق :۹۵۷ء) "مروج الذہب ومعادن الجوہر" میں گجرات کے راجہ بلہرا کے متعلق لکھتے ہیں: سندھ اور ہندوستان کے راجاؤں میں راجہ بلہرا کی طرح مسلمانوں کو اور کسی کی حکومت میں عزت حاصل نہیں ہے، اسلام اس راجہ کی سلطنت میں محفوظ اور معزز ہے، اس کے ملک میں مسلمانوں کی نماز پنجگانہ کی مسجدیں اور جامع مسجد ہیں، جو آباد ہیں۔

گجرات کے راجہ نے عرب تاجروں کے لئے جو ساحلی علاقوں میں بس گئے تھے، مسلمان قاضی مقرر کئے تھے، جو ''ہنرمن'' کہلاتے تھے، تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ گجرات میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہونے سے قبل مسلم آبادی اور اس کے ثقافتی ادارے وجود میں آ گئے تھے۔'' (یادایام: ص:١٦)

مشہور مؤرخ مسعودی لکھتے ہیں:

میں نے ہندوستان کے شہر کھنبایت میں دیکھا اور یہی وہ شہر ہے جس کی طرف کھنباتی جوتے منسوب ہیں، جو یہاں اور اس کے قریب سندان اور سوپارہ وغیرہ شہروں میں بنتے ہیں، میں کھنبایت ٣٠٣ھ میں گیا تھا، اس زمانہ میں وہاں کا راجہ بانیا تھا، جو برہمنی مذہب کا پابند تھا اور مہانگر کے راجہ ولبھ رائے کے ماتحت تھا، اس کے راجہ ''بانیا'' کو مناظرہ سے بڑی دل چسپی تھی اور جو مسلمان یا دوسرے مذاہب کے لوگ اس کے ملک میں آتے، وہ ان سے بحث ومناظرہ کرتا تھا۔

اسی طرح ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''میں ٣٠٤ھ میں ہندوستان کے شہر چیمور میں (جو راجہ ولبھ رائے کی مملکت لار کا علاقہ ہے) موجود تھا اور اس زمانہ میں جو راجہ تھا اس کا نام جانچ تھا، اس وقت تقریباً دس ہزار مسلمان وہاں آباد تھے، جو اصل میں بیاسرہ، سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور دوسرے ملکوں کے تھے، لیکن ان علاقوں میں بودوباش اختیار کر لی تھی، ان میں سے بہت سے معزز اور بڑے تاجر ہیں، جیسے موسی ابن اسحاق صنداپوری وغیرہ، اور ہنرمندی کے عہدہ پر ان دنوں ابوسعید معروف بن زکریا مامور تھے، ہنرمن سے مراد مسلمانوں کا سردار ہے، اس کی شکل یہ تھی کہ راجہ

کا قاعدہ تھا کہ وہ کسی مسلمان رئیس ہی کو ان کا سردار بنادیتا تھا اور مسلمانوں کے تمام معاملات اسی کے سپرد ہوتے تھے، بیاسرہ سے وہ مسلمان مراد ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے، اسی نام سے وہ مشہور ہیں، اس کا واحد بیسر ہے۔'' (دیکھئے: عرب و ہند کے تعلقات: ۲۸۱)

ان کے علاوہ علامہ بلاذری (م: ۲۷۹ھ، مطابق: ۸۹۲ء) نے فتوح البلدان میں، یعقوبی (م: ۲۸۴ھ مطابق: ۸۹۷ء) نے تاریخ یعقوبی میں، ہمدانی (۲۷۹ھ کے بعد) نے کتاب البلدان میں، ابن رستہ (م: ۲۹۰ھ) نے ''الاعلاق النفیسه ''میں، طاہر مقدسی (چوتھی صدی ہجری کا وسط) نے کتاب البدء والتاریخ میں، اصطخری (۳۴۰ھ، مطابق ۹۵۱ء) نے المسالك و الممالك میں اور بشار مقدسی (م: ۳۷۵ھ مطابق: ۹۸۵ء) نے احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم میں تفصیل سے گجرات کے احوال ذکر کئے ہیں۔(واضح ہو کہ اصطخری کو یہ امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ وہ ابن حوقل کے ہم عصر ہیں، بلکہ دونوں کی ہندوستان میں ملاقات بھی ہوئی تھی)

لیکن افسوس ہے کہ ان تمام حضرات نے گجرات کے تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی حالات پر زیادہ تبصرہ کیا ہے، مسلم آبادی کے دینی احوال اور تعلیم و تعلم کے ذرائع کے سلسلہ میں سوائے چند اشاروں کے وہ عمومی طور پر خاموش ہیں، اس لئے اس دور میں مسلم آبادی اچھی خاصی تعداد میں ہونے کے باوجود صحیح صورت حال واضح نہیں ہو رہی ہے۔

اصطخری اور مسعودی نے مساجد اور شرعی احکام وقوانین کی مناسب رہنمائی کے لئے باصلاحیت وذی استعداد افراد کے تقرر کی بات ذکر کی ہے، چنانچہ اصطخری اپنی کتاب ''المسالک والممالک'' میں لکھتے ہیں:

’’کھنبایت سے راجہ بلہرا کے شہر چیمور تک سب ہندوؤں کے شہر ہیں، مگر ان میں کچھ مسلمانوں کی بھی آبادی ہے اور راجہ بلہرا کی طرف سے کوئی مسلمان ہی ان کے معاملات کا نگران ہوتا ہے، ان شہروں میں مسجدیں اور جامع مسجدیں ہیں، جن میں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے، بلہرا کی راجدھانی کا نام مہانگر ہے جہاں وہ رہتا ہے، اس کی سلطنت بہت وسیع ہے۔‘‘

تیسرا دور: (محمود غزنوی سے لے کر خود مختار سلطنت کے قیام تک کا دور)

سلطان محمود غزنوی کا گجرات پر حملہ خود ایک بزرگ محمد بن حسن بن علی العراقی مانگرولی کی گجرات میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کی داستان سننے پر ہوا تھا، جو اس وقت گجرات میں مسلم آبادی کے وجود کا ثبوت بھی پیش کر رہا ہے، سلطان کے حملہ کے بعد بھی وقتی طور پر حالات کے تلخ ہونے کے باوجود مسلمان داعیوں کی مسلسل آمد و رفت جاری رہی، اسی دور میں بھروچ میں ’’بابا ریحان‘‘ اور ان کے رفقاء کی آمد ہوئی، البیرونی نے بھی قریب قریب اسی دور میں یہاں کا سفر کیا، الادریسی (۴۹۳ھ) نے ’’نزهة المشتاق في اختراق الآفاق‘‘ میں اور قاضی رشید بن زبیر (۴۶۲ھ) نے ’’الذخائر والتحائف‘‘ نامی کتاب میں گجرات کے حالات ذکر کیے ہیں۔

اسی دور سے متعلق علامہ سید عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیلی حالات نقل فرمائے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ۴۱۶ھ میں سلطان محمود غزنوی کو گجرات کا خیال پیدا ہوا اور اسی ارادہ سے وہ ملتان سے نکل کر نہایت دشوار گذار راستہ طے کرتے ہوئے، ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے نہر والہ پہنچا، اسے فتح کر کے دیولواڑہ کو بھی تہہ تیغ کیا، پھر

سومنات کا قصد کیا، جہاں تمام دشواریوں پر غالب آتے ہوئے فتح حاصل کر کے بے شمار مال ودولت لے کر بخیر وخوبی لوٹ گیا۔ پھر ۵۷۴ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے گجرات پر دھاوا کیا، اس وقت کے راجہ بھیم دیو سے سخت مقابلہ ہوا، جس میں شہاب الدین کو شکست اٹھانی پڑی۔ ۵۹۱ھ میں قطب الدین ایبک نے اپنے آقا شہاب الدین غوری کی اجازت سے گجرات پر حملہ کیا اور بھیم دیو کو شکست فاش دی، پھر اسی قطب الدین ایبک کو ۵۹۷ھ میں شہاب الدین نے دوبارہ حملہ کی غرض سے بھیجا، اس بار بھی قطب الدین فاتح رہا، اس کے بعد علاء الدین خلجی کا دور آیا، چنانچہ اس نے ۶۹۶ھ میں "اُلغ خان" کو تسخیر گجرات کے لئے روانہ کیا، اس وقت راجہ کرن حکومت کا ذمہ دار تھا، اس نے کسی طرح اپنی جان بچائی، لیکن الغ خان نہ صرف فتحیاب ہوا بلکہ مال کثیر اور شاہی افراد پر بھی قابض ہو گیا تھا، اسی الغ خان نے بیس برس تک گجرات میں نہایت خوش اسلوبی سے حکمرانی کی اور ملک کو فتنہ وفساد سے پاک کر دیا۔ (یاد ایام: ص: ۴۷، ۴۸)

دعوتی واصلاحی تعلقات اور تاریخی شہادتیں:

محمود غزنوی کے حملہ کے بعد بھی داعیان اسلام کے قافلہ کی گجرات آمد جاری رہی، ان بزرگان واولیاء ہی میں سے ایک شخصیت بابرکت بابا ریحان کی بھی ہے، تاریخ نے ان سے متعلق جس طوطا چشمی کا سلوک کیا ہے، اس کا تصور بھی افسوس ناک ہے کہ ایسی عظیم ہستی کے حالات سے تاریخ کا دامن خالی ہے، آپ گرچہ کسی مشہور سلسلہ سے منسلک نہیں تھے، لیکن اشاعت اسلام کی غرض سے گجرات کے مشہور علاقہ بھروچ تشریف لائے تھے اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

مشہور انگریز مؤرخ ''مسٹر فاربس'' نے ان کی نسبت اپنی کتاب (Oriental Memories) میں لکھا ہے:

''۱۰۷۸ء اور ۴۹۲ھ میں جب بھروچ کے علاقے میں ہندوؤں کا راج تھا، بغداد سے ایک بزرگ باوا ریحان مشائخ اور فقراء کی تعداد کے ساتھ اشاعت اسلام کی غرض سے یہاں وارد ہوئے، لیکن راجہ نے ان کی مخالفت کی اور اپنے بیٹے رائے کرن کو ایک بڑی فوج دے کر باوا ریحان کے مقابلہ کے لئے بھیجا، رائے کرن باوا صاحب کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے باوا صاحب کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا اور ملک محمد اپنا نام رکھا، ان دونوں کی کوششوں سے راجہ کی بیٹی بھاگ دیوی اور اس کے علاوہ بے شمار دوسرے ہندو اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر باوا ریحان کے مرید ہوگئے، لیکن رائے کرن کے باپ نے ان کی مخالفت کی اور باپ، بیٹے میں بڑا سخت معرکہ ہوا، باپ کامیاب رہا اور رائے کرن، اس کی بہن اور نو مسلموں کی بھاری تعداد لڑائی میں شہید ہوئی، اس کے بعد راجہ نے باوا صاحب سے صلح کرلی اور جب ان کی وفات ہوئی تو وہ بھروچ سے باہر ایک بلند ٹیلے پر دفن ہوئے۔''

ایک حکایت یہ بھی ملتی ہے کہ بابا ریحان دراصل ماوراء النہر کے متوطن تھے، اپنے بھائی بابا احمد اور دیگر ۴۰؍ مریدین ورفقاء سمیت پانچویں صدی ہجری میں بھروچ میں جلوہ افروز ہوئے، اس عہد کے راجہ سے معرکہ کیا اور پھر ۴۳۰ھ میں مدرسہ اور خانقاہ تعمیر کی۔

اس طرح علاقہ راندیر سورت کی ترقی سے پہلے کافی مشہور تھا، جس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ البیرونی نے اپنی تصانیف میں راندیر کا ذکر کیا ہے، ۱۲۲۵ء میں یہاں جینیوں کی حکومت تھی، اس وقت عرب تاجروں اور ملاحوں نے مل کر جینیوں کا مقابلہ کیا اور شہر

پر قبضہ کرلیا، آگے چل کر یہ عرب ''نوائط'' کہلائے۔

اسی سلسلہ میں سخنوران گجرات میں مذکور ہے کہ خلیفہ سفاح عباسی ۷۴۹ء کے عہد میں کوفہ سے ایک مؤمن قبیلہ راندیر آیا تھا، ان لوگوں نے راندیر میں اشاعتِ اسلام کی خدمت انجام دی تھی، ۱۱۵۶ء میں وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی، وہ اب تک موجود ہے، ۱۱۲۹ء میں جب سلطان صلاح الدین نے مصر پر قبضہ کرلیا تو وہاں کے بعض اسماعیلیوں نے گجرات میں پناہ لی تھی، ایک شخص نورالدین ستاگر نامی سات اماموں کی تقلید کرتا تھا، گیارہویں صدی میں گجرات میں تبلیغ میں مصروف پایا جاتا ہے، اس نے ۱۰۹۴ء میں وفات پائی، امام مستنصر باللہ ۱۰۹۴ء کے عہد میں احمد نامی ایک شخص کو بغرض تبلیغ گجرات بھیجا گیا تھا۔ (سخنوران گجرات: ۲۴)

راندیر سے زیادہ شہرت کھنبایت کی بندرگاہ کو حاصل تھی، جو عرب و ہند کی آمد ورفت کے لئے قدیم راستہ ہونے کی وجہ سے معروف بندرگاہ تھی، یہاں شروع ہی سے عربوں کی آبادیاں قائم ہوگئی تھیں، کئی بوہرے مبلغین اور دیگر بزرگانِ دین یمن وعرب کے دوسرے حصوں سے یہاں پہنچے اور اپنے اپنے عقائد کی اشاعت کرنے لگے، مشہور بوہرہ فاضل ''محمد علی''۔ جنہیں پیر پرواز بھی کہتے ہیں۔ پہلے کھنبایت ہی تشریف لائے تھے، آج بھی ان کا مزار بوہروں کی مشہور زیارت گاہ ہے، ان کے علاوہ دیگر بزرگان دین کی مزاریں بھی موجود ہیں۔

ساحلی مقامات کو چھوڑ کر گجرات کے جس شہر میں اسلامی مبلغ سب سے پہلے پہنچے، وہ ''نہروالہ'' (پٹن) ہے، احمد آباد کی تعمیر سے پہلے یہ بڑا پر رونق شہر اور گجرات کے

ہندوراجاؤں کادارالسلطنت تھا، اس شہر کے بزرگوں کے حالات سید احمد صاحب نے ''منازل الاولیاءٴ'' میں جمع کئے ہیں اور''مرآۃ احمدی'' میں ان کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، ان بزرگوں کے حالات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم فاتحین کی آمد سے قبل ہی یہ دلوں کو فتح کرنے والے بزرگان خدا کہاں کہاں پہونچ چکے تھے۔ چنانچہ پہلی شخصیت جس کا تذکرہ ملتا ہے، وہ ایک بوہرہ داعی تھے، جنہیں یمن سے تبلیغ دین کے لئے بھیجا گیا تھا، نام آپ کا عبداللہ یا محمد بیان کیا جاتا ہے، یہ راجہ سدھ راج جے سنگھ (م:۵۳۸ھ) کے زمانہ میں پٹن گئے تھے، ایک روایت کے مطابق مذکورہ راجا نے آپ کے ہاتھ پر ایمان بھی قبول کیا تھا، جب کہ بعض کا کہنا ہے کہ سیدی احمد نے اسے حلقہ بگوش اسلام کیا تھا، حضرت حاجی ہود رحمۃ اللہ علیہ اولین بزرگ ہیں جنہوں نے نہروالا پٹن میں سکونت اختیار کی اور سن ۱۱۴۱ء میں وہیں وفات پائی، شیخ احمد عرفاتی متوفی سن ۱۲۴۷ء، بابا حاجی متوفی ۱۲۷۱ء، شیخ احمد دہلوی المعروف بہ بابا دھلیا (خلیفہ شیخ محی الدین علوی دہلوی) متوفی سنہ ۱۱۶۰ء، حضرت قاضی محمود دریائی کے جداعلیٰ شاہ علی سرمست اور دیگر نے گجرات کو اپنا وطن ثانی بنالیا اور رشد وہدایت کی خدمت انجام دی۔

رفاعی خاندان سے ہندوستان آنے والے پہلے بزرگ نجیب الدین عبدالرحیم محبوب اللہ بن سید بن عمر ہیں، ۶۸۷ھ میں عراق میں پیدا ہوئے، وہ مکہ ہوتے ہوئے گجرات میں پیران پٹن پہنچے، اور بعد میں احمد آباد کو دائمی اقامت گاہ بنالیا۔ (سخنوران گجرات:۲۴)

ہندوستان میں سیاسی فاتحین کی حیثیت سے مسلمانوں کی آمد سے قبل عرب اور ایرانی تاجروں کی حیثیت سے آباد تھے، بلکہ بعضوں نے گجرات کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا اور

وہ یہیں پیوندِ خاک بھی ہوئے، ان کی زبانوں یعنی عربی اور فارسی سے یہاں کے لوگ مانوس تھے، اس جگہ مسجدوں اور مزاروں کے کتبوں کی چند شہادتیں آج بھی موجود ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ گجرات پر ۹۶۱ء سے ۱۲۹۷ء تک سولنکیوں کا اقتدار اور دور دورہ تھا، پھر ۱۲۹۷ء سے ۱۵۷۳ء تک عنانِ حکومت اور باگ ڈور مسلمانوں کے قبضہ میں رہی، کرن دیو واگھیلا کے عہد میں گجرات میں اقتدار مسلمانوں کا تھا، اس سے کئی صدیوں پہلے مشرق وسطیٰ کے مسلمان گجرات کے مختلف مقامات پر چند افراد کے گروہ میں مجتمع ہو کر آبادی کی شکل میں بود و باش اختیار کر چکے تھے، یہ لوگ ناخدا اور تجار کی حیثیت سے مختلف مقامات میں خوشحالی سے زندگی گذارتے تھے، ۱۱۷۰ء تا ۱۲۷۰ء میں اہلِ عرب کے حملے سے پہلے ہی یہ لوگ آباد ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر زیڈ. اے. دیسائی (Dr.Z.A.Desai) کی تحریر کے مطابق مسلمانوں کی آمد اولاً گجرات ہی میں بغرض تجارت ۶۳۶ء میں ہوئی، گجرات میں کھمبایت، انہل واڑ پٹن، بھروچ، ویراول، جونا گڈھ اور بھدریسور (کچھ) سے حاصل شدہ کتبات سے یہ بات درجۂ یقین تک پہنچ جاتی ہے کہ ان لوگوں کی بڑی بڑی آبادیاں ان شہروں میں آباد ہوئی تھی۔

قدیم مسلمان آبادیوں کے متعلق ہندوستان کے کسی بھی گوشہ اور خطہ سے کتبات جیسے ثبوت نہیں ملے، صرف گجرات ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں سے حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ نے بارہویں صدی کے مجموعی طور پر ۹ کتبات تلاش کر لئے، یہ اس دور کے ہیں جب گجرات میں برسرِ اقتدار چالکیہ اور واگھیلا خاندان تھا، یہ تمام کتبات کھمبایت، ویراول، جونا گڈھ، انہل واڑ پٹن اور سومناتھ سے ملے، جو ۱۲۱۸ء سے ۱۲۹۱ء کے درمیان مکتوب ہیں، جب کہ ''شعبۂ تحقیق آثارِ قدیمہ کچھ بھوج'' کے تعاون سے حکومت ہند کے محکمۂ

آثارقدیمہ کو جولائی ۱۹۶۱ء میں صرف بھدریسور ہی سے ۸؍کتبات ہاتھ لگے،اس سے یہ نتیجہ بلکہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں مسلم آبادیاں کچھ میں اور بطورخاص بھدریسور میں زیادہ ہی تعداد میں بڑھی ہوگی، اتنا ہی نہیں بلکہ بھدریسور سے دستیاب ۸؍کتبات میں سے ۵؍مؤرخ ہے یعنی ان پر تاریخ درج ہے اور ۳؍غیر مؤرخ ہے، تاریخ والے ۵؍کتبات بالترتیب سن عیسوی کے مطابق ۱۱۵۹،۱۱۷۴، ۱۱۷۷اور ۱۲۰۹کے ہیں اور ایک کتبہ سن ۱۲۲۳ کا ہے،اس طرح آخر الذکر کتبہ کے علاوہ بقیہ ۴ کتبات گجرات سے حاصل شدہ ۹؍کتبات سے قدیم اور پرانے ہیں۔

Annual Report on India EP Grapy for 1961-62 Appendix D

میں حکومت ہند کے محکمۂ آثارقدیمہ نے بھدریسور سے تلاش شدہ ۸؍کتبات کی فہرست درج کی ہے ، یہ کتبات ۲ جگہوں سے تحقیق وتلاش کر کے نکالے گئے ہیں: (۱) درگاہ لال (لعل) شاہ باز ، یہ جین دھرم شالہ سے وسیٔ معبد (تیرتھ دھام) جاتے ہوئے دائیں طرف واقع ہے۔(۲) شش ودہ عمودی (سولہ ستون والا) جگد وشاہ داتار کا محل ، یہ وسیٔ معبد (تیرتھ دھام) کے صدر گیٹ سے دکھائی دینے والا ویران اور کھنڈر محل ہے، یہ تمام کتبات عربی زبان میں ہیں اوران کا خط Flowery کوفی (پھول دار کوفی خط) ہے جس کا شمار قدیم ترین خط میں ہوتا ہے، اس خط میں حروف کے موڑ اور پیچ وخم میں یہ خوبی ہے کہ ہر حرف کا موڑ اور پیچ وخم پھول کی شکل کا بنتا ہے، اگر عوام الناس میں سے کوئی اس کو دیکھے تو یہی سمجھے گا کہ یہ پھولوں کے ہار ہیں، آج بھی لال شاہ باز کی درگاہ کے اندرون وباہری گنبد کے نیچے ہر جانب چھ انچ کے عرض کی ایک تراشی ہوئی نقش شدہ پٹی ہے جس کو دیکھنے سے پھولوں کے ہار کا نقش معلوم

ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ عربی تحریر ہے، اس درگاہ کے شمالی گیٹ کے اوپر جو نقش کندہ کیا ہوا ہے وہ اچھی طرح پڑھا نہیں جا سکتا لیکن ڈاکٹر دیسائی کی رائے کے مطابق اس میں مذہبی تحریر مکتوب ہے، جب کہ جنوبی دروازے پر قرآن کی آیات کندہ ہیں جو اچھی طرح پڑھی جا سکتی ہیں، اس دیوار پر قرآن شریف کی سورت نمبر ۳۹ کی آیت نمبر ۳۷ مکتوب ہے، اور اس کے مشرقی سمت کے کمرے کی مغربی دیوار پر جو کتبہ ہے اس میں سن ۵۵۴ھ ذوالحجۃ الحرام (دسمبر: ۱۱۵۹، جنوری ۱۱۶۰) مکتوب ہے، جب کہ اس کے احاطے میں ایک قبر ہے جس کے سرہانے ایک ستون ہے، اس کی چاروں طرف کچھ لکھا ہوا ہے جس میں عبدالعزیز علی کی وفات کے بارے میں بھی لکھا ہوا ہے، اس کتبہ پر ''۲۰/شعبان ۵۶۹ھ مطابق ۲۶/مارچ ۱۱۷۴ء منگل'' لکھا ہوا ہے، اور قبر کی دیوار پر قرآن کی سورت نمبر ۹ کی آیت ۲۱،۲۲ کندہ ہے، یہ کتابت بھدریسور لال شاہ باز درگاہ سے دستیاب کتبات سے بھی پرانی ہے، جو اس بات کا دستاویز اور ثبوت ہے کہ بھدریسور اور اس کے قرب وجوار میں مسلمان آسودگی وخوشحالی کی زندگی گذارتے تھے۔ جنہوں نے ۸۰۰--۹۰۰ سال قبل اس سرزمین پر ایسی عمارتیں وقبریں اور ایسے کتبات بنوائے ہوں جو بہت ہی محنت ومشقت کے بعد وجود میں آسکتے ہیں، وہ لازمی طور پر خوشحال اور اہل ثروت رہے ہوں گے، مزید براں یہ کہ برادران وطن کے ساتھ آپس میں تعظیم وتکریم اور اتفاق واتحاد سے رہے ہوں گے۔

جگد وشاہ داتار کے محل جو شش ودہ عمودی کھنڈر سے معروف تھا، وہاں سے بھی تین قبروں کا پتہ چلا ہے اور تینوں قبروں کے اوپر دونوں طرف کچھ لکھا ہوا ہے..... ان تینوں میں سے ایک کتبہ جمادی الاولی ۵۷۳ھ مطابق اکتوبر، نومبر ۱۱۷۷ء کا ہے جس میں کسی کی

تاریخ وفات درج ہے لیکن نام غیر واضح ہے جو پڑھا نہیں جاسکتا، دوسرے کتبہ پر بھی کسی کی وفات کے بارے میں لکھا ہے جس میں نام پڑھا نہیں جاسکتا، البتہ تاریخ واضح ہے، اس پر تاریخ شعبان ۶۰۵ھ مطابق: فروری، مارچ ۱۲۰۹ء درج ہے اور تیسرے کتبہ پر ۱۰/شعبان ۶۲۰ھ مطابق ۸/ستمبر ۱۲۲۳ء جمعہ مرقوم ہے۔

بھدریسور سے دستیاب یہ ۸/کتبات تیرہویں صدی عیسوی میں کچھ میں مسلم آبادیوں کی نشاندہی کررہے ہیں اور اس پر محکمۂ آثار قدیمہ حکومت ہند کی جانب سے مزید تحقیقات جاری ہیں۔

واگھیلا خاندان کے ایک راجہ ارجن دیو کے دور کا ایک عربی کتبہ سومناتھ (پربھاس پاٹن) سے ملا جس میں پانی کے جہاز کے مالک نورالدین فیروز کا نام درج ہے، یہ وہی کتبہ ہے جو ایک سنسکرت کتبہ سے عربی میں نقل کیا گیا ہے، جس کا اصل سنسکرت کتبہ آج بھی ویراول کے ہرسد ماتا مندر میں محفوظ ہے، لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتبہ کسی مسجد سے نکال کر اس مندر میں لگایا گیا ہوگا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمان اور برادران وطن اتفاق، Cathlicity اور Tolerance سے رہتے تھے، بھوج (Bhuj) کے عالی والا (اعلی والا) مقام سے بھی ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جس میں اوپر سنسکرت زبان میں لکھا ہوا ہے اور اسی سے متصل نیچے عربی میں لکھا ہوا ہے، اس پر بھی تحقیقات جاری ہیں۔ (آب حیات، کچھ مُنْدرا، ہفت روزہ ۲۲/دسمبر ۶۳، اکابرین گجرات، گجراتی: ۳۰/ ۱۹-۲۳)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے سلسلہ میں مؤرخین نے بہت سی تحقیقات کی ہیں، اور بہتیرے حضرات کو اس راہ میں تکالیف برداشت کرنی پڑی، اس کا اصل سبب یہ معلوم

ہورہا ہے کہ یورپی مؤرخین نے اپنے اغراض ومقاصد کے حصول کے لئے تاریخیں لکھیں ،جس میں سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے بعد مسلمانوں کی آمد ،اور سلطان محمود غوری کی فتحیابی کے بعد ہی مسلمانوں کی دائمی سکونت واقامت کوثابت کرنے کی ناپاک کوششیں کی گئی ہیں، جب کہ تاریخی شواہد سے یورپی مؤرخین کا پیش کردہ تصور غلط ثابت ہوتا ہے، جوان کی شرارت طبع اور بدنیتی کوواضح کرتا ہے۔(دیکھیے :اکابرین گجرات، گجراتی:۳/۲۴)

اب مساجدومزارات کے تاریخی کتبات کی چند شہادتیں پیش خدمت ہے:

(۱) تعمیر مسجد بمقام سومناتھ پٹن (کاٹھیاواڑ) سنہ۶۶۲ھ مطابق:۱۲۶۴ء

(۲) کتبۂ تاریخ وفات تاجر شمس الدولۃ والدین حسن بن محمود بن علی العراقی بمقام سومناتھ پٹن ۶۶۹ھ/ ۱۲۹۹ء

(۳) کتبۂ تاریخ وفات معلم ابن حسن کھنباتی بمقام راندیر۶۳۳ھ مطابق :۱۲۳۶ء

(۴) تاسیس مسجد بمقام جوناگڈھ ۶۸۵ھ مطابق:۱۲۸۶ء

(۵) کتبۂ تاریخ وفات فخرالدین ابراہیم بن عبدالملک بن صدیق شہرزوری ۶۸۱ھ مطابق:۱۲۸۲ء کھنبایت

(۶) کتبۂ تاریخ وفات زین الدین بن سالار ۶۸۵ھ مطابق:۱۲۸۷ء کھنبایت

(۷) کتبۂ تاریخ وفات ملک التجار حاجی ابراہیم بن محمد علی الایبلی المعروف بہ فتولیا،۶۹۰ھ مطابق:۱۲۹۱ء کھنبایت

(۸) کتبۂ تاریخ وفات شمس الدین محمد بن علی بن یحیی الزجری، ۷۰۷ھ، مطابق

:۱۲۰۷ء کھنبایت

(۹) کتبۂ تاریخ وفات مصباح آزاد غلام زین الدین مظفر الملازوری ، ۷۰۹ھ،مطابق:۱۳۰۹ء کھنبایت

(۱۰) کتبۂ تاریخ وفات امین الدین کافور آزاد غلام مرحوم شرف الدین نہدی بن محمد الہمد انی ۷۱۳ھ مطابق:۱۳۱۴ء کھنبایت

(۱۱) تعمیر مساجد از ملک شمس الدین، ۷۱۸ھ مطابق:۱۸۱۳ء مقام دھولکا، ضلع: احمد آباد

(۱۲) کتبۂ تاریخ وفات زین الدین علی بن نجیب الحخوری ۷۳۱ھ مطابق: ۱۳۳۱ء کھنبایت

(۱۳) کتبۂ تاریخ وفات حسن بن ابی بکر علی گر، ۷۳۴ھ مطابق :۱۳۳۳ء کھنبایت

اس کے بعد اس جانب بھی توجہ فرمائیں کہ مشہور صوفی سلاسل میں سے نظامی وسہروردی سلسلہ کے بزرگوں نے پٹن کو بالخصوص مرکز توجہ بنایا، سلطان المشائخ کے تین خلفاء- سید موسی وراق الحسنی الچشتی ،مخدوم سید حسین خنگ سوار اور شیخ حسام الدین عثمانی - پٹن کے بزرگوں میں معروف ہیں، البتہ اولیت کا شرف شیخ حسام الدین کو حاصل ہے جو ۶۹۵ھ میں پٹن آئے اور ۴۱؍برس تک رشد وہدایت کا مرجع بنے رہے، ۱۸؍ذوالقعدۃ الحرام ۷۳۷ھ میں وفات پائی، جب کہ سید حسین ۷۳۰ھ میں پٹن میں آئے اور ۷۹۸ھ میں پیوند خاک ہوئے، پھر اور ایک ولی صفت انسان شیخ جمال الدین اچی ۷۳۰ھ میں پٹن پہنچے، پندرہ

سال تک فیوض وارشادات سے سیراب کرنے کے بعد ۷۴۵ھ میں وفات فرما گئے، حضرت چراغ دہلوی کی بھی پٹن کو خصوصی توجہ حاصل رہی، چنانچہ ان کے قریبی مرید شیخ سراج الدین پٹن ہی میں آرام فرما ہیں۔

۷۴۳ھ میں ابن بطوطہ کھنبایت پہنچا تھا، اس نے وہاں کی مساجد کی تعریف کی ہے اور دو خانقاہوں کا بالخصوص ذکر کیا ہے، ایک حاجی ناصر کی جو عراق کے باشندے تھے اور دوسری خواجہ اسحاق کی جہاں فقیروں کے لئے لنگر تقسیم ہوتا تھا۔

عرب تاجروں کے علاوہ مسلمان سپاہی بھی ہندو سلطنتوں کی افواج میں ملازم تھے، مثلاً سومناتھ کے راجہ کی فوج میں مسلمان افسروں کی ایک تعداد تھی، احمد آباد کے قصباتی حضرات کا کہنا ہے کہ وہ ان خراسانی سپاہیوں کی اولاد میں سے ہیں، جو واگھیلا راجاؤں کی فوج میں ملازم تھے۔

ابھی کچھ عرصہ گذرا تھا کہ حکومت وسلطنت کی خاطر ہونے والی خانہ جنگیوں کی وجہ سے جہاں دیگر علاقے فتنہ وفساد اور بغاوت کی لپیٹ میں آ گئے تھے، وہیں گجرات بھی اس فتنہ سے محفوظ نہ رہ سکا تھا، چنانچہ جب گجرات کے گورنر نے بغاوت کی تو محمد شاہ نے اپنے ایک امیر ظفر خان کو ۷۹۳ھ میں گجرات کی حکومت دے کر روانہ کیا، جس نے سب سے پہلے بغاوت کی آگ بجھائی اور ملک میں ایسا انتظام وبندوبست کیا کہ بہت جلد سکون واطمینان کی فضا قائم ہوگئی، ساتھ ہی ساتھ حدود حکومت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ پھر علماء ومشائخ کی استدعا اور اپنے بڑے بیٹے تاتارخان کے اصرار بلیغ سے ۸۱۰ھ میں اس نے مظفر شاہ لقب

اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، دہلی کے تباہ شدہ خاندانوں کو جو افتاں وخیزاں گجرات پہنچ گئے تھے اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی، علماء ومشائخ کو باطمینان زندگی بسر کرنے اور دل جمعی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے کے سامان کر دیئے اور ۸۱۴ھ میں نیک نامی کے ساتھ سفر آخرت اختیار کیا۔

اسی طرح گجرات میں اور بالخصوص احمد آباد میں سلسلۂ نظامیہ سے زیادہ سلسلہ سہروردیہ نے فروغ پایا، احمد آباد کی تعمیر سے پہلے ہی پٹن کی جانب اس سلسلہ کے اخوان باصفا کا ورود مسعود شروع ہو چکا تھا، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے بھائی سید راجو قتال نے گجرات کو خصوصی توجہ دی، آپ کے کئی مرید مثلاً سید محمد خدا بخش، سید احمد مخدوم جہاں شاہ وغیرہ پٹن ہی میں مدفون ہیں، آپ ہی نے حضرت قطب عالم کو دو سال تک خصوصی تعلیم دے کر اہل گجرات کی تربیت کے لئے روانہ فرمایا، چنانچہ قطب عالم اپنی والدہ محترمہ کی معیت میں پہلے پٹن تشریف لائے اور احمد آباد کی تعمیر مکمل ہو جانے پر سلطان احمد کی درخواست پر احمد آباد منتقل ہو گئے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے موقع نہ ہوگا کہ نیک نیتی کے ساتھ تعمیر کیا گیا یہ شہر احمد آباد بزرگانِ دین کی دعاؤں اور شاہان گجرات کے اقبال کے طفیل جلد ہی عروج کی راہ پر لگ گیا اور بزرگانِ دین، علماء وفضلاء اس کثرت سے وارد ہونے لگے کہ ایک زمانہ میں اسے دہلی پر فضیلت دی جانے لگی۔

لیکن ان تمام ادوار کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ گرچہ دعوتی واصلاحی تعلقات کا اور مسلمانوں کی کثیر آبادی کے وجود کا پتہ چلتا ہے، مگر تجوید وقراءت کی درس وتدریس کے سلسلہ میں ہمارے پاس ان کا کوئی قابل ذکر کارنامہ موجود نہیں ہے، جو کچھ مواد

ہے وہ دور سلطنت کے آغاز کے بعد ہی سے متعلق ہے۔

چوتھا، پانچواں اور چھٹا دور:

حاصل یہ کہ گجرات میں تجوید وقراءت کا سنہرا دور خود مختار سلطنت کے دور ہی سے شروع ہوتا ہے، اکثر قراء حضرات اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، پیر محمد شاہ لائبریری میں ایک کتاب ''شرح شاطبی'' (اندراج نمبر:۱۰۰) کے متعلق لکھا ہے کہ یہ احمد شاہ بادشاہ کے ذاتی کتب خانہ میں رہی ہے، جس سے بانی احمد آباد کی تجوید وقراءت سے دل چسپی کا پتہ چلتا ہے، پھر تو تسلسل سے قراء حضرات کا ذکر آتا ہے، انگریزی دور کے ابتداء میں کچھ کمی ضرور محسوس ہوتی ہے، لیکن پھر راندیر، ڈابھیل اور آزادی کے بعد فلاح دارین ترکیسر کی علمی چہل پہل کے بعد الحمدللہ اس فن کے ساتھ شغف بڑھتا ہی جارہا ہے، ہمارے موجودہ عصر میں تو الحمدللہ کافی ترقی ہوئی ہے۔

محترم قرّاء حضرات! پیر محمد شاہ لائبریری کی دعوت پر اس سے پہلے جو مقالہ تیار کیا تھا، اس میں مجموعی طور پر ۵۴ر قراء حضرات کا تذکرہ تھا، جن میں سے بعض کے حالات مفصل تو بعض کے مختصر ذکر کئے گئے تھے اور اب اس نئے مقالہ میں مزید کچھ قراء حضرات کا اضافہ کیا گیا ہے، جب کہ بعض کے متعلق ''نزہۃ الخواطر'' اور دیگر معتبر کتب سے مزید وضاحت شامل کی گئی ہے، اس موقع سے یہ بات ذکر کروں تو بے محل نہ ہوگا کہ اس مقالہ میں تاریخ گجرات کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کا عمل ایک استقرائی عمل ہے، جو درحقیقت سنگ بنیاد کی حیثیت سے نصب کیا گیا ہے، تاکہ اس سلسلہ میں مزید کاوشیں کرنے والوں کو زیادہ آبلہ پائی نہ کرنا پڑے، اسی طرح قراء کرام کے ناموں میں اور ان کے حالات کو جمع کرنے

میں حد درجہ بحث وتفحص کے بعد بھی یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اس گلستان لالہ زار کی چند کلیاں ہی اپنے دامن میں سمیٹی ہیں، لیکن اس سے نہ ہی ہماری چند کلیوں پر قناعت ثابت ہوسکتی ہے اور نہ ہی ہم اپنے دامن کے تنگ ہونے کا خیال رکھتے ہیں۔

دوسری حقیقت جس کی جانب اشارہ کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے وہ یہ کہ اس بات میں دورائے نہیں ہے کہ خطۂ گجرات میں فن حدیث شریف کی خدمت جلیلہ کو جو اولیت حاصل ہوئی ہے، علم تجوید وقراءت میں وہ حاصل نہ ہوسکی، علم قراءت میں پنجاب، دہلی اور دکن کے بعد گجرات کا نمبر ہے، کتب تاریخ میں قراء اور مجودین اور ان کے مدارس کا ذکر بہت مجمل طور پر ملتا ہے، جب کہ سلطنت کے دور میں ۲۹/مدارس اور ۳۷/کتب خانوں کا ذکر ملتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فن مدارس ومکاتب اور مساجد میں حفظ وناظرہ کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا اور مسلمان اس کی تعلیم کو اولین فریضہ تصور کرتے تھے، لہذا اس کی تشہیر کو بھی کم اہمیت دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے نصاب تعلیم میں بھی اس کا ذکر مختصراً موجود ہے، البتہ اس کا پتہ ضرور ملتا ہے کہ مکاتب ومدارس اور انفرادی مراکز میں قرآن مجید پڑھانے والے اساتذہ کے لئے ''مقری'' اور '' قرآن خواں'' کی اصطلاح مستعمل تھی، ان ہی میں سے کچھ قراء اور ان کے مدارس قرآنیہ کو تاریخ نے ضبط کیا ہے، جن میں سے بعض کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

(۱) شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت: آپ کا نام سید جلال الدین حسین بن مخدوم جہانیاں جہاں گشت تھا، حضرت سید احمد کبیر کے بڑے بیٹے اور حضرت سید جلال سرخ کے پوتے تھے، شعبان المعظم کی ۱۴/تاریخ کو ۷۰۷ھ میں ''اوچ'' میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم

والد و چچا سے حاصل کی، فقہ واصول فقہ شیخ بہاء الدین اوچی سے پڑھی، حصول علم کے لئے ملتان بھی جانا ہوا جہاں ایک سال قیام فرمایا، ''درمنظوم'' میں ہے کہ آپ قراءت سبعہ کے قاری تھے، حصول علم کا مزید شوق آپ کو حجاز مقدس لے گیا، جہاں تصوف وحدیث کا درس لیا، ایک مرتبہ مسجد نبوی علی صاحبہ الف صلاۃ وسلام میں امامت کا شرف بھی حاصل ہوا، ۱۳۰/ سے زیادہ شیوخ سے استفادہ کیا اور خرقۂ خلافت واجازت حاصل کی، سلطان محمد تغلق نے ۴۰/ خانقاہیں آپ کے ذمہ کی تھیں، ''ثمرات القدس'' کی روایت کے مطابق مریدین کی تعداد پونے دولاکھ کے قریب تھی، آپ کی وفات حسرت آیات ۱۰/ ذوالحجۃ الحرام ۷۸۵ھ میں ہوئی، آپ کی خانقاہ اوچ بخاری کے شمال مغربی گوشے میں واقع ہے۔

(مشائخ احمد آباد: ص: ۱۰۰-۱۰۸)

(۲) شیخ عبداللطیف: آپ احمد آباد کے باشندے تھے، ظاہری و باطنی علوم میں کمال حاصل تھا، زہد وقناعت کے دل دادہ تھے، آپ قراءت وتجوید کے بہت اچھے استاذ تھے، سید جعفر شیرازی نے آپ سے سبعہ قراءت سیکھ کر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، آپ کا مزار پٹن میں ہے، ماہ رمضان المبارک کی چار تاریخ کو ۸۸۵ھ میں ''بٹوہ'' احمد آباد میں آپ کی وفات ہوئی۔ (مشائخ احمد آباد: ص: ۲۵۴، نزہۃ الخواطر: ۳/۷۱)

(۳) شیخ سید زاہد بن قطب عالم بخاری: ماہ رجب المرجب کی نو تاریخ کو ۸۴۸ھ میں شہر احمد آباد میں آپ کی ولادت ہوئی، بچپن ہی میں حفظ قرآن پاک کی سعادت حاصل کی اور ۲۰/ سال کی عمر میں تجوید، فقہ وحدیث اور جملہ علوم وفنون کی تحصیل سے فارغ ہوئے، آپ نہایت خوش الحان قاری بھی تھے، شعبان المعظم کی چھ تاریخ کو ۸۹۲ھ میں ''بٹوہ''

احمد آباد میں آپ کی وفات ہوئی۔ (مشائخ احمد آباد: ص: ۲۵۸-۲۶۰)

(۴) قاضی علم الدین شاطبی: آپ کا نام قاضی علم الدین بن عین الدین بن نجم الدین الصدیقی الشاطبی الگجراتی ہے، تجوید وقراءت اور فقہ وعربیت کے نامور علماء میں سے ایک ہیں، آپ کی وفات ۲۰ رمضان المبارک ۸۶۰ھ کو پیر کے روز ہوئی، وقت وفات آپ کی عمر ۸۸ سال کی تھی۔

(۵) شیخ ابراہیم برہان پوری: آپ اصلاً احمد آباد کے رہنے والے تھے، قراءت وتجوید کے ماہر تھے، احمد آباد میں بھی اور پھر وہاں سے برہان پور جانے کے بعد اپنے درس کو جاری رکھا، ۹۰۱ھ میں وفات پائی۔ (تاریخ احمد آباد: ص: ۳۴ بحوالہ تذکرۂ قاریان ہند)

(۶) شیخ محمود بن محمد گجراتی: صاحب نزہۃ نے آپ کے قاری ہونے کی وضاحت کی ہے، چنانچہ آپ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: ''الشیخ الفاضل محمود بن محمد المقرئ الحنفی الگجراتی ، أحد العلماء المشهورین فی عصره....''

آپ مشہور عالم دین راجح بن داود کے استاذ ہیں، علامہ سخاوی نے بھی راجح بن داود کے حالات میں آپ کا تذکرہ کیا ہے، تاریخ وفات تو پتہ نہ چل سکی، البتہ راجح بن داود کی وفات ۹۰۴ھ میں ہوئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی وفات بھی اسی زمانہ میں ہوئی ہوگی، واللہ اعلم بالصواب۔ (نزہۃ: ۳/ ۱۲۷ ابرقم: ۲۱۹)

(۷) شیخ مودود گجراتی: آپ قاضی علم الدین کے فرزند ہیں اور اپنے والد ہی کی طرح علم قراءت وتجوید میں مہارت ولیاقت تامہ رکھتے تھے، علماء کرام کی ایک بڑی جماعت آپ سے استفادہ کرتی تھی، ۸۵ سال کی عمر میں ۹۱۳ھ میں ''پٹن'' میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں

مدفون ہوئے۔(نزہۃ:۴/ ۳۲۸،۳۲۹برقم:۵۳۸)

(۸) شیخ احمد بن جعفر گجراتی: صاحب نزہۃ الخواطر آپ کے متعلق لکھتے ہیں: ”الشیخ العالم المجود أحمد بن جعفر بن محمود الحسینی السندی الگجراتی،أحدالعلماء البارزین فی القراء ة والتجوید وسائر العلوم“ کہ آپ دیگر علوم اسلامیہ کے علاوہ علم قراءت وتجوید میں بھی مشہور تھے، ۸۷۰ھ میں گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی، ماہ صفر المظفر کی ۱۶/تاریخ کو پیر کے دن ۹۴۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔(نزہۃ:۴/ ۱۷-۱۸ابرقم:۳۷،مشائخ احمد آباد،ص:۹۳-۹۷)

(۹) شاہ فضل اللہ کاشانی: تاریخ احمد آباد میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں موجود ہے:”.....قرآن کریم سے آپ کو خصوصی شغف تھا، تجوید کی تعلیم پر خصوصی اہتمام فرماتے تھے..... پندرہ جمادی الاولی ۹۴۶ھ میں آپ کی روح پرفتوح قفس عنصری سے علیین کی طرف کوچ فرما ہوئی اور سابرمتی کے کنارے آپ کی قبر بنائی گئی“۔(مشائخ احمد آباد:ص:۹۷، بحوالہ اکابرین گجرات،ص:۹۵۴)

(۱۰) علامہ محدث حضرت مولانا طاہر پٹنی: آپ ۹۱۳ھ میں پٹن میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن کریم سے کم عمری ہی میں فارغ ہوگئے، ۹۴۴ھ میں حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج بیت اللہ وزیارت روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہوئے، ۹۸۶ھ میں شہر اجین کے قریب سارنگ پور (موضع سوہی) میں آپ نے جام شہادت نوش فرمایا اور وہاں سے آپ کا جسدِ خاکی پٹن لایا گیا، پٹن ہی میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔(تذکرۂ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنیؒ:ص/۱۰۶)

(۱۱) شیخ ابراہیم قاری شطاری سندھی: آپ کا آبائی وطن تو سندھ ہے، لیکن ایک مدت دراز تک آپ شہر احمد آباد میں اپنے فیوض پھیلاتے رہے، تجوید پر آپ کو کافی عبور تھا، دل گداز آواز سے قرآن مجید پڑھتے تھے، حضرت مسیح الاولیاء اور آپ کے پیر شیخ لشکر علم قراءت میں آپ کے شاگرد تھے، برہان پور کے بادشاہ میران محمد شاہ فاروقی نے آپ سے درخواست کی کہ میری مستورات قراءت وتعلیم قرآن کی خواہش مند ہیں، لیکن آپ نے معذرت فرمادی، آپ کی وفات ۹۹۱ھ میں ہوئی اور شیخ ابراہیم بن عمر رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کے متصل عادل پور، برہان پور میں مدفون ہوئے۔ (مشائخ احمد آباد: ص:۱۸۹،۱۹۰)

(۱۲) شیخ محمد بن احمد الفاکہی: آپ کا پورا نام محمد بن احمد بن علی الحنبلی الفاکہی المکی ابوالسعادات الگجراتی تھا، ۹۲۳ھ میں پیدا ہوئے اور تمام علوم اسلامیہ میں مہارت پیدا کی، شاطبیہ زبانی یاد تھی، کلام پاک کے بھی حافظ تھے اور تجوید کے ساتھ قرآن کریم قراءت سبعہ میں پڑھا کرتے تھے، شہر احمد آباد میں جمعہ کے روز ماہ جمادی الاولیٰ ۹۹۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ (نزہۃ: ۴/۲۵۲-۲۵۴، مشائخ احمد آباد: ص:۲۱۱-۲۱۴)

(۱۳) شیخ محمد بن فضل برہان پوری: شاہ محمد بن خواجہ فضل اللہ بن خواجہ صدرالدین بن خواجہ حسین جونپوری ثم برہان پوری، آپ کا نسب نامہ اوپر جاکر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، آپ کے آباء واجداد جونپور سے ہجرت کرکے گجرات چلے آئے تھے، شیخ محمد بن فضل اللہ ۹۵۱ھ کے آس پاس شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے، عنفوان شباب میں شیخ صفی الدین گجراتی سے منسلک ہوکر خرقۂ اجازت حاصل کی اور مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، وہاں سے لوٹ کر احمد آباد میں قیام کیا، بارہ سال شیخ وجیہ الدین کی

خدمت میں رہ کر اکتساب فیض کیا، اور دیگر شیوخ سے بھی فیوض حاصل کرنے کے بعد برہان پور لوٹ گئے، آپ کا محیر العقول کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے ''شیخو پورہ'' نام سے ایک محلّہ آباد کیا ،جس میں حفاظ کرام کے تین سو گھر تھے، آپ کے عہد میں شیخو پورہ سے بعد نماز فجر تلاوت قرآن کریم کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، ۸۶/سال کی عمر پائی، صاحب سفینۃ الاولیاء کے مطابق آپ کی وفات ۲/رمضان المبارک بروز پیر ۱۰۲۵ھ کو ہوئی جب کہ ''رود کوثر'' کے مؤلف نے آپ کا سال وفات ۱۰۲۹ھ لکھا ہے، صاحب نزہۃ نے تاریخ وفات ۲/رمضان ۱۰۲۹ھ نقل کی ہے۔ (مشائخ احمد آباد: ص: ۳۰۶، ۳۱۳، نزہۃ: ۵/۳۶۳)

(۱۴) شیخ احمد بن بدرالدین المصری: شہاب الدین احمد بن بدرالدین العباسی الشافعی المصری ثم الہندی الگجراتی، عبدالقادر حضرمی نے النور السافر میں لکھا ہے کہ ۹۰۳ھ میں مصر میں آپ کی ولادت ہوئی، اپنے زمانہ کے کبار علماء سے علوم حاصل کیے، دسیوں کتابیں زبانی یاد تھیں جن میں ایک شاطبیہ بھی ہے، جمعہ کی رات میں ۹۹۲ھ کو احمد آباد میں آپ کا وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے، صاحب نزہۃ کے قول کے مطابق آپ کی وفات ماہ رمضان المبارک میں ہوئی، جب کہ عبدالقادر حضرمی نے النور السافر میں ماہ صفر المظفر ذکر کیا ہے۔ (نزہۃ: ۴/۱۶، ۱۷، رقم: ۳۶، مشائخ احمد آباد: ص: ۲۱۵-۲۱۹)

(۱۵) شیخ مبارک ناگوری: شیخ مبارک بن شیخ خضر ناگوری نام تھا، قریشی النسل تھے، دسویں صدی ہجری میں آپ کے والد ہندوستان آئے اور ناگور میں اقامت اختیار کی، جہاں ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک کی ولادت ہوئی، چودہ سال کی عمر تک آپ تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تھے، اپنی عمر کا ایک معتد بہ حصہ آپ نے احمد آباد میں گذارا اور پھر ۹۵۰ھ میں آگرہ

پہنچے، ملابدایوں آپ کے متعلق لکھتے ہیں کہ شاطبیہ آپ کو زبانی یاد تھی، نیز قرآن شریف دس قراءت کے ساتھ یاد تھا، آپ کا وصال ۱۷/ذوالقعدۃ الحرام ۱۰۰۹ھ کو ہوا اور آگرہ ہی میں مدفون ہوئے۔ (مشائخ احمد آباد: ص:۲۷۴، ۲۷۵)

(۱۶) شیخ محمد بن الحسن المندوی: محمد بن الحسن بن موسی الگجراتی ثم المندوی، ۱۱/رجب المرجب ۹۶۲ھ کو ''مندو'' میں آپ کی ولادت ہوئی، فارسی کے ابتدائی رسائل اور قرآن پاک کی قواعد تجوید کی رعایت کے ساتھ مکمل تعلیم شیخ کمال الدین القرشی سے حاصل کی، گیارہ سال کی عمر میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا، سترہ سال کی عمر میں والدہ نے نکاح کروایا، بعد نکاح بھی حصول علم میں مشغول رہے، آگرہ کا سفر کرکے وہاں بھی علم حاصل کیا، پھر ۹۹۰ھ میں گجرات لوٹے اور مدرسۂ شیخ وجیہ الدین علوی میں کتب درسیہ پڑھی، اور پھر ۹۹۴ھ میں واپس مندو لوٹ گئے، ۱۰۲۲ھ تک آپ حیات رہے، تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی۔ (نزہۃ: ۵/ ۳۴۹، ۳۵۰، برقم: ۵۶۴)

(۱۷) شیخ سید جعفر مجید عالم: فقہ وتصوف کے مشہور عالم سید جلال حمید عالم کے فرزند ہیں، آپ کی ولادت احمد آباد میں ماہ ربیع الثانی ۱۰۸۱ھ میں ہوئی، عمر کے نویں سال ہی میں مکمل قرآن مجید تجوید کے ساتھ حاصل کر چکے تھے، اپنے والد ماجد سے علوم حاصل کئے اور درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے، آپ کی وفات ماہ محرم الحرام ۱۱۰۹ھ میں ہوئی اور احمد آباد میں سپرد خاک کیے گئے۔ (مشائخ احمد آباد، ص:۱۸۳)

(۱۸) شیخ احمد بن ابی بکر: شیخ احمد بن ابی بکر المعروف بابن الشلی الیمنی، آپ کی ولادت ''تریم'' میں ۱۰۱۹ھ میں ہوئی، آپ نے وہیں شیخ محمد باعیشہ کی زیرنگرانی قرآن پاک

حفظ کیااور تجوید بھی ان ہی سے پڑھی، المقدمۃ الجزریہ بھی زبانی یادتھی، علم کے شوق نے آپ کو ہندوستان پہنچایا تھا، جہاں آپ نے شیخ ابن عبداللہ عیدروس اور سید عمر بن عبداللہ باشیبان وغیرہ سے استفادہ کیا، پھر واپس اپنے وطن لوٹے، آپ کا انتقال اپنے وطن ہی میں ۱۰۵۷ھ میں ہوااور زنبل کے مقبرہ میں دفن کیئے گیئے۔ (مشائخ احمد آباد،ص:۳۵۸-۳۶۰)

(۱۹) قاضی عبدالرسول الگجراتی: آپ کا پورا نام یوں ہے: عبدالرسول بن ابی محمد بن عبدالوارث بن ابی محمد بن عبدالملک بن اسماعیل بن شہاب الدین بن حسام الدین العثمانی الکپرپنجی الگجراتی، شہر احمد آباد کی مغربی سمت میں کچھ فاصلہ سے واقع ''کپر پنج'' نامی علاقہ میں آپ کی ولادت ہوئی، جہاں ابتدائی علوم کے ساتھ آپ نے علم قراءت وتجوید شیخ فرید الدین سے حاصل کیا، پھر آپ دہلی تشریف لے گئے، جہاں سے آپ کو''دھولقہ'' کا قاضی بنا کر بھیجا گیا، پانچ سال آپ نے اپنی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دی اور پھر اس سے سبک دوشی اختیار کر لی، ۱۹رشوال المکرّم ۱۱۳۰ھ کو پیر کی شب آپ راہی ملک عدم ہوئے۔ (نزہۃ :۶/ ۱۴۸، ۱۴۹ ابرقم: ۲۷۲، مشائخ احمد آباد:ص:۴۳۰)

(۲۰) مولانا غلام برہان پوری: علامہ غلام محمد الحنفی الگجراتی ثم البرہان پوری، آپ فرقۂ بوہرہ سے تعلق رکھتے تھے، شہر آحمد آباد میں ولادت ہوئی، اور ابتدائی علوم وہیں حاصل کیئے، وہاں سے حصول علم کے لئے لکھنؤ اور لکھنؤ سے دہلی کا سفر کیا، جہاں شیخ انور گوپاموی آپ کو اپنے ساتھ برہان پور لے گئے اور آپ کے لئے مدرسہ بنوایا، ایک عرصہ تک آپ اسی مدرسہ میں علوم وفیوض کے ذریعہ فائدہ پہونچاتے رہے، حاجی رفیع الدین مرادآبادی اپنی کتاب''اخبار الحرمین الشریفین''میں آپ سے متعلق لکھتے ہیں:''انـه كان علما مفرداً في

التجويد القراءة ، متبحرا فی العلوم و الفنون ’’ کہ دیگر علوم وفنون کے ساتھ آپ علم تجوید وقراءت میں یکتائے روزگار تھے، آپ کی وفات ۱۱۴۹ھ میں ہوئی۔ (نزہۃ: ٦/ ۲۰۹ برقم: ۳۹۴، مشائخ احمد آباد، ص: ۴۴۱ - ۴۴۲)

(۲۱) مولانا محمد صالح الگجراتی: محمد صالح بن نورالدین الأحمد آبادی الگجراتی، احمد آباد میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو ونما پائی، قرآن پاک قراءت سبعہ متواترہ کے ساتھ یاد فرمایا، اور دیگر علوم اپنے والد ہی سے حاصل کیے، اپنے والد کی زندگی ہی میں آپ کی وفات ہوئی، چنانچہ ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۷ھ کو دہلی میں آپ کا وصال ہوا، وہاں سے آپ کا جسد خاکی احمد آباد منتقل کیا گیا اور آپ کے دادا ملا محمود کے باڑے میں دفن کیے گئے۔ (نزہۃ: ٦/ ۳۲۸ برقم: ۶۰۶، مشائخ احمد آباد: ص: ۴۴۱)

(۲۲) شیخ احمد بن عبدالجلیل سورتی: احمد بن عبدالجلیل الحسینی البخاری السورتی، سورت میں ولادت ہوئی اور وہیں پلے بڑھے، آپ نے تجوید وقراءت کی رعایت کے ساتھ مکمل قرآن پاک کو حفظ فرمایا تھا، ماہ صفر المظفر کی ۲/ تاریخ کو ۱۲۴۷ھ میں سورت ہی میں آپ کا انتقال ہوا۔ (نزہۃ: ۷/ ۳۱، ۳۲ برقم: ۴۶)

(۲۳) شیخ اسماعیل السورتی: اسماعیل بن ابی اسماعیل السورتی الگجراتی، گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی علوم حاصل کیے، حافظ عبدالرحمٰن القاری السورتی سے مکمل قرآن مع تجوید پڑھا، ۲۵/ شوال المکرّم ۱۲۸۷ھ کو سورت میں آپ کا وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ: ۷/ ۷۹، ۸۰ برقم: ۱۰۲)

(۲۴) شیخ رحمۃ اللہ لاجپوری سورتی: فقہ وعربیت اور اصول کے ماہر علماء میں سے

ایک تھے، قرآن پاک کی قراءت سبعہ متواترہ میں تلاوت فرماتے تھے اوراس دور میں قراء ت میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا، حرمین شریفین کی زیارت بابرکت سے لوٹ کر سورت میں ایک لمبی مدت تک درس وتدریس سے وابستہ رہے، پھر دوبارہ سفر حجاز پر نکلے اور دوسری مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کا لطف اٹھایا، ہندوستان کے لئے واپسی کے سفر کے دوران آپ کی کشتی غرقاب ہوگئی، یہ واقعہ ۱۲۶۴ھ میں پیش آیا تھا۔ (نزہۃ: ۷/ ۲۱۱ برقم: ۳۰۷)

(۲۵) شیخ اسماعیل راندیری: اسماعیل بن حافظ محمد بن حافظ صالح الحنفی الراندیری، راندیر میں پیدا ہوئے اور بنیادی علوم وہیں حاصل کئے، پھر بھوپال کا سفر کیا اور تمام درسی کتب مولوی بدیع الزماں لکھنوی اور دیگر علماء کے پاس پڑھی، صحاح وسنن شیخ حسین بن محسن السبعی الانصاری سے پڑھی اور طویل مدت تک آپ ہی کی خدمت میں رہے، پھر حجاز مقدس کا سفر کیا اور حرمین شریفین کی زیارت کے بعد شیخ محمد الدمیاطی سے قراءت وتجوید کا علم حاصل کیا، وہاں سے راندیر لوٹے اور جامع مسجد کی خطابت کے منصب پر فائز کیے گئے، آپ کی وفات ۱۷ / ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کو راندیر ہی میں ہوئی۔ (نزہۃ: ۷/ ۵۴، ۵۵ برقم: ۵۲)

(۲۶) مولانا سید تجمل حسین مشہدی بھروچی رحمۃ اللہ علیہ: آپ کے مفصل حالات تو نہ مل سکے، البتہ آپ کی ایک کتاب ہے ''تجوید مشہدی'' جس میں فن تجوید کو سوال وجواب کے طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، اس کی ابتداء میں مختصر حالات اوران کے اقوال درج ہے، یہ کتاب مولانا حکیم سید عبدالحی کفلیتویؒ کے ادارہ سے چھپی تھی، اسی سے یہ نقل پیش خدمت ہے۔

مشہدی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جن لوگوں میں جذبۂ علم وعمل ہے ان حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے، میرے پیرومرشد مولانا شاہ عبدالکریم مرادآبادی اور قطب

وقت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج صدیقی مرادآبادی کے ایماء واجازت سے یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، اس کے بعد میرے کچھ مربیوں کے کہنے پر افریقہ جانے کا خیال ہوا، اور ۱۳۲۴ھ میں گھر سے اس سفر کے لئے نکلا، اس وقت سے ۱۳۴۶ھ کے درمیانی عرصہ میں مختلف فنون میں ۵/ رسائل تصنیف کئے، اس کے بعد چھٹا رسالہ فن تجوید میں لکھا۔

مزید وضاحت: ربیع الاول وربیع الثانی ۱۳۳۴ھ میں بحری سفر کر کے ایک چھوٹے سے جزیرے پیری زن آئلینڈ (Perijan Iseland) پہنچے، اور وہاں ''تعلیم المتعلمین '' کی اردو شرح مع اضافات مفیدہ وترجمہ شروع کیا۔ (لیکن رسالۂ تجوید کی طباعت کے وقت مذکور شرح نامکمل تھی اور اس کے بعد علم بھی نہ ہو سکا کہ یہ کتاب اتمام پذیر ہوئی یا نامکمل ہے)

اس کے بعد مجھے بر بنائے مجبوری ۳ ماہ ''دَالْ گُبّا''(Dal Gubba) میں رہنا پڑا جہاں بیماری میں مبتلا ہوا تو اس سے صحت یابی کے لئے اور مستقبل میں خدمات دینیہ جلیلہ کی توفیق ملے، اس غرض سے ''قصیدۂ نعمان'' لکھا جو فارسی زبان میں اشعار پر مشتمل ہے، اس کا تاریخی نام ''شربتِ رُمّان مطلوب جان'' رکھا۔

بعدہ بقضاء وقدرت الٰہی بندہ ڈربن (ناٹال) پہنچا جہاں طفلانِ مکتب کو تعلیم دینا شروع کیا، اسی وقت دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان چھوٹے بچوں کی سہولت کے خاطر ایک رسالہ لکھوں جس میں روزانہ پیش آنے والے ضروری مسائل سوال وجواب کے انداز میں جمع ہو جائیں تا کہ بچوں کو یاد کرنے میں آسانی رہے، لہذا ''سوال وجواب مشہدی برائے مطالعۂ اولاد مبتدی'' تحریر کیا۔

پھر ۱۳۳۵ھ کے اواخر یا ۱۳۳۶ھ کے اوائل میں ایک مشقی کاپی تیار کی جس میں الفاظ

صاف اور صحیح لکھے جاسکیں، اس کا نام ''مشق ابجدی از نسق مشہدی'' رکھ دیا۔

اس کے بعد چھوٹے بچوں کو ''طہارت وصلوۃ'' کے مسائل یاد کروانے کے لئے ایک رسالہ لکھا کہ اچانک خیال ہوا کہ چھوٹی چھوٹی مسنون دعائیں بھی یاد کروائی جائیں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے روزانہ پڑھی جانے والی ضروری دعائیں جمع کر کے ایک رسالہ لکھ دیا جس کا نام ''تہذیب احمدی از ترتیب مشہدی'' رکھا گیا، اور تاریخی نام ''التجاء فیض'' ہے جس کے اعداد سے سن ہجری کا علم ہوتا ہے۔

مولانا مشہدی خود شاعر بھی تھے، فارسی واردو اور عربی زبان میں اشعار آپ کی کتاب ''تجوید مشہدی'' میں شامل ہیں، اسی طرح کسی آدمی کی وفات پر بھی تاریخی اشعار اور نظمیں لکھتے تھے، اس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ آپ کس قدر بلند پایہ کے عالم تھے۔ (اکابرین گجرات، گجراتی:۴/ ۲۰۷،۲۰۸)

ان حضرات کے علاوہ بہت سے حضرات وہ ہیں، جن کا مختصر تذکرہ سابقہ مقالہ میں کیا جاچکا ہے، ان کے نام یہ ہیں:

(۱) سید ناصر الدین محمود (م: ۸۰۰ھ) یہ شیخ جلال الدین مخدوم جہانیاں جہانگشت کے فرزند تھے۔

(۲) سید برہان الدین قطب عالم، آپ سید ناصر الدین کے فرزند تھے۔

(۳) شیخ جیو اور (۴) شیخ شاہ عالم (م: ۸۸۰ھ) یہ دونوں قطب عالم کے فرزند تھے۔

(۵) مظفر شاہ خلیل خان، یہ سلطان محمود بیگڑہ کا فرزند تھا۔

(۶) سید شاہ بخاری (م:۸۹۳ھ) یہ شاہ عالم کے خلیفہ تھے۔

(۷) شیخ ابن عبداللہ العیدروس حضرمی (م:۹۹۰ھ)

(۸) شیخ عبدالقادر حضرمی (م:۱۰۳۸ھ)

(۹) سید جعفر بن علی العیدروسی (م:۱۰۶۴ھ)

(۱۰) قاری نورالدین محمد بن علی الحضرمی (۱۰۶۸ھ)

(۱۱) حاجی شیخ کرمانی بھروچی

(۱۲) قاری شیخ معزالدین سلیمان بن شیخ علاء الدین گنج رواں (م:۱۴ےھ)

(۱۳) المقری عزیز اللہ چشتی

(۱۴) شیخ راجح بن داود گجراتی

(۱۵) قاری صدر جہاں احمد آبادی

(۱۶) قاری مخدوم کمال الدین قزوینی (م:۸۸۹ھ)

(۱۷) قاری شیخ کبیر منتھنا پوری

(۱۸) قاری شیخ رحمۃ اللہ چشتی، آپ شیخ عزیز اللہ چشتی کے فرزند ہیں، سلطان محمود آپ کا بڑا معتقد تھا۔

(۱۹) شیخ سعداللہ چشتی، آپ بھی شیخ عزیز اللہ کے فرزند تھے۔

(۲۰) شیخ رفیع اللہ، آپ بھی شیخ سعداللہ کے فرزند تھے۔

(۲۱) حافظ و قاری شیخ حسن بن موسی احمد آبادی (م:۹۶۲ھ)

(۲۲) قاری ابو محمد المعروف بہ ابو جیوا سیر گڑھی (م:۹۹۳ھ)

(۲۳) حافظ وقاری شیخ احمد جانپانیری: آپ شیخ محمود (ساکن مانڈو) کے بڑے بھائی تھے، ۹۸۸ھ میں وفات ہوئی۔

(۲۴) شیخ عبدالمعطی مکی ثم احمد آبادی: آپ شیخ الاسلام زکریا الانصاری جیسے مشہور قاری ومقری کے شاگرد تھے، ۹۸۹ھ میں وفات پائی۔

(۲۵) قاری رفیع الدین بن جلال الدین شیرازی (م: ۹۸۹ھ)

(۲۶) علامہ وجیہ الدین علوی: آپ نے احمد آباد میں ایک مدرسہ قائم فرمایا، جس میں ۶۵ رسال تک تدریس سے منسلک رہے۔

(۲۷) قاری حیدر علوی: آپ علامہ وجیہ الدین کے فرزند تھے۔

(۲۸) حافظ وقاری حاجی ضیاء اللہ شطاری اکبر آبادی: آپ شیخ وجیہ الدین کے شاگرد رشید تھے۔

(۲۹) حافظ وقاری مفتی کمال محمد العباسی: بادشاہ جہانگیر کے عہد میں آپ احمد آباد میں قیام پذیر تھے۔

(۳۰) قاری صبغۃ اللہ بھروچی: آپ سید کمال الدین قزوینی کے نواسے تھے، ۱۰۱۵ھ میں مدینۃ المنورہ میں وفات پائی۔

(۳۱) حافظ وقاری شاہ محمد فضل اللہ نائب رسول

(۳۲) قاری عبدالحلیم شاہ داتار بھنڈاری

(۳۳) قاری علی متقی (دوم)

(۳۴) شیخ مقری محمد اعظم چشتی نظامی: آپ شیخ حسن محمد چشتی کے فرزند تھے،

۴۲رکتابیں تصنیف فرمائی۔

(۳۵)سید شاہ محمود قادری بالا پوری: آپ شاہ عبدالحلیم بھنڈاری کے فرزند ہیں۔

(۳۶) قاری مولانا محمد اسحاق بھروچی: مغل بادشاہ شاہجہاں کے عہد میں بھروچ میں موجود تھے،۱۰۷۲ھ میں وفات پائی۔

(۳۷) قاری مولانا محمد بن اسحاق بھروچی: آپ قاری اسحاق کے فرزنداور شاگرد تھے۔

(۳۸)مولانا قاری شاہ سلیمان کردی: آپ محدث دہلوی شاہ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، دہلی سے احمد آباد آئے تھے۔

(۳۹) قاری سید جلال الدین حمید عالم : آپ ابوالمجد محبوب عالم کے فرزند ہیں، ۱۱۱۴ھ میں وفات پائی۔

(۴۰) بہادرشاہ: محمد معظم شاہ عالم ، بہادرشاہ کے لقب سے تخت نشین ہوئے تھے، حافظ وقاری تھے۔

(۴۱) حافظ وقاری مولانا احمد بن سلیمان احمد آبادی : آپ شاہ سلیمان کردی کے فرزند تھے۔

(۴۲) مخدوم العالم مولانا شیخ نورالدین احمد آبادی:۱۰۶۳ھ میں احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔

(۴۳) قاری وقاضی حافظ محمد نظام الدین : آپ شیخ نورالدین کے فرزند ہیں، ۱۱۶۵ھ میں انتقال ہوا۔

(۴۴) حافظ وقاری عبدالرحمٰن سورتی: ۱۱۸۰ھ میں ولادت اور ۱۲۴۵ھ میں وفات ہوئی۔

(۴۵) قاری شیخ رکن الدین احمد ثانی گجراتی: ۱۱۴۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۸ھ میں وفات پائی۔

(۴۶) قاری محمد سلیمان سورتی: قاری عبدالرحمٰن مکی سے الہ آباد جا کر علوم حاصل کیئے، بارڈولی میں رہے تھے۔

(۴۷) پیرزادہ سید محمد زین الدین احمد آبادی: ۱۳۳۱ھ میں پیدا ہوئے، مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ سے تجوید کی سند لی، قاری عبدالرحمٰن مکی سے، نیز راندیر میں قاری عطاء اللہ سندھی سے استفادہ کیا۔

(۴۸) حافظ وقاری مولوی انوار الحق فاروقی: ۱۹۰۳ء میں لکھنؤ میں ولادت ہوئی، قاری ضیاء الدین سے تجوید وقراءت سیکھی، پھر محمد صدیق میمن سے قراءت حفص وقراءت سبعہ کی سند حاصل کی، علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں ڈابھیل میں شیخ التجوید کے عہدہ پر فائز تھے۔

(۴۹) الحاج قاری ومولانا محمد شاکر صاحب: بڑودہ کے متوطن ہیں، ۱۳۰۷ھ میں ولادت ہوئی، دار العلوم حیدر آباد اور ندوۃ العلماء سے علوم حاصل کیئے، ندوہ میں ہی تجوید سیکھتے رہے، پھر قاری سید ابراہیم وقاری محمد حسین سے مزید استفادہ کیا۔

پھر جیسا کہ گذشتہ سطروں میں ذکر ہوا کہ انگریزی دور کی ابتداء میں خطۂ گجرات میں علم قراءت وتجوید کی خدمات کچھ ماند پڑگئی تھیں، لیکن خدمت دین کی غرض سے اور دفاع عن

الدین کے لئے قائم کیے گئے دینی مدارس میں سے جامعہ ڈابھیل، جامعہ راندیر اور بعد آزادی جامعہ دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر وغیرہ نے اس فن کو معراج پر پہونچانے میں خصوصی کردار ادا کیا، ان کے علاوہ دیگر جامعات و مدارس کے قراء حضرات و منتظمین صاحبان بھی قابل قدر ہیں جنہوں نے اس فن کی خدمات کے لئے اپنے شب و روز قربان کر دیئے اور اپنی اعلی صلاحیتوں کو اس عظیم فن کی نشأۃ ثانیہ کے لئے نچھاور کر دیا، ان ہی بے لوث خادموں کی محنتوں کا ثمرہ ہے جو آج ہم ان مدارس و جامعات میں دیکھ رہے ہیں۔

بارگاہ رب العزت میں عاجزانہ التماس ہے کہ سلف صالحین کی قبروں کو بقعۂ نور بنائے اور ہماری محنتوں کو دوام و بقاء بخش کر اس سے نسلوں کو مستفید ہونے کے مواقع میسر فرمائے ، اور ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عظیم قاریٔ قرآن اور نافع و حفص، بصری و کوفی، شامی و کسائی جیسے خدام قرآن کے زمرہ میں ہمارا حشر فرمائے، آمین یارب العالمین!

من نہ کردم صرف کردم روزگار
من نماند ایں بماند یادگار

❖❖❖

رسم عثمانی اور مصاحف عثمانیہ

تعارف و تاریخ، اہمیت اور تصانیف

جمادی الاول ۱۴۳۳ھ مطابق اپریل ۲۰۱۲ء جامعۃ القراءات کفلیتہ میں ''گجرات میں تجوید وقراءت کی خدمات'' کے عنوان پر سمینار کا انعقاد ہوا تھا، یہاں ''رسم عثمانی'' کے سلسلے میں مقالہ تحریر کرنے کی دعوت دی گئی تھی، لہذا اس کی تاریخ واہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس فن کی اہم تصانیف کا تعارف بھی مقالہ کی شکل میں پیش کیا گیا۔

رسم عثمانی اور مصاحف عثمانیہ

تعارف و تاریخ، اہمیت اور تصانیف

اللہ تبارک وتعالی نے حضرت انسان کو دیگر تمام مخلوقات عالم پر جو فضیلت بخش کر ''اشرف المخلوقات'' کے لقب سے نوازا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کو عقل وفہم اور اپنے مافی الضمیر کو مناسب پیرایہ میں واضح کرنے کی دولت سے مالا مال کیا گیا ہے، جبکہ دیگر مخلوقات اس صفت سے محروم ہیں، اور صرف یہی نہیں بلکہ انسان کو اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے زبان وکلام پر قدرت بخشی؛ وہیں ساتھ ہی ساتھ رب العالمین نے اسے اپنے احساسات کو قید تحریر میں لانے اور اپنے علوم کی حفاظت وبقا کے لیے فن تحریر وکتابت سے بھی نوازا، یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ میں کتابت وتحریر کی تاریخ بھی کافی قدیم ہے، پھر اس کتابت میں حروف عربیہ کی کتابت اس لیے اہمیت رکھتی ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ منجانب اللہ عربی میں نازل ہوئے اور رسول کائنات ﷺ نے اسے عربی ہی میں لکھوا کر اس زبان وتحریر کو دوام بخشا۔

اس پس منظر میں فن تحریر کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فن کتابت وتحریر کی ایجاد بھی قدیم ہے، البتہ اس کے موجد کون ہیں؟ اس میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(۱) بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ دیگر زبانوں کی تحریر کی طرح عربی

زبان کی تحریر کی ایجاد بھی حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمائی، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے تمام زبانوں کو مٹی پر لکھ کر اسے آگ میں پکایا اور ان تختیوں کو زمین میں دفن فرمادیا، پھر طوفان نوح علیہ السلام کے تھم جانے کے بعد ہر قوم کو ان میں سے ایک ایک تختی حاصل ہوئی اور الہام ربانی سے انہوں نے اسے سیکھا اور اس کے حروف کو اپنی کتابت میں استعمال کرنے لگے۔

(۲) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کی بنیاد حضرت ہود علیہ السلام نے رکھی، ان سے یہ علم "مرامر بن مُرّة"، "اسلم بن سيدرة" اور "عامر بن جدره" نامی اشخاص نے حاصل کیا، اور پھر ان سے ''اہل انبار'' نے یہ علم سیکھا اور اس طرح یہ فن عراق وحیرہ اور دیگر علاقوں میں پھیلا، آگے چل کر شاہ دومۃ الجندل ''اکیدر بن عبد الملک'' کے بھائی ''بشر بن عبد الملک'' نے اسے سیکھا، جس کے حرب بن اُمیہ سے تجارتی تعلقات تھے، پھر یہ بشر حرب بن اُمیہ کے ساتھ سفر کر کے مکہ پہونچے اور ''صہباء بنت حرب'' سے نکاح کیا، اور اسی حرب نے اور اہل مکہ میں سے دیگر افراد نے کتابت سیکھی اور قریش میں فن کتابت شائع وعام ہوا۔

(۳) ایک قول اس سلسلہ میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس کی بنیاد رکھی اور آپ تمام حروف کو ملا کر لکھا کرتے تھے، حتی کہ الف اور راء بھی ملا کر لکھتے تھے، جسے بعد میں آپ کی اولاد میں سے کسی نے یا ''نزار بن معد بن عدنان'' نے علیحدہ لکھنا شروع کیا۔

(۴) ایک قول کے مطابق ملک مدین کے کچھ بادشاہوں نے اپنے اپنے

ناموں کے مطابق عربی الفاظ کی کتابت کو ترتیب دیا، ان کے نام یہ ہیں: "هوز، حطي، كلمن، سعفص، قرشت"، لیکن چونکہ یہ نام عربی حروف کا احاطہ نہیں کرتے تھے، اس لیے انہوں نے اپنے ناموں کے ساتھ دو لفظوں "ثخذ" اور "ضظغ" کا اضافہ کرلیا، اور ان دو لفظوں کو "روادف" کا نام دیا گیا۔

(۵) اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اہل یمن میں موجود قبیلہ "حِميَر" نے سب سے پہلے اس فن کو استعمال کیا، چنانچہ وہ بسا اوقات حروف کو ملا کر لکھتے تو کبھی جدا جدا لکھتے، پھر ان کا یہ علم "حيرة" پہونچا اور پھر وہاں سے "مكة المكرمة" پہونچا، لیکن یہاں یہ سوال باقی ہی رہتا ہے کہ آیا قبیلۂ حمیر نے اس کی بنیاد رکھی تھی یا پہلے سے موجود ایک فن کو نئی شکل دے کر اسے فروغ دیا تھا؟

ظہور اسلام اور عربی کتابت:

سرزمین مکہ پر جب ایمان کی باد بہار چلی، اس وقت مکہ میں عربی کتابت کو جاننے والے افراد کل چودہ تھے، جن کے نام یہ ہیں: (۱) علی بن أبی طالبؓ (۲) عمر بن الخطابؓ (۳) طلحہ بن عبید اللہؓ (۴) عثمان بن سعید بن خالد (۵) أبان بن سعید بن خالد (٦) یزید بن أبی سفیان (۷) حاطب بن عمر بن عبد شمس (۸) العلاء بن الحضرمی (۹) ابوسلمة بن عبد الأشہل (۱۰) عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح (۱۱) حویطب بن عبد العزیٰ (۱۲) ابوسفیان بن حربؓ (۱۳) معاویہ بن ابی سفیانؓ (۱۴) جہیم بن الصلت بن مخرمہ۔

پھر جب ہجرت رسول اللہ ﷺ عمل میں آئی اور حق و باطل کا پہلا معرکہ مقام بدر پر پیش آیا تو قریش کے ستّر افراد قید ہو کر دربار نبوت میں پیش ہوئے، جہاں جان بخشی کے

لیے کچھ رقم مقرر کی گئی، اور جو شخص فدیہ دیکر جان چھڑانے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا اسے یہ حکم دیا گیا کہ مدینہ منورہ کے دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا کر چھٹکارا حاصل کرے، چونکہ اس سے قبل مدینہ طیبہ میں لکھنے کا رواج نہیں تھا اس لیے یہ طریقہ مستحسن سمجھا گیا اور مدینہ منورہ میں لکھنے پڑھنے کا ماحول عام ہوتا چلا گیا، پھر حیات نبوی میں اور اس کے بعد کے ادوار میں اسلام جہاں جہاں پہنچا وہاں اس فن نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی، بالخصوص جب کتابت کے قواعد وضوابط طے کیے گئے اور اس میں حسن وجمال پیدا کیا گیا تب اسے خوب ترقی حاصل ہونے لگی، جس کا سہرا علماء کوفہ کے سر جاتا ہے کہ انہوں نے کتابت میں حسن وجمال کا اتنا اہتمام کیا کہ ''خط کوفی'' نام سے ایک طرز تحریر وجود میں آ گیا، پھر علماء بصرہ نے بازی ماری جو مختلف اشکال اور مختلف قلموں سے لکھتے تھے؛ حتی کہ خلافت عباسیہ کے مشہور خلیفہ ''المقتدر باللہ'' کے وزیر ''ابن مقلہ'' نے اپنی مہارت کو کام میں لاتے ہوئے خط کوفی پر مزید محنت کر کے نیا طرز ایجاد کیا، اس کے ہی نقش قدم پر چلتے ہوئے ''ابوالحسین علی بن ہلال البغدادی المعروف بابن البواب'' نے اور پھر دیگر علماء نے اس میں بتدریج تحسین وجمال پیدا کیا، اور آج عربی رسم الخط کے دسیوں نمونے ہماری آنکھوں کا سرمہ بنے ہوئے ہیں۔

عہد نبوی اور کتابت قرآن:

ظہور اسلام سے قبل عرب حضرات اپنے تجارتی معاہدات کو نیز شعراء عرب اپنے قصائد کو لکھنے کے عادی تھے، پھر جب وحی الٰہی کا سلسلہ شروع ہوا تو حضور اقدس ﷺ نے تمام صحابہ کرام کو خصوصی حکم دیا کہ کتابت قرآن کا اہتمام کریں، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''لاتكتبوا عني ، ومن كتب عني غير

القرآن فليمحه". (مسلم:۳۰۰۴) اوراس حکم کی تعمیل اس انداز میں ہوئی کہ آپ ہی کی حیات طیبہ میں مکمل قرآن کریم کھجور کے درخت کی چھال پر، ہڈیوں پر، چمڑے اوراس زمانہ میں کتابت کے لیے استعمال ہونے والی اشیاء پر لکھا جاچکا تھا، اوراسی ترتیب سے تیار کردہ مصحف حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس محفوظ رہا، پھر حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعدام المؤمنین حضرت حفصہؓ نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا کہ عہد رسالت میں کتابت کی ذمہ داری ادا کرنے والے صحابۂ کرام کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی، جس کی تعداد ایک محتاط اندازہ کے مطابق ۴۳ یا ۴۴ تک پہونچتی ہے، اور پھر ان میں سے کتابت وحی وکتابت قرآن کی اہم ذمہ داری یہ حضرات انجام دیتے تھے: (۱) ابوبکر صدیق (۲) عمر بن الخطاب (۳) عثمان بن عفان (۴) علی بن ابی طالب (۵) ابان بن سعید (۶) اُبی بن کعب (۷) ارقم بن ابی الارقم (۸) ثابت بن قیس (۹) حنظلہ بن الربیع (۱۰) ابورافع القبطی (۱۱) خالد بن سعید (۱۲) خالد بن الولید (۱۳) العلاء بن الحضرمی (۱۴) زید بن ثابت (۱۵) معاویہ بن ابی سفیان رضي اللہ عنہم، مذکورہ بالا حضرات حضور اقدس ﷺ کی موجودگی میں وحی الٰہی کی کتابت کیا کرتے تھے، جسے خود آپ ﷺ املا کرواتے اور پھر اصلاح بھی فرماتے کہ کہیں کوئی خطا نہ رہ جائے، چنانچہ شیخ طاہر الکردیؒ لکھتے ہیں: "فقد ورد عن زيد بن ثابت أنه قال: كنت أكتب الوحي عند رسول الله ﷺ وهو يملي عليَّ، فإذا فرغت، قال: اِقرء ه، فأقرؤ ه ؛ فإن كان فيه سقط أقامه". (مقدمۂ مختصر التبيين: ۱/ ۲۰۰،بحواله تاريخ القرآن وغرائب رسمه)

قرآن پاک کا ایک جگہ جمع کرنا :

آپ ﷺ کے دور میں قرآن پاک کو ایک جگہ جمع نہ کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قرآن پاک جیسے نازل ہوتا صحابہ اسے فوراً یاد کر لیتے ،جس کی وجہ سے ایک جگہ جمع کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، نیز ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ چونکہ کسی آیت کا منسوخ ہونا ممکن تھا، اب اگر لکھ دیا جاتا اور وہ آیت منسوخ ہوتی تو ایک طرح کے اختلاف واختلاط کا اندیشہ تھا، لیکن جب حضور ﷺ کا وصال ہوگیا اور وحی الٰہی کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا تو صحابہ کرام کو قرآن پاک ایک جگہ جمع کرنے کی فکر دامن گیر ہوئی، یہ فکر اس وقت اور زیادہ شدید ہوگئی جب عہد صدیقی میں پیش آنے والی جنگ یمامہ میں تقریبا سات سو حفاظ قرآن شہید ہوگئے، چنانچہ اس صورت حال سے پریشان ہوکر حضرت عمر نے حضرت ابوبکرؓ کو اس جانب متوجہ کیا کہ اگر یہی حال رہا تو قرآن کریم کی حفاظت کا مسئلہ ہوجائے گا، لہذا بہتر ہے کہ قرآن کریم کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے ،کافی غور وتدبر کے بعد حضرت ابوبکر کو بھی شرح صدر ہوا اور آپ نے کاتب وحی حضرت زید بن ثابت کو جمع قرآن کا حکم دیا، حضرت زید کے احتیاط کا عالم یہ تھا کہ دو عادل گواہوں کی گواہی کے بعد ہی کوئی آیت لکھتے تا کہ کسی طرح سے اعتراض کا موقع نہ رہے، اس طرح ایک مصحف تیار کیا گیا۔

جمع عثمانی:

پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا اور عالم اسلام کی حدود اربعہ میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو ایک نئی صورت حال سامنے آئی، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (جو آذریجان اور اس کے قریبی علاقوں میں مصروف جہاد لشکر کے امیر تھے) نے دیکھا کہ مجاہدین کی

جماعتیں آپس میں اس بات پر اختلاف کررہی ہیں کہ ہماری قراءت دیگر قراءتوں سے بہتر ہے، چونکہ قرآن پاک منجانب اللہ سات مشہور طرق قراءت پر مشتمل ہونے کی حالت میں نازل ہوا تھا، اس لیے اختلاف کا ہونا فطری امر تھا، لیکن مستقبل میں یہ اختلاف کسی ناپسندیدہ واقعہ کا سبب بن سکتا تھا، اس لیے حضرت حذیفہ نے واپسی کے بعد حضرت عثمان کو حقیقت واقعہ بتا کر اس سلسلہ میں کاروائی کرنے کا مشورہ دیا، یہی نہیں بلکہ حدود مدینہ منورہ میں قرآن پاک کے پڑھنے پڑھانے والوں کے درمیان بھی اس طرح کے اختلافات ہونے لگے ،حضرت عثمانؓ نے اس واقعہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے تمام صحابہ کرام کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، جس میں یہ بھی کہا: "أنتم عندي تختلفون ، فمن نأىٰ عنّي من أهل الأمصار أشد فيه اختلافا و أشد لحنا ". (مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباري ،كتاب فضائل القرآن ، باب جمع القرآن : ١٠/١٣) پھر کہا: "اجتمعوا يا أصحاب محمد ، فاكتبوا للناس إماما". (مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر طبری: ۱/۲۸-۳۰) پھر آپ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے قرآن کا نسخہ منگوایا اور حضرت زید بن ثابت کو ذمہ داری دی کہ وہ اسی مخصوص طریقے پر لکھیں، جیسا کہ اس سے پہلے لکھا تھا۔

اللہ رب العزت کی حکمت بالغہ دیکھیے کہ تینوں مرتبہ قرآن پاک کی کتابت کی ذمہ داری حضرت زید بن ثابتؓ کے کاندھوں پر آئی، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ قرآن پاک کو اسی طرز پر لکھا جائے جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ میں اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں لکھا گیا تھا، اور اس میں سرمو تبدیلی واقع نہ ہو۔ الغرض اس مرتبہ بھی حضرت عثمانؓ کے حکم سے چند نسخے لکھے گئے جنہیں مصاحف عثمانیہ کا نام دیا گیا، اور ہر بڑے ملک میں ایک قاریٔ قرآن کے ساتھ ایک مصحف بھیجا گیا۔

رسم عثمانی کی اہمیت:

رسم عثمانی سے متعلق کچھ تحریر کرنے سے قبل نفس رسم کا مختصر خاکہ ذکر کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے، تو اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ عربی زبان میں لکھنے اور تحریر کرنے کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اس معنی کی ادائیگی کے لیے سب سے پہلے لفظ ''کتاب'' استعمال کیا گیا جو تحریر کرنے اور لکھنے کے معنی پر مشتمل تھا، متقدمین میں سے نافع بن ابی نعیم (ت:۱۶۹ھ)، یحییٰ بن زیاد الفراء (ت:۲۰۷ھ)، ابوعبید قاسم بن سلام (ت:۲۲۴ھ)، ابوبکر محمد بن یحییٰ الصولی (ت:۳۳۶ھ)، عبداللہ بن درستویہ (ت:۳۴۷ھ) اور دیگر حضرات نے لفظ ''کتاب'' کو اس معنی میں استعمال کیا ہے۔ (مقدمه مختصر التبيين: ١/١٢٩ بحواله المقنع:٣٩، معانى القرآن للفراء: ١/٩٦، ٢٠٢، أدب الكتاب للصولي: ١١٣، كتاب الكتاب لابن درستويه: ٦٤، جامع بيان العلم ابن عبدالبر: ١/ ٨٥) جیسا کہ خطیب بغدادیؒ (ت:۴۶۲ھ) ابراہیم نخعی اور اعمش سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "كانوا يكرهون كتاب الحديث". (مقدمۂ مختصر التبيين: ١/١٢٩ بحوالهٔ تقييد العلم للخطيب البغدادي: ٤٧، ٤٨) جس میں لفظ ''کتاب'' لکھنے کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

پھر لفظ کتاب کے بعد اس معنی کو ادا کرنے کے لیے بکثرت جو لفظ استعمال ہوا وہ "الهجاء" ہے، جیسا کہ مصاحف کے رسم الخط پر تالیف کردہ کتابوں کی ورق گردانی سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے۔ (مقدمه مختصر التبيين: ١/ ١٣٠ بحواله، مبحث مؤلفات هجاء المصاحف)

البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ لفظ "هجاء" علماء لغت کے یہاں دو الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک معنی یہ ہے کہ کسی انسان کی بے عزتی کی جائے یا اس کے حالات کو

نامناسب پیرایہ میں پیش کیا جائے، جیسے عامۃً شعراء کا ہجویہ کلام ہوتا ہے۔ (مقدمہ مختصر التبیین: ۱/۱۳۰ بحوالہ اساس البلاغة للزمخشری: ۶۹۶) جبکہ دوسرے معنی یہ ہے کہ حروف تہجی بیان کیے جائیں، الفاظ کے حروف کو علیحدہ علیحدہ کر کے واضح کیا جائے۔ (مقدمہ مختصر التبیین: ۱/۱۳۰ بحوالہ المخصص لابن سیدہ: ۴/۱۳) اور یہی معنیٰ یہاں مراد ہے۔ اس طرح کتابت وتحریر اور فن خط کے لیے اولین مصادر میں لفظ ہجاء کا ہی استعمال ہوتا رہا، پھر ''خط'' کی اصطلاح رائج ہوئی جو کتابت کی ہر قسم کو شامل تھی، چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے خود ایک رسالہ ''علم خط'' سے متعلق تالیف فرمایا ہے جو "التحفة البهية و الطرفة الشهية" نام کی کتاب کے ساتھ مطبعة الجوائب، استنبول سے طبع ہو چکا ہے۔ (مقدمہ مختصر التبیین: ۱/۱۳۰)

اس دور کے بعد تیسرا دور یہ آیا کہ لفظ ''کتابت'' اور لفظ ''ھجاء'' کے بجائے اسی کے ہم معنی لفظ ''رسم'' کو استعمال کیا جانے لگا، جسے کبھی ''رسم المصحف'' یا ''الرسم العثمانی'' بھی کہدیا جاتا ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ لفظ ''رسم'' کا اس معنی میں استعمال آخری ادوار میں شروع ہوا ہے، ورنہ قرون سابقہ کی کتابوں میں یہ لفظ لکھنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا تھا، حتی کہ خود علماء لغت نے بھی لفظ رسم کے معانی میں اس معنی کو ذکر نہیں کیا ہے، چنانچہ ابن درید (ت: ۳۲۱ھ) اور ازہری (ت: ۳۷۰ھ) نے ''رسم'' کے معنی کسی چیز کا اثر یا علامت بیان کیے ہیں۔ (مقدمہ مختصر التبیین: ۱/۱۳۱ بحوالۂ جمهرة اللغة لابن درید: ۲/۳۳۶ وتهذيب اللغة للأزهري: ۱۲/۴۲۲ والصحاح للجوهري: ۵/۱۹۳۲) جبکہ ابن منظور (ت: ۷۱۱ھ) مذکورہ معنی بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "ورسم على كذا، ورشم إذا كتب". (مقدمة مختصر التبیین: ۱/۱۳۱ بحوالۂ لسان العرب: ۱۲/۲۴۱) جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طویل

مدت کے بعد لفظ ''رسم'' کو لکھنے کے معنی میں استعمال کرنے کا اتفاق ہوا، اور پھر اس میں تخصیص پیدا کرنے کے لیے اس کی اضافت کی گئی اور ''الرسم العثمانی'' کی اصطلاح وجود میں آئی۔

پھر اس رسم عثمانی کی اصطلاحی تعریف اس طرح بیان کی جاسکتی ہے:"إن علم الرسم العثماني هو علم يبحث فيه عن كيفية كتابة كلمات القرآن الكريم وحروفه في المصاحف العثمانية ، كما كتبها الصحابة رضوان الله تعالى عليهم بإيعاز من الخليفة عثمان رضي الله عنه". (مقدمه كتاب الوسيلة إلى كشف العقيله: ۳۵/۱ بحواله، إبراز المعاني: ۲۰۶/۲، مفتاح الأمان: ۱۳، مناهل العرفان: ۳۶۹/۱) کہ حضرت عثمانؓ کی رہنمائی میں صحابہ کرامؓ نے مصاحف عثمانیہ کو جس انداز پر لکھا تھا اس کے حروف کی اور کلمات قرآنیہ کی اس انداز تحریر پر بحث و تحقیق کرنا ''علم رسم عثمانی'' کہلاتا ہے۔

اس مختصر تمہید اور گزشتہ صفحات میں مذکور تفصیل کی روشنی میں یہ بات بے غبار ہوجاتی ہے کہ رسم عثمانی ایک مخصوص طرز تحریر ہی کا نام نہیں بلکہ لوح محفوظ پر مکتوب، اور حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ محمد عربی ﷺ پر نازل کردہ قرآن پاک کا رسم ہے، جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رسم عثمانی کی اتباع اور اس کا حکم:

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ جمہور علماء امت کا مذہب یہی ہے کہ قرآن پاک کو رسم عثمانی کے مطابق لکھنا واجب ہے اور اس سے انحراف کرنا جائز نہیں ہے، اور دلیل یہی ہے کہ حضور ﷺ کی موجودگی میں کاتبین وحی نے اور بالخصوص حضرت زید بن ثابت کو

حضوراقدس ﷺ نے جس مخصوص طرز اور نہج پر لکھوایا تھا،رسم عثمانی میں اسی کو باقی رکھا گیاہے،عہد رسالت کے بعد دورصدیقی اور دور فاروقی میں اسی رسم کو باقی رکھا گیا،اور پھر دورعثمانی میں اسی طرز پر مرتب کیا گیا، جواس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس رسم کو نہ صرف اجماع صحابہ کا شرف حاصل ہے بلکہ خود نبی ﷺ نے بھی اسی کو مناسب اور بہتر سمجھا ہے، یہی وجہ ہے کہ کتابت قرآن کے ابتدائی ادوار میں بھی کسی نے اس میں تبدیلی کا سوچنا بھی گوارانہیں کیا، بارہویں صدی ہجری کے مشہور عالم احمد بن المبارک (ت:۱۱۵۵ھ) اپنے مایہ ناز استاذ عبدالعزیز الدباغ (ت:۱۱۳۲ھ) کے حوالہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ما للصحابة ولا لغيرهم في رسم القرآن ولاشعرة واحدة، وإنما هو بتوقيف من النبي ﷺ، وهو الذي أمرهم أن يكتبوه على الهيئة المعروفة بزيادة الألف ونقصانها ،لأسرار لاتهتدي إليها العقول“ . (مقدمة مختصر التبيين :۱/۲۰۱ بحواله ، الذهب الإبريز لابن المبارك :۵۵)

اورصرف یہی نہیں بلکہ رسم قرآنی ان اسرارالٰہیہ میں سے ایک ہے جو اللہ تعالی نے قرآن مجید کے لیے خاص کیے ہیں کہ جس طرح قرآن پاک کا نظم اورالفاظ کا تناسب معجز ہے اسی طرح اس کا رسم بھی معجز ہے، مذکورہ بالا کتاب ہی میں اس سے متعلق یوں تحریر ہے:

”وللقرآن أسرار لاتستفاد إلا بهذا الرسم ، فمن كتب بالرسم التوقيفي فقد أداه بجميع أسراره، ومن كتبه بغير ذلك فقد أداه ناقصا ، ويكون ما كتبه إنما هو من عند نفسه لامن عند الله“. (حوالہ بالا)

صاحب نثر المرجان علامہ غوث نائطی نے اس مسئلہ پر کافی مفصل بحث کی ہے ،چنانچہ لکھتے ہیں:

"ثم اعلم أن جماهير العلماء من السلف والخلف وأئمة المسلمين ذهبوا إلى أن المصاحف العثمانية مشتملة على مايحتمله رسمها من الأحرف السبعة التي أنزل بها القرآن ، جامعة للعرضة الأخيرة التي عرضها النبي ﷺ على جبرئيل عليه السلام متضمنة لها، لم يترك حرفا منها ؛ لأن الصحابة أجمعوا على نقلها من المصحف التي كتبها أبوبكر وعمر رضي الله عنهما ، وأجمعوا على ترك ماسوىٰ شيئى من القرآن ، كذا قاله الجزري في النشر، ولذلك لايجوز مخالفة المصاحف العثمانية في الكتابة ". (نثرالمرجان:۱/۱۰)

اسی طرح امام سیوطی کے حوالہ سے آپ نقل فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ فی زمانہ نئے رسم الخط پر قرآن پاک کو لکھنا کیسا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: "لا أرىٰ ذلك ولكن يكتب على الكتبة الأولىٰ ". (نثر المرجان: ۱/۱۰) جبکہ امام احمدؒ فرماتے ہیں: " يحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك".
(نثرالمرجان: ۱/۱۱) الغرض صاحب نثر المرجان نے ابوبکر احمد بن مہران، امام مبرّد، امام کسائی اور دیگر ارباب علم وفن کے حوالوں سے اس بات کو مؤید کیا ہے کہ رسم عثمانی کی مخالفت کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہوسکتی ہے۔ (دیکھئے: نثر المرجان: ۱/۱۰-۱۲) چھٹی صدی ہجری کے نامور عالم قاضی عیاض اپنی شہرہ آفاق تصنیف "الشفاء" میں اس سلسلہ میں یوں رقمطراز ہیں:

" وقد أجمع المسلمون أن القرآن المتلوّ فى جميع أقطار الأرض،

المكتوب في المصحف بأيدى المسلمين ممّا جمعه الدفتان من أول الحمد لله رب العلمين– إلى آخر– قل أعوذ برب الناس– أنه كلام الله ، وحيه المنزّل على نبيه محمد ﷺ، وأن جميع ما فيه حق وأن من نقص منه حرفا قاصداً لذلك أو بدّله بحرف آخر مكانه أو زاد فيه حرفا مما لم يشتمل عليه المصحف الذي وقع الإجماع عليه ، وأجمع على أنه ليس من القرآن – عامدا لكل هذا أنه كافر".

(الشفاء : ٢/٢٦٤)

قاضی عیاض کی مذکورہ عبارت سے تو رسم عثمانی کی مخالفت کرنا اور کسی حرف کی کمی یا زیادتی کرنا صرف اجماع امت کی خلاف ورزی ہی نہ ہوگی بلکہ یہ عمل موجب کفر بھی ہوگا۔

اسی فیصلہ کو مکۃ المکرّمہ میں موجود رابطۂ عالم اسلامی کے ماتحت قائم فقہ اکیڈمی نے صادر کیا ہے، چنانچہ ھیئۃ کبار العلماء للسعودیہ کے پاس ایک قرارداد پیش کی گئی جسے متفقہ طور پر تائید حاصل رہی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ قرآن پاک کے عثمانی رسم الخط میں تبدیلی جائز نہیں ہے اور موجودہ رسم الخط ہی میں اسے باقی رکھنا واجب ہے۔ (دیکھیے :اسلامی فقہ اکیڈمی مکۃ المکرّمہ کے فقہی فیصلے:۶/۱۷۶-۱۷۸)

یہاں یہ بات بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ جس طرح رسم عثمانی کی مخالفت جائز نہیں ہے اسی طرح قرآن پاک کو عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں لکھنا بھی جائز نہیں ہے، چاہے اس کا مقصد تعلیم وتدریس ہی کیوں نہ ہو۔قاری ابوالحسن صاحب نے اپنے رسالہ ''قرآنی املاء اور رسم الخط'' میں اس مسئلہ کو کافی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ مقدمہ

میں لکھتے ہیں: ''یہیں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کا ہندی اور انگریزی میں لکھنا بالکل ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ ہندی اور انگریزی میں عربی زبان کے بہت سے حروف آتے ہی نہیں، لہذا وہ ان زبانوں کے خط میں بھی معدوم رہیں گے''۔ (قرآنی املاء اور رسم الخط :۱۱) پھر اسی مسئلہ کو مدلل طور پر مذکورہ رسالہ کے صفحہ ۱۵ تا ۱۸ پر بیان کیا ہے، شائقین کے لیے مراجعت فائدہ سے خالی نہیں رہے گی، طوالت کے خوف سے یہاں مکمل بحث کا ذکر کرنا مناسب محسوس نہیں ہوتا ہے۔

عربی رسم الخط اور اس کی قسمیں:

عربی زبان کے ماہرین نے عربی خط کو تین قسموں پر تقسیم کیا ہے: (۱) خط قیاسی (۲) خط عروضی (۳) خط مصحف۔

(۱) خط قیاسی: اس سے وہ خط مراد ہے جسے علماء بصرہ وکوفہ نے بکثرت استعمال کیا اور اس کے قواعد بھی مرتب کیے، اس خط میں ''مکتوب'' اور ''منطوق'' کے مابین مکمل موافقت کی رعایت نہیں کی جاتی ہے۔

(۲) خط عروضی: یہ وہ طرز تحریر ہے جسے شعراء واہل عروض اشعار کی تقطیع وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں اور معنی کی رعایت کیے بغیر محض وزن شعری کی غرض سے حروف میں کمی زیادتی کر دیتے ہیں، جیسے تنوین کی جگہ نون ساکن، یا حرف مدغم کی جگہ دو حرفوں کا لکھ دینا، گویا اس میں مکتوب ومنطوق میں مطابقت کی رعایت کی جاتی ہے۔

(۳) خط المصحف: اس سے وہ خط مراد ہے جسے حضرت زید بن ثابت رضي الله عنہ نے جمع قرآن کے مختلف مراحل میں کتابت قرآن کے موقع پر استعمال فرمایا تھا، اور اس کو

جان کر ہی رسم مصحف ورسم قیاسی کے درمیان پائی جانے والی مخالفت سمجھی جاسکتی ہے، نیز اس خط میں مکتوب ومنطوق میں نہ ہی موافقت تامہ پائی جاتی ہے اور ہی مخالفت تامہ؛ بلکہ اس انداز میں الفاظ کو تحریر کیا گیا کہ دیگر قراءت کو بھی شامل ہو جائے، اور اس طرز تحریر کے رسم قیاسی سے مخالف ہونے کی بناء پر اس پر قیاس کرنا بھی درست نہیں ہوگا، چنانچہ ابن درستویہ اپنی کتاب "ادب الکاتب" میں لکھتے ہیں: "خطّان لا یقاس علیهما ، خط المصحف وخط العروض". (مقدمه مختصر التبيين : ١٣٤)

اس کے بعد جان لیں کہ کل چھ قواعد ایسے ہیں جن میں رسم عثمانی اور رسم قیاسی کے درمیان مخالفت پائی جاتی ہے:

(١) الحذف (٢) الزیادة (٣) الهمزة (٤) الإبدال (٥) الوصل و الفصل (٦) جہاں دو قراءتیں ہوں وہاں کسی ایک جامع قراءت پر لکھنا جو دوسری قراءت پر بھی مشتمل ہو۔

(١) الحذف :- علماء رسم نے حذف کی تین قسمیں لکھی ہیں: (١) حذف إشاره (٢) حذف اختصار (٣) حذف اقتصار.

[١] حذف إشاره :- اس سے یہ مراد ہے کہ حذف کرنے کا مقصد کسی اور قراءت کو شامل کرنا ہے، جیسے "اسارى تفادوهم" میں دونوں کلموں میں الف کو حذف کیا گیا تا کہ "أسارى" میں امام حمزہ کی قراءت شامل ہو جائے جو "أسرىٰ" پڑھتے ہیں اور "تفادوهم" میں ابن کثیر، ابوعمرو اور حمزہ وخلف کی قراءت کو شامل کرنا مقصود تھا جو "تفدوهم" پڑھتے ہیں۔

[۲] حذف اختصار :- جو عامۃً ایک جیسے نظر آنے والے الفاظ میں واقع ہوتا ہے، جیسے جمع مذکر سالم میں الف محذوف ہوتا ہے: "الحفظین "، "الصدقین" وغیرہ۔

[۳] حذف اقتصار :- اس سے یہ مراد ہے کہ ایک ہی لفظ قرآن پاک میں ایک سے زائد مرتبہ مستعمل ہوا ہو، لیکن صرف ایک جگہ اسے خلاف منطوق لکھا گیا ہو اور بقیہ جگہ مطابق منطوق لکھا گیا ہو، جیسے سورۂ انفال کی آیت: "ولو تواعدتم لاختلفتم في المیعٰد". (آیت:۴۲) میں لفظ "المیعاد" کو حذف الف کے ساتھ لکھا گیا، جبکہ یہی لفظ دوسری جگہوں پر الف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ (دیکھیے: مقدمہ مختصر التبیین: ۱۳۵،۱۳۶)

(۲) زیادۃ: - اسم جمع کے آخر میں اگر واو ہو تو الف کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے: "بنوا إسرائیل ، ملاقوا ربھم، أولوا الألباب" وغیرہ، اسی طرح وہ ہمزہ جو واو کی شکل میں لکھا ہو اس کے آخر میں بھی الف کا اضافہ ہوتا ہے، جیسے: "تفتؤا" نیز "مائة، مائتین" وغیرہ۔

(۳) ھمزہ :- ہمزہ ساکنہ کو اس کے ماقبل والے حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جاتا ہے، چاہے ابتداء میں ہو یا درمیان میں یا آخر میں جیسے: "ائذن، اؤتمن" اور "البأساء" وغیرہ۔

(٤) بدل:- یعنی ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف لکھا جائے اور پڑھا نہ جائے، جیسے: "الصلوٰة، الزکوٰة ، الحیوٰة" اور "الربوٰا" وغیرہ میں تفخیم و تعظیم کی غرض سے الف کو واو سے بدل کر لکھا جاتا ہے جبکہ واو پڑھی نہیں جاتی ہے، اسی طرح جو الف یاء سے تبدیل ہو کر الف کی

شکل میں ہواسے بھی یاء کی شکل میں لکھا جاتا ہے، جیسے:"یتوفکم" وغیرہ، واضح رہے کہ اسم وفعل دونوں میں اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

(۵) وصل و فصل: - دومختلف لفظوں کوملا کر یا علیحدہ کر کے لکھا جانا بھی بکثرت پایا جاتا ہے، جسے وصل اور فصل سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے "من ما" کو "مما"، "عن ما" کو "عما"، "في ما" کو "فیما" اور "کل ما" کو "کلما" لکھا گیا ہے، جبکہ یہی مذکورہ الفاظ متعدد جگہوں پر موصول کی بجائے مفصول ہی لکھے گئے ہیں۔

(٦) جامع قراءت کے مطابق لکھنا :- یعنی ایسا لفظ جس میں ایک سے زائد قراءت ہو اسے اس طرز پر لکھا جائے کہ وہ تمام قراءات کا احاطہ کر لے، جیسے لفظ "مالک" کو بغیر الف کے "مٰلك" لکھا گیا ہے تا کہ "ملِک" والی قراءت بھی شامل ہو جائے، یہی حال "یخٰدعون"، "وٰعدنا"، "الصّٰعقه" اور "تظٰهرون" جیسے الفاظ کا ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے "الإتقان" میں مزید مثالیں پیش فرمائی ہیں، نیز ہر قاعدہ کے مستثنیات کو بھی ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے، اس کی تفصیلات پر مطلع ہونے کے لیے مذکورہ کتاب کے باب نمبر:٧٦ کا مطالعہ مفید رہے گا۔

اپنی تحریر کو اختتام تک پہونچانے سے قبل اس بات کا ذکر کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ رسم عثمانی و رسم قیاسی میں جہاں کہیں مخالفت موجود ہے وہ ان مذکورہ چھ (٦) قواعد ہی کی بنیاد پر ہے، جن کی رعایت کرنا کاتب قرآن کے لیے واجب اور مخالفت کرنا اجماع امت کی رو سے حرام اور ناجائز ہے، اس سے رسم عثمانی کی اہمیت اور اس کی تاریخ، اس کی اتباع اور اس کی صحیح سمت میں ترقی کے لیے کی جانے والی کوششوں پر ایک نظر پڑتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ

علماء دین وخادمین قرآن کریم نے نہ صرف معانی قرآن کی اور الفاظ قرآن کی حفاظت کی ، بلکہ رسم قرآن وخطّ قرآن کی بھی حفاظت کو اپنا فریضہ سمجھ کر اسے بھی محفوظ رکھا، اور زندہ جاوید معجزہ الٰہی کی خدمت کر کے اپنی دنیا وآخرت کو سنوار لیا۔

علم رسم کی اہم تصنیفات:

علم رسم کی اہمیت کے پیش نظر اس سلسلہ میں لکھی گئیں کتابوں کا مکمل احاطہ کرنا یقیناً متعذّر ہے، البتہ فن کی مشہور کتابوں کا ذکر کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے، تاکہ مشتاقان علم وفن اور محبان کتاب الٰہی کو اس سے فائدہ ہو اور ہم اپنے رب کریم کی جانب سے انعام کے مستحق بن سکیں۔

(۱) "كتاب اختلاف مصاحف الشام والحجاز والعراق": یہ "عبداللہ بن عامر الیحصبي الشامي" (ت:۱۱۸) کی تصنیف ہے، آپ ہی کی دوسری کتاب "المقطوع والموصول في القرآن" نام سے بھی ہے، ابن ندیم نے ان دونوں کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

(۲) "كتاب في هجاء المصاحف": یہ یحیٰی بن الحارث الدماری (ت:۱۴۵ھ) کی تحریر کردہ ہے۔

(۳) "كتاب مرسوم المصحف": ابوعمرو زبان بن العلاء البصری (ت: ۱۵۴ھ) کی ہے، اس کا ایک تحریری نسخہ استنبول کے "آیا صوفیا" میوزیم میں موجود ہے۔

(٤) "المقطوع والموصول في القرآن": حمزہ بن حبیب الزیات (ت: ۱۵٦ھ) کی ہے، ابن ندیم نے اسے ذکر کیا ہے۔

(٥) "كتاب مقطوع القرآن وموصوله" : علی بن حمزۃ الکسائی (ت:١٨٩ھ) کی ہے، امام ذہبی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(٦) "كتاب اختلاف مصاحف أهل المدينة وأهل الكوفة وأهل البصرة" : یہ بھی امام علی بن حمزہ الکسائی کی ہے، ابن ندیم نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(٧) "هجاء السنة" : غازی بن قیس الأندلسی (ت:١٩٩ھ) کی تصنیف ہے، متعدد حضرات نے اس کا ذکر کیا ہے اور شارح عقیلہ لبیب نے وضاحت فرمائی ہے کہ انہوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور ''عقیلۃ'' کی شرح تیار کرنے میں اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔

(٨) "كتاب اختلاف أهل الكوفة والبصرة والشام في المصاحف" : یہ یحییٰ بن زیاد الفرّاء (ت:٢٠٧ھ) کی کتاب ہے، ابن ندیم نے اسے بھی ذکر کیا ہے۔

(٩) "كتاب فضائل القرآن ومعالمه وآدابه" : ابوعبید قاسم بن سلّام (ت:٢٢٤ھ) کی تصنیف کردہ ہے، جس میں ابوعبید نے ایک فصل "حروف القرآن التي اختلفت فيها مصاحف أهل الحجاز وأهل العراق" کے نام سے قائم کی ہے، استاذ احمد الخیالی نے دکتور تہامی الراجي الهاشمی کے زیر نگرانی اس کتاب پر تحقیقی کام کیا جو "وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية المغربية" سے شائع ہو چکی ہے۔

(١٠) "كتاب القراءات" : یہ کتاب بھی ابوعبید قاسم بن سلام ہی کی ہے، اس کے نام سے گرچہ رسم الخط پر مشتمل ہونے کا پتہ نہیں چلتا ہے لیکن علم رسم کی اہم کتب جیسے ''المقنع'' اور ''وسیلہ'' وغیرہ میں اس کتاب کے اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی علم رسم میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

(۱۱) "كتاب اختلاف المصاحف": خلف بن هشام (ت:۲۲۹ھ) کی کتاب ہے، ابن ندیم نے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

(۱۲) "كتاب في رسم المصاحف": نصیر بن یوسف النحوي (ت:۲۴۰ھ) کی تالیف ہے، امام ذہبی نے نصیر بن یوسف سے متعلق یہ لکھا ہے: "كان من الأئمة الحذاق لاسيما في رسم المصحف وله فيه مصنّف".

(۱۳) "كتاب رسم المصاحف" : ابوعبداللہ محمد بن عیسیٰ بن رزین الاصبہانی (ت:۲۵۳ھ) کی کتاب ہے، جس میں اکثر کلام نصیر بن یوسف سے ہی نقل کردہ ہے، اس کتاب کا ایک مخطوطہ "آستانہ" کی لائبریری میں اندراج نمبر: ۸۸۱۲ کے تحت موجود ہے۔

(۱٤) "كتاب اختلاف المصاحف" : یہ ابوحاتم سہل بن محمد السجستانی (ت:۲۵۵ھ) کی کاوش ہے، امام ذہبی نے اس کتاب کو ابوحاتم کی تصنیفات کے تحت جگہ دی ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ "برلین" کی گورنمنٹ لائبریری میں موجود ہے۔

(۱۵) "كتاب في هجاء المصاحف" : احمد بن ابراہیم الوراق (ت: ۲۷۰ھ) کی تحریر کردہ ہے، ابن ندیم نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۱٦) "كتاب المصاحف" : حافظ ابوبکر بن ابی داود بن الأشعث السجستانی (ت:۳۱٦ھ) کی مایہ ناز تصنیف ہے، ڈاکٹر آرتھر جیفری کی تحقیق وتصحیح کے ساتھ ۱۹۳٦ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہے۔

(۱۷) "كتاب الهجاء" : ابوبکر محمد بن القاسم بن الانباری (ت:۳۲۷ھ) کی

کتاب ہے، داودی نے اس کو ابن الانباری ہی کی جانب منسوب کیا ہے، اس کا ایک مخطوطہ ''رضالائبریری'' رامپور میں موجود ہے۔

(۱۸) "علم اللطائف فی ھجاء المصاحف": یہ ابوبکر محمد بن الحسن بن یعقوب بن مقسم النحوی (ت:۳۵۴ھ) کی تصنیف ہے، علامہ سخاویؒ نے ''الوسیلۃ'' کی تالیف میں اس پر بہت حد تک اعتماد کیا ہے۔

(۱۹) "علم المصاحف": ابوبکر محمد بن عبداللہ بن اُشتہ (ت:۳۶۰ھ) کی کتاب ہے، متعدد حضرات نے اسے ذکر کیا ہے، علامہ سخاوی نے ''الوسیلۃ'' میں اس سے بھی استفادہ کیا ہے، نیز لبیب نے بھی شرح عقیلہ میں اس سے استفادہ کی وضاحت کی ہے۔

(۲۰) "المحبّر": یہ بھی محمد بن عبداللہ بن اشتہ کی کتاب ہے، ابن الجزری نے اس سے متعلق لکھا ہے: "و کتابہ المحبّر کتاب جلیل یدل علی عظم مقدارہ". لبیب نے عقیلہ کی شرح میں اس سے بھی استفادہ فرمایا ہے۔

(۲۱) "ھجاء مصاحف الامصار": ابوالعباس احمد بن عمار المہدوی (ت:۴۳۰ھ) کی تالیف ہے، استاذ محي الدین رمضان کی تحقیق کے ساتھ اسے "معھد المخطوطات العربیة" نے ۱۹۷۳ء کے شمارہ نمبر:۱۹ میں شائع کیا ہے۔

(۲۲) "کتاب الاختلاف في الرسم والحجة لکل فریق": ابومحمد مکی بن ابی طالب القیسی (ت:۴۳۷ھ) کی تالیف ہے، متعدد حضرات نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۲۳) "ھجاء المصاحف": یہ بھی مکی بن ابی طالب کی تصنیف ہے، علامہ قفطی نے اس کا نام "علل ھجاء المصاحف" بیان کیا ہے۔

(٢٤) "البديع في معرفة ما رسم في مصحف عثمان": محمد بن یوسف بن احمد بن معاذ الجہنی (ت:۴۴۲ھ) کی تصنیف ہے، استاذ غانم القدوری کی تحقیق کے ساتھ ''المورد'' نامی عراقی مجلّہ نے اسے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا ہے، بعد میں ''دار عمار'' اردن سے مستقل کتاب کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔

(٢٥) "الاقتصاد في رسم المصاحف" : ابوعمرو عثمان الدانی (ت: ۴۴۴ھ) کا قصیدہ ہے، ابن الجزری نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(٢٦) " التحبير": یہ بھی علامہ دانی کی تصنیف ہے، لیکن علامہ دانی کے حالات بیان کرنے والوں میں سے کسی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، جبکہ لبیب نے شرح عقیلہ کے مقدمہ میں اس کو علامہ دانی کی جانب منسوب کیا ہے۔

(٢٧) "خلاصة المقنع" : علامہ دانی ہی کی کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ پیرس کی نیشنل لائبریری میں موجود ہے۔

(٢٨) " رسالة فی رسم المصحف" : علامہ دانی کی ایک اور کاوش ہے جس میں آپ نے کلام پاک میں تاء کے ساتھ لکھی ہوئی تاء تانیث کو جمع کیا ہے۔

(٢٩) "المحکم فی نقط المصاحف" : علامہ دانی کی کتاب ہے جو دکتور عزۃ حسین کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی ہے۔

(٣٠) "مختصر مرسوم المصحف": یہ علامہ دانی کی تالیف ہے جس میں آپ نے ابوعمرو بن العلاء البصری کی "مرسوم المصحف" کا اختصار کیا ہے، اس کا ایک مخطوطہ ''آیا صوفیا میوزیم'' میں اندراج نمبر: ۴۸۱۴ (۲۵۳) کے تحت موجود ہے۔

(۳۱) "المقنع في رسم مصاحف الأمصار" : یہ علامہ دانی کی شاہکار تصنیف ہے جو علم رسم قرآنی کی سب سے اہم اور معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے، دسیوں مرتبہ شائع ہوچکی ہے، پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں استنبول سے "جمعية المستشرقين الألمانية" نے اوتو برتزل کی تحقیق کے ساتھ شائع کروائی، دوسری مرتبہ دمشق سے ۱۳۵۹ھ میں استاذ احمد دہمان کی تحقیق کے ساتھ، اور تیسری مرتبہ قاہرہ سے استاذ محمد الصادق قمحاوی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

(۳۲) "الهجاء في مرسوم مصاحف الأمصار" : علامہ دانی ہی کی کتاب ہے، اس کا ایک مخطوطہ قاہرہ میں ''دارالکتب المصریۃ'' میں موجود ہے۔

(۳۳) "مختصر ما رسم فی المصحف الشریف" : یہ اسماعیل بن خلف السرقسطی (ت:۴۵۵ھ) کی تصنیف ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ چیکوسلواکیہ میں واقع ''براتسلاوا یونیورسٹی'' میں موجود ہے۔

(۳٤) "سبل المعارف إلى رسم المصاحف" : ابومحمد عبداللہ بن سہل (ت:۴۸۰ھ) کی تصنیف ہے، شرح عقیلہ میں لبیب نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۳۵) "منظومة في الرسم" : علی بن عبدالغنی الحصری (ت:۴۸۸ھ) کی تحریر کردہ ہے، اس کا ایک مخطوطہ سلطنت مراقش کے خزانہ میں موجود ہے۔

(۳٦) "التنزيل في هجاء المصاحف" : ابوداود سلیمان بن نجاح الاموی (ت:۴۹۶ھ) کی شہرہ آفاق تصنیف ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ رباط میں واقع مکتبہ حسینیہ میں اندراج نمبر: ۴۰/ا کے تحت موجود ہے، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ ابوداود ہی کی ایک اور کتاب

"التبيين لهجاء التنزيل"چھ جلدوں پر مشتمل جامع کتاب ہے۔

(۳۷) "عقيلة أتراب القصائد في أسنى المقاصد" :ابومحمد قاسم بن فیرہ الشاطبی (ت:۵۹۰ھ) کا منظومہ ہے جسے آپ نے علامہ دانی کی "المقنع "پر کچھ اور اضافہ کر کے تیار کیا ہے، یہ منظومہ "إتحاف البررة بالمتون العشرة" کے ضمن میں شائع ہو چکا ہے، اور اب مستقل کتاب کی شکل میں بھی موجود ہے۔

(۳۸) "رسالة في رسم القرآن" :ابوعبداللہ محمد بن عبدالعزیز بن سعادۃ الشاطبي (ت:۶۱۴ھ) کی تالیف ہے، اس کا ایک مخطوطہ تیونس کے''دارالکتب الوطنیہ''میں موجود ہے۔

(۳۹) "مرسوم خط المصحف" :ابوالطاہر اسماعیل بن ظافر العقیلی (ت:۶۲۳ھ) کی کتاب ہے، ابن الجزری لکھتے ہیں: "له كتاب في الرسم من أحسن ما ألف"، اس کا ایک قدیم نسخہ رباط کے خزانۂ عامہ میں اندراج نمبر:۱۸۸۰/ د کے تحت موجود ہے۔

(٤٠) "الوسيلة إلى كشف العقيلة" :یہ علامہ سخاوی (ت:۶۴۳ھ) کی تالیف ہے اور اپنے فن کی اہم کتابوں میں سے سمجھی جاتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ علم رسم سے متعلق بعد کے ادوار میں بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں ہیں، یہاں ان ہی کتابوں کو ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو نایاب ہیں یا مصدر کی حیثیت رکھتی ہیں، واضح رہے کہ مذکورہ بالا تفصیل علامہ سخاوی کی تصنیف کردہ "الوسيلة إلى كشف العقيله" کے تحقیقی مقدمہ سے لی گئی ہے، جسے دکتور مولاي محمد

الإدریسی الظاہری نے لکھا ہے،فجزاہ اللہ خیرالجزاء۔

اسی طرح قریبی زمانہ میں علم رسم سے متعلق لکھی جانے والی مشہور کتابوں میں سے ایک ''نثرالمرجان'' ہے، جسے محمد غوث بن ناصرالدین النائطی نے لکھا ہے،اس کی تکمیل موصوف نے ۱۳۲۶ھ میں کی۔ اسی طرح "دلیل الحیران علی مورد الظمآن " بھی ایک اہم تالیف ہے جوابراہیم بن محمد المارغنی التونسی کے قلم سے نکلی اور ۱۳۲۵ھ میں مکمل ہوئی ۔

قراءاتِ قرآنیہ اور مستشرقین کے اعتراضات:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ علوم اسلامیہ کی خدمات جہاں اہل ایمان نے کی ہے وہیں غیر مسلم افراد کا بھی ایک بڑا حصہ ہے، جنہوں نے علوم اسلامیہ کو اپنے لیے میدان تحقیق بنایا،اورتاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا،لیکن اس طبقہ میں ان حضرات کی کمی نہیں جو مذہبی یا لسانی، یا کسی اور عصبیت سے متأثر ہوکر تحقیقی میدان میں اترے اور علوم اسلامیہ میں وہ دسیسہ کاری کی کہ اس کا سمجھنا ہر ایک کے لیے مشکل ہے، اس طبقہ کو مستشرقین کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے جن کی علمی خیانتوں پر متعدد کتابیں لکھیں جا چکی ہیں۔

ان مستشرقین ہی میں سے ایک مشہور شخص Ignac goldziher (آمد: ۱۸۵۰ء، وفات ۱۹۲۱ء) گزرا ہے، جو مذہباً یہودی تھا، کئی سالوں تک علوم اسلامیہ کی درس گاہ کا طالب علم رہ کر علوم اسلامیہ میں مہارت حاصل کی، لیکن پھر جب قلم سنبھالا تو علوم اسلامیہ، اسلامی تہذیب اور مصادر دینیہ ہی سب سے پہلے اس کا نشانہ بنے ،یہی نہیں بلکہ قرآن پاک جسے مختلف قراءتوں پر پڑھنے کی اجازت منجانب اللہ نازل کردہ ہے، اس کے باوجود موصوف نے

اپنی تحریرات میں اس پر بھی تشکیکی گفتگو کی ہے، جس سے نعوذ باللہ قرآن پاک کی حفاظت پر انگلیاں اٹھائی جاسکتی ہیں۔

چنانچہ موصوف اپنی کتاب "المذاهب الإسلامیه" میں جو کچھ لکھتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قراءات قرآنیہ کا عربی رسم الخط سے خصوصی تعلق ہے، کیونکہ عربی رسم الخط میں ایک ہی حرف مختلف انداز میں لکھا جاتا ہے اور مختلف انداز میں پڑھا بھی جاتا ہے نیز نقطوں کی تبدیلی حرف ہی کو بدل دیتی ہے، اسی طرح حرکات اور حروف کی شکل متعین نہیں تھی، جس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ ایک ہی کلمہ کو اس کی ممکنہ شکلوں پر باقی رکھتے ہوئے مختلف طرز پر پڑھا گیا، اس طرح مخصوص رسم الخط پر لکھنا نیز حرکات اور حروف کی شکلوں کے تعین میں اختلاف کا ممکن ہونا قراءات قرآنیہ میں اختلاف کا بنیادی سبب بنا۔

الغرض مذکور مستشرق نے اپنے اعتراض کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: ایک تو یہ کہ مصحف نقطوں سے عاری تھا، اور دوسرا یہ کہ خط عربی میں حروف کی شکلیں اور اعراب کی علامات موجود نہیں تھیں، پھر اس نے بعض مثالیں بھی پیش کی ہیں جس میں قراء کرام کے اختلاف کا سبب قرآن پاک میں نقطوں کا نہ ہونا بتایا ہے، جیسے "بُشــراً" اور "نشــراً" "فتبینـوا" اور "فتثبتـوا" وغیرہ لیکن کیا کہیے کہ موصوف نے کچھ مثالیں ایسی پیش کی ہیں کہ قراءات میں اس کا وجود ہی نہیں ہے، جیسے سورہ اعراف کی آیت: "قـالـوا مـا أغنیٰ عنکم جمعکم وما کنتم تستکبرون" (آیت:۴۸) میں ایک قراءت "تستکثرون" بھی نقل کی ہے، اس طرح سورہ توبہ کی آیت: "ومـا کـان استـغـفـار إبراهیم لأبیه إلا عن موعدة وعـدهـا إیـاه" (آیت:۱۱۴) میں ایک قراءت "أبـاه" نقل کی ہے جو نہایت غریب قراءت

ہے۔

اب ذرا حقائق وشواہد کی عینک لگا کر دیکھیں تو یہ بات بالکل بے بنیاد اور جھوٹ کا پلندہ نظر آتی ہے، کیونکہ کتب رسم وقراءات میں نہ صرف حروف کی شکلوں کو بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا بلکہ قراءات میں واقع ہونے والے مختلف لہجوں اور ان کے طرز قراءت کو بھی نہایت امانتداری سے قلمبند کیا گیا، جس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مستشرق یہودی کا یہ اعتراض نہایت رکیک اور مبنی بر تعصب ہے۔

اور اگر دلائل کا خلاصہ دیکھیں تو یہ دعوی بھی بالکل ختم ہو جاتا ہے کہ قراءات کا اختلاف عربی رسم الخط اور اعراب کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے، کیونکہ تدوین مصاحف سے پہلے بھی روایات واحادیث کے لکھنے کا اہتمام ہوتا تھا، جس میں صحابہ کرام تحرّی وتثبت سے کام لیتے تھے، اسی طرح قرآن پاک لکھے جانے سے پہلے متعدد لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہو چکا تھا، اور مصاحف میں کتابت سے زیادہ سمع وتلقی کو ترجیح دی گئی کہ جس صحابی کو مصحف کا نسخہ دے کر جس علاقہ میں بھیجا گیا، انہوں نے وہاں قرآن پاک کو اسی انداز پر پڑھایا جو انہوں نے نبی ﷺ اور دیگر صحابہ سے سنا تھا، اور قراءات میں اختلاف کا سبب یہی بات ہے کہ مختلف علاقوں میں مختلف افراد کو بھیجا گیا، جہاں ان حضرات نے مقامی لب ولہجہ اور طرز ادا کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن پاک کو ویسے ہی سکھایا جیسا کہ خود درسگاہ نبوت سے سیکھا تھا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ قراءات قرآنیہ رسم کے تابع نہیں بلکہ نقل کے تابع ہیں، کیونکہ اگر رسم کے تابع ہوتیں تو تمام ممکنہ قراءات بھی درست ہونا چاہیے جن کا احتمال موجود ہو، جیسے مذکورہ سابقہ مثالوں میں "إياه" کی جگہ "أباه" اور "تستكبرون" کی جگہ "تستكثرون"

بھی درست ہونا چاہئے تھا،لیکن جوقراءت موافق رسم تو ہولیکن منقول نہ ہووہ لازمی طور پر مردود وغیرصحیح قراردی جائے گی اور جان بوجھ کراس کو پڑھنے والا یا قراءات صحیحہ میں سے تصور کرنے والا کافر سمجھا جائے گا۔

اس موقع پر ہم یہ سوال کرنا چاہیں گے کہ موصوف مستشرق کا دعوی صحیح ہے تو ابن مجاہداور دیگر فقہاء وقضاۃ کرام کی مجلس میں ابن شنبوذ کوان قراءات سے توبہ کیوں کروائی گئی تھی جسے وہ پڑھتے تھے،اسی طرح بادشاہ وقت نے ابن مقسم (ت:۳۵۴ھ) کوفقہاء وقراء کی موجودگی میں توبہ کرنے کا حکم دیااوران کی توبہ کا باقاعدہ شاہی روزنامچہ میں اندراج کیا گیا، ان دونوں اہم واقعوں کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ابن مقسم کا نظریہ یہ تھا کہ ہروہ قراءت جومصحف کے موافق ہواور عربیت کے اعتبار سے بھی درست ہوتو اس کا پڑھنا درست ہوگا، چاہے سنداً وہ منقول نہ ہو۔ (رسم المصحف العثماني وأوهام المستشرقين في قراءات القرآن الكريم ،ص:۳۷ بحواله طبقات القراء:۲/۵٤،۱۲٤)

جبکہ ابن شنبوذ حروف قرآنی کو بدلتے تھےاور جس طرح قرآن نازل ہوا تھااس کے مخالف پڑھتے تھے، نیز سند ونقل پر اتنا اعتماد تھا کہ گرچہ وہ مصحف کے خلاف ہو،اسی پراعتبار کرتے تھے،البتہ دونوں میں ایک بات مشترک تھی کہ دونوں عربیت کے قواعد کے رو سے اس لفظ کا صحیح ہونا ضروری سمجھتے تھے،غورطلب بات یہ ہے کہ دونوں کا موقف الگ الگ تھالیکن دونوں کوغلط سمجھا گیااوران سے توبہ کروائی گئی۔

ان دونوں واقعات کے پیش نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ کلام الٰہی میں مختلف قراءتوں کا ہونا محض عربیت میں درست ہونے پر منحصر نہیں تھا بلکہ سنت رسول اللہ ﷺ سے

تواتر سے اس کا ثابت ومنقول ہونا بھی ضروری تھا کہ اس کے بغیر کسی بھی قراءت کو سند صحت نہیں دی جاسکتی ہے۔ (رسم المصحف العثمانی وأوهام المستشريقين في قراء ات القرآن الكريم ،ص:۳۷ بحواله وفيات الأعيان: ۳۲۶/۳وطبقات القراء :۵٤/۲)

اسی طرح گولڈزیہر کا یہ کہنا کہ الفاظ قرآنیہ نقطوں اور حرکات سے عاری تھے جس کی بناء پر قراءات میں اختلاف واقع ہوا یہ بھی درست نہیں ہے، ذرا دیکھیں کہ امام لغت امام کسائی لفظ "الرضاعة" میں راء پر کسرہ نقل کرتے ہیں لیکن ان کی قراءت میں اسے بفتح الراء ہی پڑھا جاتا ہے، اسی طرح لفظ "محیض" بالحاء اور "مجیض" بالجیم رسم اور معنی بہر دو اعتبار ایک جیسے ہیں، لیکن کسی نے بھی جیم کے ساتھ اسے ذکر نہیں کیا ہے۔ (رسم المصحف العثمانی وأوهام المستشرقين في قراء ات القرآن الكريم،ص: ۵۰ بحواله معانی القرآن للزجاج)

الغرض مذکورہ بالا سطور میں بیان کردہ مثالوں اور حقائق کی روشنی میں بآسانی یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ یہودیت کے زہر سے لبریز دماغ کے حامل مستشرق نے کس قسم کی بدباطنی کا اظہار کیا ہے، اور اس پر کسی طرح کا تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن کریم خود کہہ چکا ہے:" قد بدت البغضاء من أفواههم ، وما تخفي صدورهم أكبر".

مصاحف عثمانیہ کی تعداد :

حضرت عثمانؓ نے کتنے مصاحف تیار کروائے تھے اس میں مختلف اقوال ہیں، چار سے لے کر آٹھ تک کے اقوال ملتے ہیں، امام رجراجی (ت:۸۹۹ھ) فرماتے ہیں:

"والمشهور الذي عليه الجمهور أربع نسخ، إحداها إلى المدينة، وأخرىٰ إلى

البصرة، وأخرىٰ إلى الكوفة، وأخرىٰ إلى الشام". (مقدمة مختصر التبيين: ١/ ١٣٩ بحواله تبنيه العطشان: ص/١٧، و"المصاحف":٤٣و "الإتقان:١/١٧١) **ابوعبید قاسم بن سلام (ت:۲۳۴ھ)** کی رائے یہ ہے کہ آٹھ مصحف تھے، اسی کو امام شاطبی نے بھی اس طرح ذکر کیا ہے:

وسارفي نسخ منها مع المدني

كوف، وشام وبصر تملأ البصرا

وقيل مكة والبحرين مع يمن

ضاعت بها نسخ في نشرها قطرا

(مختصر التبيين: ١/١٣٩ بحواله الوسيلة للسخاوى: ١٧، الدرة: ١١)

جبکہ مکی بن ابی طالب کہتے ہیں: "فلما نسخوا المصحف كتبوه في سبع نسخ، وقيل: في خمس، ورواة الأول أكثر". (مختصر التبيين: ١/١٣٩، بحواله: الإبانة عن معاني القراءت: ٦٥و فتح المنان: ١١) **ابوعمرو دانی (ت:۴۴۴ھ) فرماتے ہیں:** "أكثر العلماء على أن عثمان بن عفان لما كتب المصحف جعله أربع نسخ، وقيل: إنه جعله في سبع نسخ، ثم قال: والأول أصح وعليه الأئمة". (مختصر التبيين: ١/١٤٠ بحواله: المقنع للداني: ٩) **علامہ ابن حجرؒ (ت:۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:** "فالمشهور أنها خمسة". (مختصر التبيين: ١/١٤٠ بحواله فتح الباري: ٩/٢٠، الكواكب الدرية: ٢٦) **اورعلامہ جعبری لکھتے ہیں:** "خمسة متفق عليها، وثلاث مختلف فيها". (مختصر التبيين: ١/١٤١ بحواله: الجميلة للجعبری ص: ٢٨) **لیکن صحیح قول یہی ہے کہ مصاحف کی تعداد چھ تھی، جیسا کہ علامہ سخاویؒ**

(ت:۶۴۳ھ) لکھتے ہیں: " أنها ستة مصاحف ، فأما مصحف البحرين و مصحف اليمن فلم يعلم لهما خبر". (مختصر التبين:۱۴۱/۱۱ بحواله: الوسيلة ، ورقة:۱۷، الإعلان لابن عاشر، ص:٥٤) اور علماء رسم کے درمیان یہی قول راجح ہے جیسا کہ شیخ رضوان مخللاتی لکھتے ہیں: "وعدة المصاحف على معتمد الأقوال فيها ستة ، كما يشهد له الاستقراء". (مختصر التبيين : ۱/ ۱۴۱ بحواله مقدمة في الرسم والضبط ،ص:٦٧)

بہرحال، اس طرح کل چھ مصاحف تیار کیے گئے اور ان کی تقسیم اس طرح ہوئی:

(۱) المصحف الإمام: جسے حضرت عثمانؓ نے اپنے پاس رکھا تھا اور اپنے لیے ہی تیار کروایا تھا، امام مالک اور ابو جعفر بن النحاس کی رائے یہ ہے کہ اب اس مصحف کی کوئی خبر نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے، جبکہ ابن قتیبہ کا کہنا ہے کہ وہ مصحف شہادت عثمانؓ کے موقع پر ان کی گود میں تھا، اور پھر ان کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا، اسی طرح ابو عبید قاسم بن سلام کہتے ہیں کہ مصحف امام کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، بلکہ سورۂ نجم میں خاص طور سے خون کے نشانات بھی میں نے دیکھے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مصحف امام کی موجودگی کا امکان ضرور ہے، اور سراسر اس کے وجود کا انکار کرنا مناسب نہیں ہے۔ (دیکھیے: مختصر التبيين : ۱۴۲/۱)

یہی وجہ ہے کہ علامہ دانی نے اپنی کتاب "المقنع" میں اور ابوداود سلیمان بن نجاح نے اپنی کتاب "مختصر التبيين لهجاء التنزيل" میں ابو عبید قاسم بن سلام کے حوالہ سے مصحف امام کی بہت سی باتیں نقل کی ہیں کہ ابو عبید نے اسے دیکھا بھی ہے، اس میں سے پڑھا بھی ہے اور اس کے حروف وطرز تحریر کو بیان بھی کیا ہے، اور صرف ابو عبید ہی نہیں بلکہ دیگر علماء جیسے عاصم الجحدری (ت:۱۲۸ھ)، خالد بن خداش (ت:۲۲۴ھ) وغیرہ نے بھی مصحف امام کو دیکھنے کی صراحت کی ہے۔ (مختصر التبيين ۱۴۳/۱۱، بحواله: المقنع للداني:۱۵، ۱۶، ۳۵ وغیرہ)

(٢) المصحف المدني : جسے حضرت عثمانؓ نے اہل مدینہ کے لیے تیار کروایا تھا، اوراسی مصحف سے امام نافع بن اَبی نعیم (ت:١٦٩ھ) قراءت نقل فرماتے ہیں، جبکہ ابوعبید قاسم بن سلام مصحف اِمام سے نقل فرماتے تھے۔ امام شاطبیؒ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وبـيـن نافعهم في رسمهم ، وأبي – عبيد الخلف في بعض الذي أثرا

ولا تعارض مع حسن الظنون فطب – صدراً رجيباً بما عن كلهم صدرا

(مختصر التبيين: ١٤٤/١ بحواله تلخيص الفوائد :١٨)

واضح رہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ اس مصحف مدنی کے مطابق اہل مدینہ کو قرآن پڑھانے پر مأمور تھے۔

(٣) المصحف المكي: حضرت عبداللہ بن السائب کو یہ مصحف دے کر مکۃ المکرّمہ بھیجا گیا تھا، اس مصحف سے ایوب بن المتوکل (ت: ٢٠٠ھ)، یحیٰی بن المبارک الیزیدی (ت:٢٠٢ھ)، ابوحاتم سہل بن محمد (ت:٢٥٥ھ)، خلف بن ہشام البزار (ت: ٢٢٩ھ) اور دیگر حضرات نقل کرتے ہیں۔ (مختصر التبيين : ١٤٤/١ بحواله المقنع للداني : ٢٩، ٤١، ٦٦، ١٠٧، ١١٠، ١١٢، ١١٤)

(٥) المصحف الشامی : اہل شام کی جانب حضرت مغیرہ بن شہاب کو یہ مصحف دے کر روانہ کیا گیا تھا، علامہ سخاویؒ (ت:٦٤٣ھ) نے عقیلہ کی شرح میں اس کا دسیوں جگہ تذکرہ کیا ہے، جبکہ حافظ ابن کثیر (ت:٧٧٤ھ) اور حافظ ابن الجزري (ت:٨٣٣ھ) نے دمشق کی مسجد اُموی میں اس کی زیارت بھی کی ہے، نیز علامہ دانی کی

''المقنع''اورابوداود کی ''مختصر التبیین''میں کئی جگہ اس کا حوالہ ملتا ہے۔(مقدمہ مختصر التبیین:۱/۱۴۴)

(٦) المصحف البصری: اہل بصرہ کی تعلیم کے لیے حضرت عامر بن عبد قیسؓ کو یہ مصحف دے کر روانہ کیا گیا تھا۔ "المقنع"، "مختصر التبيين" اور دیگر کتب میں ان دونوں مصاحف کے حوالے کئی جگہ ملتے ہیں۔

لگے ہاتھوں اس بات کو ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا کہ جس زمانہ میں مذکورہ مصاحف دے کر صحابہ کرام کو روانہ کیا گیا اس دور میں حفاظ کرام کی ایک معتد بہ تعداد موجود تھی، چنانچہ مدینہ منورہ میں: سعید ابن المسیب، عروۃ بن الزبیر، سالم، عمر بن عبدالعزیز، سلیمان بن یسار، عطاء بن یسار، عبدالرحمٰن بن ہرمز، ابن شہاب، مسلم بن جندب اور زید بن اسلم وغیرہ۔ مکۃ المکرّمہ میں: عبید اللہ بن عمیر، عطاء، طاؤس، مجاہد، عکرمہ اور ابن ابی ملیکہ وغیرہ۔ کوفہ میں: علقمہ، اسود، مسروق، عبیدہ، ابن ترجیل، حارث بن قیس، ربیع بن خثیم، زر بن حبیش، سعید بن جبیر، نخعی و شعبی وغیرہ۔ بصرہ میں: عامر بن قیس، ابوالعالیہ، ابورجاء، نصر بن عاصم، یحییٰ بن یعمر، جابر بن زید، حسن بصری، ابن سیرین اور قتادہ وغیرہ۔ اور شام میں: خلید بن سعید وغیرہ موجود تھے۔

چنانچہ جب یہ صحابہ کرام مصاحف عثمانیہ لے کر مختلف علاقوں میں پہونچے تو وہاں موجود لوگوں نے اسی مصحف کے مطابق قرآن کریم کو لکھنا شروع کیا، جس میں وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کو ملا کر دیکھتے اور اس مصحف کے مطابق ہی لکھتے؛ پھر یہی خط عثمانی ایک اصول کی حیثیت اختیار کر گیا اور جو دیگر قرآنی نسخے پہلے سے موجود تھے وہ جلا دیئے گئے؛ تاکہ پھر اختلاف پیدا نہ ہو، اس طرح رسم عثمانی کے مطابق جو لفظ جس طرح لکھا گیا تھا اسے اسی

کے مطابق لکھا جانے لگا، اور تب ہی سے ''علم رسم'' یا ''رسم عثمانی'' نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کی ہے، جس کا بنیادی مأخذ وہ تمام مصاحف ہیں جو حضرت عثمانؓ نے مختلف علاقوں میں بھیجے تھے۔

عصر حاضر اور مصاحف عثمانیہ:

حضرت عثمانؓ نے جو مصاحف تیار کروائے تھے آج وہ باقی ہیں یا نہیں؟ اور اگر ہیں تو کہاں ہیں؟ اس سلسلہ میں تاریخی شواہد کافی پراگندہ ہیں۔ علمی کتابوں پر مشتمل مشہور ویب سائٹ ''المكتبة الشاملة'' پر عوض أحمد الناشري الشهري (عميد كلية الشريعة وأصول الدين ،جامعة الملك خالد ،أبهاء) کا "المصحف العثماني" کے عنوان سے مقالہ موجود ہے، جس میں موصوف نے ''دکتورہ سحر السید'' کے حوالے سے اس موضوع پر مفید بحث کی ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

دکتورہ سحر السید لکھتی ہیں کہ مصحف عثمانی کا وہ نسخہ جو وقتِ شہادت آپ کے پاس تھا اس کے متعلق مختلف رائیں اور دعوے ظاہر ہوتے رہے ہیں، اور اس کی اہمیت وفضیلت کے پیش نظر بہت سی جامع مسجدوں کی جانب سے یہ دعوی کیا گیا کہ وہ مصحف ان کی تحویل میں ہے، جس کی وجہ سے تعیین کرنے اور اس مصحف کا صحیح مرجع متعین کرنے میں کافی دقت ہوئی ہے، پھر موصوفہ نے اس طرح کے پانچ دعوے ذکر کیے: (۱) مصحف ِامام قاہرہ میں ہے۔ (۲) بصرہ میں ہے۔ (۳) تاشقند میں ہے۔ (۴) حمص میں ہے۔ (۵) استنبول کے مشہور ''طوپ کاپی'' میوزیم میں ہے۔

پھر خود ان دعووں کا جواب دیتی ہوئی کہتی ہیں کہ جامعہ قرطبہ میں جو مصحف محفوظ

تھا وہ حضرت عثمانؓ کا مکمل مصحف نہیں بلکہ اس مصحف کے صرف چار اوراق اس میں شامل تھے جبکہ بقیہ اوراق مصحف عثمانی کے طرز پر لکھ کر اس سے ملحق کیے گئے تھے، یہی مصحف حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ منتقل ہوتا رہا، بالآخر ''موحدین'' کے اور ان کے بعد ''مرینیین'' کے قبضہ میں آیا، اور جب ''مرینیین'' کو پرتگالیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو وہ مصحف بھی پرتگالیوں کے قبضہ میں چلا گیا، جسے بعد میں مرینی بادشاہ نے ۷۴۵ھ میں لاکھوں دینار کے بدلہ میں حاصل کیا۔ پھر یہ مصحف دوبارہ ''فرانس'' لایا گیا لیکن اس شکل میں کہ پرتگالیوں نے اس کے غلاف پر لگے ہوئے جواہرات نکال دیئے تھے اور اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا، اسی حالت میں وہ ''مرینیین'' کے خزانہ میں رہا، اور اس کے بعد کی تاریخ بالکل تاریک ہے کہ اس کا کیا بنا۔

شیخ عوض الناشري، دکتورہ سحر کا یہ کلام نقل کرنے کے بعد اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دکتورہ سحر نے آٹھویں صدی ہجری کے حالات بیان کیے ہیں، جبکہ مصاحف قرآنیہ کے باخبر افراد کی ایک جماعت اس بات پر متفق ہے کہ مصاحف عثمانیہ میں سے ایک مصحف چودہویں صدی ہجری کے اوائل تک جامع اموی میں محفوظ تھا، ۱۳۱۰ھ میں جامع اموی میں آگ لگنے کا جو دلدوز واقعہ پیش آیا اس میں وہ نسخہ بھی شہید ہو گیا، کہا جاتا ہے کہ اس کو استنبول منتقل کر دیا گیا تھا، ایک قول یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ مصر کے کسی مکتبہ میں وہ محفوظ ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اس تفصیل کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ دکتور محمد الصباغ ، دکتور صبحي اور فہد رومی و دکتور مناع القطان نے بھی اس بحث کو نقل کیا ہے۔

اپنی گفتگو ختم کرنے سے قبل موصوف نے دکتور غانم قدوری کا فیصلہ کن کلام نقل کیا ہے جس میں ان کا کہنا ہے کہ اکثر محققین کی رائے یہی ہے کہ مصاحف عثمانیہ کا آج پایا جانا متعذر رہے، کیوں کہ قرن اول یا قرن ثانی میں لکھے گئے کسی مصحف کے وجود کا دعویٰ کرنے کے لئے تاریخی شواہد کی اشد ضرورت رہتی ہے، مزید لکھتے ہیں کہ مصاحف عثمانیہ کا معدوم ہو جانا چنداں مضر نہیں ہے؛ کیوں کہ حضور اقدس ﷺ سے لے کر آج تک قرآن پاک ثقہ حضرات کے واسطوں سے بلفظہ منقول ہوا ہے، جس کی وجہ سے ان مصاحف کا نہ پایا جانا کوئی نقص پیدا نہیں کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لیے دکتور غانم قدوری کی "رسم المصحف دراسة لغوية وتاريخية"، دکتورہ سحر السید کی "أضواء على مصحف عثمان بن عفان"، علی محمد الضباع کی "سمير الطالبين" اور علامہ زرقانی کی "مناهل العرفان" کا مطالعہ مفید رہے گا۔

مصحف عثمانی سے متعلق اہم تحقیق:

قاضی اطہر مبارکپوریؒ نے اپنے تحقیقی مقالات کے مجموعہ "مآثر و معارف" (مطبوعہ: ۱۹۷۱ء، ندوۃ المصنفين، دھلی) میں مصحف عثمانی سے متعلق ایک مبسوط و تحقیقی مضمون "مصحف عثمانی کا ایک مطبوعہ ٹکرا-سورہ یٰس" کے عنوان سے سپرد قرطاس فرمایا ہے، جس میں موصوف نے مصحف عثمانی کے متعلق کچھ اہم معلومات درج کی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مصحف عثمانی زار روس کے زمانہ میں روس کے مشہور شہر پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانہ میں موجود تھا، ۱۹۰۵ء میں روسی عالم عبداللہ بن الیاس بن احمد شاہ بورغانی قریمیؒ نے اس صحیفہ سے

سورہ یاسین کی فوٹو کاپی لے کر طبع کروائی تھی، ہندوستان میں اس کی ایک کاپی بمبئی کے تاجر الحاج احمد غریب صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں ۱۹۵۷ء تک موجود تھی، سورۂ یٰس کا یہ نسخہ ۲۲/صفحات پر مشتمل ہے جس میں جدول کے اندر کی چوڑائی ۹½ انچ اور لمبائی ۱۰½ انچ ہے، ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں، اس نسخے کے آخر میں ترکستانی زبان میں ایک تحریر ہے جس میں ناشر (مذکورہ بالا روسی عالم) نے نسخے سے متعلق اور اس کی حصولیابی کی کوششوں سے متعلق گفتگو کی ہے، نیز وضاحت کی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے موقع پر جو مصحف آپؓ کی گود میں تھا وہ یہی تھا، یہی وجہ ہے کہ آیت: "فسیکفیکھم اللہ" پر شہید امت حضرت عثمان غنیؓ کے خون مبارک کے نشانات آج بھی باقی ہیں، اس نسخہ کو چمڑے پر خط کوفی میں لکھا گیا ہے اور پورے کلام اللہ کے صفحات کی تعداد ۶۰۷ ہے۔

اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ روس کے شہر پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانہ میں ۱۹۰۵ء تک مصحف عثمانی کا وجود تھا، ممکن ہے کہ انقلاب روس کے بعد وہ نسخہ کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہو، جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ''ڈرہم یونیورسٹی'' میں اس نسخہ کی موجودگی کا اظہار کیا ہے۔

پھر قاضی صاحب مزید تفصیلات فراہم کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اپریل ۱۹۶۱ء کے ''معارف'' میں مصحف عثمانی سے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ان میں سب سے مستند اطلاع وہ ہے جو ہندوستان میں موجود روسی سفارتخانہ کے حکومتی رسالہ میں شائع ہوئی تھی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ مصحف کسی زمانہ میں تیمور بادشاہ کے کتب خانہ میں تھا پھر یہاں سے سمرقند کی ''مسجد احرار'' میں منتقل ہوا، ۱۸۱۸ء میں جب روس نے بخارا پر قبضہ کیا تو روسی

جنرل ''وان کاف مان (اول)'' نے اس مصحف کو معمولی قیمت میں خرید کر سینٹ پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانہ میں داخل کروادیا، ۱۹۱۷ء میں واقع ہونے والے انقلاب کے بعد مسلمانوں نے اس کا مطالبہ کیا، جس کی بناء پر ''لینن'' نے واپس دے دیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ اب یہ نسخہ تاشقند میں ہے، جبکہ مولانا امتیاز صاحب عرشی رامپوری کا کہنا ہے کہ وہ اس کی فوٹو کاپی ہے، اصل نسخہ نہیں ہے جس کی وہ ۱۹۵۸ء میں سفر روس کے دوران زیارت کر چکے ہیں۔

قاضی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ اسی دوران اگست ۱۹۶۱ء کے ''معارف'' میں مصحف عثمانی سے متعلق ایک عینی شہادت کے عنوان سے مضمون شائع ہوا، جو بقول قاضی صاحب سب سے مفصل اور جامع ہے، یہ مضمون دراصل مشہور ترقی پسند شاعر ''علی سردار جعفری'' کے سفر روس کے دوران اس مبارک مصحف کی زیارت کا تذکرہ ہے، جعفری صاحب کہتے ہیں کہ گویہ مصحف عام طور سے لوگوں کو دکھایا نہیں جاتا ہے، لیکن ازبکستان کے کچھ دوستوں کی مہربانی سے مجھے آج (۲۸/اپریل ۱۹۶۱ء) اس کی زیارت کی اجازت مل گئی، کیمرہ میرے ساتھ تھا لیکن تصویر لینے کی اجازت نہیں تھی، البتہ وعدہ ضرور کیا گیا تھا کہ روسی سفارتخانہ کے توسط سے اس کے کچھ صفحات کا عکس یا مائکروفلم مجھے بھیج دیا جائے گا، جعفری صاحب کے بموجب یہ مصحف ۶۸×۵۳ سینٹی میٹر کے ۳۵۳ صفحات پر مشتمل ہے جس کی خط کوفی میں کتابت کی گئی ہے، خون کے دھبے ابھی تک موجود ہیں چونکہ تحریر کے لیے ہرن کی کھال کا نہایت موٹا چمڑا استعمال کیا گیا اس لیے صفحات کا رنگ ایک طرف سے ہلکا زرد اور دوسری طرف سے سفید ہے، جعفری صاحب کہتے ہیں کہ میوزیم کی ڈائریکٹر ''نفیسہ صادق'' نے انہیں بتایا کہ صفحات اور خون

کے دھبوں کی کیمیکل کے ذریعہ جانچ کی گئی، جس سے اس کے قدیم ہونے کا اندازہ درست نکلا، موصوفہ ہی کے بیان کے مطابق اس مصحف کے علاوہ تین نسخے خط کوفی ہی میں اور بھی تھے، لیکن اب وہ نایاب ہیں، صرف چند صفحات برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہیں۔

یہی موصوفہ دیگر تفصیلات بیان کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ یہ مصحف مبارک چودھویں، پندرہویں صدی عیسوی تک سلاطین ترکی کے قبضہ میں تھا، قسطنطنیہ سے تیمور لنگ اسے سمرقند لے گئے، جبکہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سمرقند کے ایک بزرگ شخص ''خواجہ احرار'' کے مریدوں میں سے کسی مرید کے ذریعہ وہ سمرقند پہونچا، پھر انیسویں صدی عیسوی میں جب ترکستان کے علاقے روسی سلطنت میں شامل کر لیے گئے تو ۱۸۶۳ء میں اسی علاقے کے گورنر کی نظر خواجہ احرار کی مسجد میں موجود مصحف عثمانی پر پڑی، چنانچہ اس نے مسجد کے لیے سو روبل دیئے اور مصحف عثمانی کو سینٹ پیٹرس برگ کے کتب خانہ میں بھیج دیا، ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کے بعد ''لینن'' نے یہ مصحف مشرقی مسلمانوں کے حوالہ کر دیا، اس طرح یہ مصحف مقدس ''لینن گراڈ'' سے پہلے تاتاریہ کے علاقہ میں آیا، پھر وہاں سے تاشقند کی انقلابی حکومتوں کے یہاں پہونچا، اور اب ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند کے تاریخی میوزیم میں محفوظ ہے۔

قاضی اطہر صاحب، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب، علی سردار جعفری صاحب اور میوزیم کی ڈائرکٹر محترمہ نفیسہ صادق صاحبہ کی مذکورہ بالا وضاحت سے اتنی حقیقت تو یقیناً آشکارا ہو جاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے موقع پر موجود مصحف مبارک ۱۹۶۱ء تک ایسی حالت میں موجود تھا کہ اسے دیکھ کر نگاہ قلب کو تسکین بخشی جا سکے، رب جبریل سے امید ہے کہ جس طرح

وہ کلام پاک کو سینوں میں محفوظ کروا کر اپنے کلام کی حفاظت کر رہے ہیں اسی طرح حضرت عثمانؓ کے بے بدل خون کے مقدس قطرے اپنے اندر سموئے ہوئے اس مصحف کی بھی حفاظت کرے، کہ اس کی برکتیں سرمۂ دل وراحت جان ہیں۔ وما ذلك على الله بعزيز .

(اس مضمون کو مکمل پڑھنے کے لیے دیکھیے :معارف وآثر از قاضی اطہر مبارکپوری صاحب ،ط:مارچ ۱۹۷۱ء ندوة المصنفین ، دہلی ،ص:۲۲۷-۲۳۴، بعنوان ''مصحف عثمانی کا ایک مطبوعہ ٹکڑا: سورۂ یسین'')

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

نوٹ:- اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

نمبر	اسماء کتب	اسماء مصنفین	مطبع
١	مقدمۂ مختصر التبيين لهجاء التنزيل	ابوداود سليمان بن نجاح بتحقيق : دكتور احمد بن احمد بن معمر شرشال	مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف
٢	نثر المرجان في رسم نظم القرآن	علامه محمد غوث نائطي	مطبعۂ عثمان پريس، حيدرآباد دكن
٣	مقدمۂ الوسيلة إلى كشف العقيلة	علامه سخاوى بتحقيق مولاي محمد الإدريسى الطاهرى	مكتبة الرشد، الرياض
٤	رسم المصحف العثماني وأوهام المستشرقين في قراءات القرآن الكريم -دوافعها ودفعها-	دكتور عبدالفتاح اسماعيل شلبى، أم القرىٰ	مكتبة وهبة، القاهرة

٥	المصحف العثماني	عوض احمد الناشري	المكتبة الشاملة
٦	الاتقان في علوم القرآن (ج:٤)	علامه سيوطى	مكتبة نزار مصطفى الباز، الرياض
۷	اسلامی فقہ اکیڈمی مکۃ المکرّمہ کے فقہی فیصلے	–	ایفا پبلیکیشنز، دہلی
۸	الشفاء	قاضی عیاضؒ	فاروقی کتبخانہ، ملتان
۹	قرآنی املاء اور رسم الخط	قاری ابوالحسن صاحب اعظمی	مکتبہ صحت القرآن، دیوبند
۱۰	معارف ومآثر (مارچ ۱۹۷۱ء)	قاضی اطہر مبارک پوری	ندوۃ المصنفین، دہلی
۱۱	فتح الباري	ابن حجر العسقلانی	دار الفکر، بیروت
۱۲	تفسیر طبری	علامہ طبریؒ	دار الفکر، بیروت

نیز انٹرنیٹ پر موجود دیگر کتب قراءات و رسم الخط سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

❖❖❖

مسئلۂ ختم نبوت
اور حضرت نانوتویؒ کی خدمات

حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم دیوبند (وقف) کی طرف سے ''امام محمد قاسم النانوتوی، فکر، فلسفہ، تجدید دین اور تحریکات'' کے عنوان سے محرم الحرام ۱۴۳۸ھ میں ایک سیمینار کا انعقاد ہونے جارہا ہے، اس نسبت سے سیمینار کے مختلف عناوین میں سے ایک عنوان بندہ کے نام موصول ہوا، لہذا تعیین شدہ عنوان ''مسئلۂ ختم نبوت اور حضرت نانوتوی کی خدمات'' پر یہ نقوش ثبت کرکے آپ کی اس نوع کی خدمات کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی۔

مسئلۂ ختم نبوت اور حضرت نانوتویؒ کی خدمات

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله واصحابه اجمعین.

تمام انسان، ایک ماں باپ آدم وحوّا کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ رشتے میں مربوط ہیں، اُخوّت و بھائی چارگی کے اس قریب ترین رشتے کا تقاضا ہے کہ ہر انسان کے دل میں دوسروں کے لیے مُروّت اور ہم دردی کا بھرپور جذبہ موجزن ہو، اور بہ وقت ضرورت ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کا برتاؤ کر کے اس کا عملی شکل میں اظہار بھی کیا جائے، خیر خواہانہ جذبے کا یہی انسانی فریضہ ان تحریروں کا اصل مُحرِّک ہے۔

حضرت نانوتویؒ نے دینیات، مذہبی افکار وعقائد اور عبادات وتعلیمات کی رو سے، ٹھوس عقلی اور منطقی دلائل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد جس مذہب اور نظریۂ حیات کو برحق سمجھا اس کا اعلان واظہار پوری قوت کے ساتھ اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں کر دیا ہے، تاکہ اگر کوئی گم کردہ راہ باطل کے اندھیرے میں بھٹک رہا ہو تو حق کی روشنی پا کر وہ خود کو صراطِ مستقیم پر لگا دے، اور اگر کوئی خوش قسمت پہلے سے ہی راہ حق پر گام زن ہو تو تحریر وتقریر اس کے ایمان اور عزم وارادے کی مزید پختگی کے لیے مہمیز کا کام دیں۔

کسی بھی مذہب کی حقانیت وصداقت ثابت کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ نفس ''مذہب'' کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کیا ہے، مذاہب کا وجود کیوں ضروری

ہے اور یہ کہ ان کا تعلق براہ راست انسان کے مقصد تخلیق سے ہے یا نہیں؟ گویا سب سے پہلا حل طلب سوال خود انسانی وجود کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کیا مصرف ومقصد ہے؟ جب تک یہ سوال حل نہ ہواس وقت تک کسی مذہب کے صحیح اور غلط ہونے کا قطعی فیصلہ نہیں ہوسکتا، اسی وجہ سے حضرت نانوتویؒ نے سب سے پہلے اسی اہم سوال کو حل کیا ہے، تا کہ اس کے بعد تسلیم کے ساتھ جب توحید ورسالت وغیرہ عقائد اور دیگر تعلیمات کو کسی دین ومذہب کی روشنی میں ثابت کیا جائے تو قارئین وسامعین انہیں ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار ہوں اور اس بارے میں ان کو کوئی الجھن پیش نہ آئے۔

حضرت نانوتویؒ نے مختلف تحریرات میں انسان کا مقصد تخلیق واضح کرنے کے بعد توحید ورسالت جیسے موضوعات کو بھی منطقی وعقلی دلائل سے واضح کئے ہیں، اس کے علاوہ قرآن اور دیگر علمی، عملی اور اخلاقی معجزات کی رو سے حضور ﷺ کی دوسرے انبیاء ورسل پر افضلیت وبرتری اس انداز سے ثابت کی ہے کہ منطقی نتیجے کے طور پر آپ ﷺ کے ختم نبوت کا اسلامی عقیدہ بھی صحیح طور پر ثابت ہوجاتا ہے اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جس طرح آپ افضل الانبیاء ہیں اسی طرح آپ خاتم النبیین بھی ہیں۔

اس پر وضاحت سے پہلے یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ دین عقیدہ وعمل کے مجموعہ کا نام ہے، عقیدہ سے عمل کا وجود ہوتا ہے اور عمل سے عقیدہ کا رسوخ ہوتا ہے؛ جیسے درخت کے بیج سے شاخوں اور برگ وبر کا وجود ہوتا ہے اور پھر شاخیں جوں جوں پھیلتی اور بڑھتی ہیں جڑ کا رسوخ اور اندرونی پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے، مجموعۂ عقائد کا نام ایمان ہے اور مجموعۂ عمل کا نام اسلام اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام دین ہے، ایمان تخم کی طرح دل کی گہرائیوں میں مخفی رہتا

ہے، جسے عقل وبصیرت کی آنکھ دیکھتی ہے اور اسلام برگ وبار کی طرح فضاء میں پھیلا ہوا ہوتا ہے جو سر کی آنکھ سے نظر آتا ہے، حدیث نبوی میں اس حقیقت کو اس طرح واشگاف فرمایا گیا ہے کہ الایمان سِرٌّ والاسلام عَلَانِیَۃٌ ایمان (دل میں) چھپی ہوئی چیز ہے اور اسلام (ہاتھ پیر پر) کھلی ہوئی چیز ہے۔

ایمانی عقائد اعمال کے ردّ وقبول کا بھی معیار ہیں کہ ان کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی رد، نا قابل قبول اور اکارت ہے اور یہی کسی مذہب کے حق وباطل کے پہچاننے کا بھی معیار ہیں، کیونکہ اساسی عقائد ہر مذہب میں گِنے چُنے چند ہی ہوتے ہیں، لمبا چوڑا قصہ نہیں ہوتا جس کی تحقیق دشوار ہو، اس لئے کسی دین کے سمجھنے یا قبول کرنے کا مختصر راستہ اس کے عقائد ہی کا دیکھنا ہے، کہ وہ مخالف عقل تو نہیں ہیں، نیز صاحبِ شریعت تک ان کی سند بھی متصل ہے یا نہیں؟

قرآنِ حکیم نے دین وایمان کے بارے میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے جس کی جیتی جاگتی تصویر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا وجود اور ان کا مثالی ایمان ہے جو صاحب شریعت کے سامنے حاضر رہ کر بھی اپنے ایمان کو تحقیقی بنا کر ہی دل میں جگہ دیئے ہوئے تھے، قرآنِ حکیم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:

اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ (یوسف:۱۰۸)

(ترجمہ) بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے، اور میں نہیں شریک بتانے والوں میں سے۔

اس کلام خداوندی سے ظاہر ہے کہ ایمان خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی ،اس کی بنیاد بصیرت و تحقیق پر ہوتی ہے، گو اس کے درجات حسبِ استعداد متفاوت اور مختلف ہوں جس کا ثمرہ فراستِ ایمانی ہے جو ہر مؤمن کا طغرائے امتیاز ہوتی ہے،اسی لئے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا:

اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله .(سنن ترمذي : كتاب تفسير القرآن ،باب:١٦،حديث : ٣١٢٧،ص:٢٨٧،ج:٥،ط:دارالكتب العلمية بيروت)

مؤمن کی فراست سے ڈرتے رہو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

جس سے صاف واضح ہے کہ مؤمن میں بقدر ایمان بصیرت وفراست اور نور حق کا وجود لازمی طور پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس حقیقت کا ثمرہ بصیرت ہو وہ وہی ایمانِ تحقیقی ہے نہ کہ سناسنایا ایمان ۔اسی لئے اس دین میں عقل وبصیرت کی عظمت وفضیلت بیان فرما کر گویا اس کی دعوت دی گئی ہے اور اسی لئے قرآنِ حکیم نے جگہ جگہ آیاتِ الٰہی میں غور وفکر اور تدبر وتذکر اور حجت طلبی کی طرف بلایا ہے، جو دوسرے عنوان سے اسی بصیرت ویقین کے پیدا کئے جانے کا امر ہے۔

یہ فرق ضروری ہے کہ اسلام کے ابتدائی قرنِ خیر کے یہ لوگ (صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) اپنے صفاء ذہن ،سلامتیٔ عقل وفطرت ،قرب عہد نبوت ، فیضانِ صحبتِ نبوی ، قلتِ اختلاف اور براہِ راست صاحب نبوت سے کلامِ نبوت سننے کی وجہ سے اول مرحلہ ہی میں نور بصیرت کے بلند مقام پر پہونچ جاتے تھے جو سارے دلائل اور بصیرتوں کا نچوڑ تھا ،انہیں ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ نقل کے ساتھ مستقلاً عقلی دلائل کی تفتیش میں پڑ کر منقول

پر منطبق کرنے کی فکر میں پڑیں؛ جبکہ وہ نقل ووحی ہی فیضانِ صحبتِ نبوی سے ان پر عقل ومعرفت کے سارے دروازے کھول دیتی تھی، جس سے ان کا ایمان تحقیق اور عقل ونقل کے صحیح امتزاج سے جامع اور حقیقی ایمان بن جاتا تھا، لیکن زمانۂ نبوت سے جوں جوں بُعد ہوتا گیا اور فلسفیانہ موشگافیوں سے فتنۂ شبہات نے عقلِ نارسا کو آگے رکھ کر وحیٔ الٰہی کے راستوں میں مداخلت شروع کی جس سے سادہ لوح قلوب کی قوتِ یقین واذعان میں فرق آنے لگا تو ضرورت پڑی کہ ایمانوں میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے عقلی دلائل وبراہین کا ذخیرہ بھی مہیا کیا جائے اور دین کے جانباز سپاہیوں کو نقل کے ساتھ عقل صافی کے ہتھیاروں سے بھی مسلح کیا جائے جس سے وہ شک اندازوں کی مدافعت کرسکیں اور ان بندگان عقل پر بھی حجت تمام کی جاسکے اور ساتھ ہی اربابِ نقل وروایت کے لئے بھی ان عقلی حجتوں سے مبطلوں کے مقابلہ میں تسکین وتسلی کا سامان بہم پہونچایا جاسکے، ابتداءً فتنۂ تشکیک نے امہات عقائد اور اصول وکلیات دین کو فلسفیانہ اختراعات کی آماجگاہ بنایا اور ان کی اصولیت وکلیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مزعومات کے رنگ میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کیا، وہ عقل جو خادم وحی ونقل بنا کر دنیا میں اتاری گئی تھی اسے اصل قرار دے کر وحی الٰہی کی مرادوں میں ناجائز تصرفات ہونے لگے؛ جس سے اس باغی عقل کی بدولت مختلف فرق باطلہ روافض، خوارج، قدریہ، جبریہ اور معتزلہ نے جنم لیا اور دین کے نام پر کتنے ہی فرقے وجود میں آگئے جنہوں نے فتنۂ شکوک وشبہات کے بندسوت کھول دیئے اور امت کو جدال ونزاع کا شکار بنادیا، اس لئے اکابر سلف نے بالآخر عقائد واصولِ دین کی معقولیت کا پہلو واشگاف کرنے کے لئے قدم بڑھایا اور اصولِ دین کی گہرائیوں پر ضرورتِ حکمت کے

نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی راہیں ہموار کر دیں جو دین میں پہلے سے مرکوز تھیں۔

فلسفۂ جدید اور سائنس کے نئے نئے انکشافات سے- جن کی بنیاد مشاہدات پر تھی- دنیا عقلی نظریات اور معقولات سے گذر کر محسوسات کی گرفت میں آ گئی تو قدرتی طور پر پرانے نظریات میں انقلاب رونما ہوا۔

اس لئے اب وہی عقل پرست طبقہ حس پرستی کا شکار ہوا اور اس دور کی دنیا نظریاتی استدلال سے زیادہ حسیاتی اور مشاہداتی استدلال کی راہ پر آ گئی، اب اس کے یہاں کوئی شرعی دعویٰ اس وقت تک قابل سماعت نہیں رہا جب تک کہ وہ معقولات کے ساتھ محسوس شواہد سے محسوس کر کے نہ پیش کیا جائے اور روحانی معتقدات کی پشت پر مشاہداتی حجتیں نہ ہوں۔

بنابریں اسی خوگر محسوس طبقہ نے اسلامی حصار پر عقلی نظریات کے بجائے حسی مشاہدات اور طبعیاتی افکار سے حملے کرنے شروع کر دیئے، اس لئے ضرورت تھی کہ اب اسلامی مسائل کو نظریاتی لباس سے ملبوس کرنے سے زیادہ طبعیاتی رنگ کی قمیصوں میں ملبوس کر کے پیش کیا جائے اور طبعیاتی شکوک وشبہات کا جواب انہی طبعیاتی اکتشافات کے اصول سے دیا جائے۔

تو اس صدی کے اوائل میں حق تعالی کی فیاض قدرت نے شمس الاسلام حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی دار العلوم دیوبند کو اس دور کے طبعیاتی رنگ کے امراض اور جراثیم کے معالجہ کے لئے بطور طبیب اور مصلح امت کے نمایاں فرمایا اور آپ نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ ان بندگانِ سائنس ومشاہدات کے دماغوں کو انہیں کے

مسلمات سے جھنجھوڑا اوران کے دماغوں کا تنقیہ شروع فرمایا۔

حکمتِ قاسمیہ کے تمام اجزاء نے - جو حضرتِ والا کی تصانیف میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں- جہاں اسلامی حقائق پر گہری لِمّیاتی اور خالص عقلی دلائل کی روشنی ڈالی وہیں پورے زور اور قوت کے ساتھ ان حقائق کو آج کے محسوسات اور دورِ حاضر کے حسّی شواہد ونظائر سے بھی مدلل کر کے اس طرح پیش کیا کہ اسلام کے غیبی امور، شریعت کے بنیادی مقاصد اور دینِ فطرت کے مبانی واصول اس حسّیاتی رنگِ استدلال سے بالکل طبعی اور محسوس ومشاہد نظر آنے لگے، ذات وصفاتِ خداوندی، مبدا ومعاد، توحید ورسالت، عقائد وشرائع، برزخ اور قیامت، سزا وجزاء، حشر ونشر، وزن اعمال، میزانِ عمل، جنت ونار، ملائکہ وجنات، عرش وکرسی، لوح وقلم وغیرہ ان عقائد اور ان سے متعلقہ اعمال کا صفاتِ خداوندی سے ربط وعلاقہ، کلیات دین کے ساتھ فرعیات کا ارتباط، پھر شرائع وعقائد کی عقلی اور طبعی مصالح اس طبعیاتی طرزِ استدلال سے کچھ اس طرح واشگاف فرمائے کہ یہ سب امور فطرت اور طبیعت کا مقتضا محسوس ہونے لگے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتِ والا ان حقائق کو محض نظری دلائل کے زور سے جبری طور پر دل میں ٹھوسنا نہیں چاہتے بلکہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دین کے یہ تمام عقائد واحکام فطرت اور طبیعت کا تقاضا ہیں جن کا وجود اسی طرح قابل تسلیم ہے جیسے چمکتے ہوئے سورج کا وجود، جس سے ایک فہیم انسان جبری انداز سے نہیں بلکہ طبعی تقاضوں سے انہیں ماننے اور تسلیم کرنے کے لئے بطوع ورغبت جھکنے کے لئے تیار ہوجائے، حضرتِ والا کے اس نئے طرز اثبات سے اس پورے دین کا محض دین عقلی ہونا ہی نہیں بلکہ دینِ فطرت ہونا نمایاں ہوجاتا ہے جیسا کہ حضرت والا کی کتابوں میں ان کی تقریراتِ استدلال

سے واضح ہوتا ہے۔

آپ کا طرز بیان خالص استدلالی اور منطقی ہوتا ہے جو مطیع ومنکر دونوں کے لئے یکساں حجت ہو، حقائق سب کی سب منقول لیکن پیرایۂ بیان بلاحوالۂ نقل خالص معقول اور اس کے ساتھ فلسفیانہ اور سائنٹفک؛ گویا عقل وطبع دونوں کو صحیح معنیٰ میں حضرت نے دین کا ایک خدمت گار بنا کر دکھلا دیا ہے کہ فلسفہ اور سائنس سے جس دینی شعبہ کی چاہی خدمت لے لی، جس سے دین کی نسبت سے عقل وطبع دونوں کا موقف بھی خود بخود کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مضامین نہایت بلند پایہ، بہت گہرے اور علوم نہایت دقیق اور غامض ہیں لیکن طرزِ بیان نہایت شگفتہ اور سہل ہی نہیں بلکہ سہلِ ممتنع، مقدمات کی ترتیبِ طبعی کہ اہم سے اہم نتائج گویا خود بخود نکلنے کے لئے اُبھر رہے ہیں ،تقریر استدلالی، نہایت مرتب جو ذہن کو اپیل کرتی ہوئی اس کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے ،اور ساتھ ہی حضرتِ والا کا شاخ درشاخ بیان مسئلہ کے تمام شقوق وجوانب پر اتنا حاوی اور اس کے تمام گوشوں کا اس درجہ واشگاف کنندہ ہوتا ہے کہ اس سے سیکڑوں مثالیں حل ہوجاتی ہے۔ (حکمت قاسمیہ:۵-۲۰)

حضرت نانوتویؒ نے اپنے اسی انداز بیان سے ختم نبوت کے مسئلہ کو بھی واضح کیا ہے، کیونکہ ختم نبوت کا عقیدہ ان اجماعی عقائد میں سے ہے جو اسلام کے اصول اور ضروریات دین میں شمار کئے گئے ہیں اور عہد نبوت سے لے کر اس وقت تک ہر مسلمان اس پر ایمان رکھتا آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ بلاکسی تاویل وتخصیص کے خاتم النبیین ہیں اور یہ

مسئلہ قرآن کریم کی صریح آیات، احادیث متواترہ اوراجماع امت سے ثابت ہے۔

لیکن حضرتؒ کے دور میں عقل کے پرستاروں اور اسلام دشمن عناصر - جو کہ دوسرے ادیان کے مبلغین بھی تھے- نے عقل کی روشنی میں اسلامی عقائد پر اعتراضات کئے، ان کو عقلی اعتبار سے جواب دینا اوراس کے ساتھ سادہ لوح مسلمانوں کوان اعتراضات کی زد میں آنے سے بچانا بھی تھا، نیز اسلام کی حقانیت کو بھی ان مبلغین کے سامنے لانا تھا اس لئے حضرت نانوتویؒ نے اپنی تقاریر وتحریرات میں مختلف موضوعات کے ساتھ ختم نبوت کے مسئلہ کو بھی اس انداز میں واضح فرمایا کہ آپ کے بعد بھی آنے والی نسلوں کے سامنے یہ حجت وجوابات باقی رہے۔

تحریک تحفظ ختم نبوت میں حضرت نانوتویؒ کا کردار:

یہ تو حقیقت ہے کہ حضرتؒ کی کتابیں عام کتابوں سے مشکل ہیں مگر ایک بات ان کی کتابوں کو پڑھنے سے بآسانی سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت نے مسلمان تو مسلمان ؛ غیر مسلموں کو بھی اسلام کے بنیادی عقائد توحید ورسالت کو سمجھانے کے لئے شدید محنت کی ہے، بالخصوص آپ ﷺ کی عظمت اور ختم نبوت کو ثابت کرنے کے لئے جتنا کام حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے کیا اور جس انداز سے عقلی نقلی دلائل سے اس عقیدے کو ثابت کیا اور غیر مسلموں کے ساتھ تقریری وتحریری مباحثوں کے دوران اس کو منوایا ، راقم الحروف کے ناقص مطالعہ میں تاریخ اسلام میں کوئی عالم اس طرح کا نہیں گزرا۔

حضرت نانوتویؒ تحریک تحفظ ختم نبوت کے بانی:

مرزا قادیانی کا فتنہ مولانا کی وفات کے کئی سال بعد شروع ہوا، مولانا کی وفات

۱۲۹۷ھ کو ہوئی اور مرزا قادیانی پر سب سے پہلے کفر کا فتوی ۱۳۰۱ھ میں دیا گیا اور یہ فتوی علماء لدھیانہ نے دیا تھا (رئیس قادیان: ج:۲،ص:۱) اس کے بعد علماء نے اس فتنے کے رد کو اپنا مقصد بنالیا اور عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے زندگیاں وقف کردیں، اس موضوع پر کتابیں لکھیں، دلائل جمع کئے، اشکالات کے جوابات دیئے۔

حضرت نانوتویؒ کا ایک کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر اس زمانے میں کام کیا جب ہندوستان میں خود کو مسلمان کہنے والا کوئی شخص ختم نبوت کا منکر نہ تھا، اگر ان کی زندگی میں یہ فتنہ اٹھتا تو خدا جانے وہ کیا کچھ کر گزرتے، ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ختم نبوت کے اعلان اور اس کے اظہار کے لئے بہانے کی تلاش میں رہتے تھے، قبلہ نما، انتصار الاسلام اور مباحثہ شاہجہانپور وغیرہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے اور کتاب تحذیر الناس کا تو موضوع ہے ہی شان رسالت اور ختم نبوت کا بیان، اس اعتبار سے مولانا کو ہندوستان میں تحریک تحفظ ختم نبوت کا بانی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

تحریک ختم نبوت کا مظلوم مجاہد:

نہایت دکھ، افسوس اور حیرت ہوتی ہے کہ کائنات میں جس عالم دین نے سب سے بڑھ کر ختم نبوت کا پرچار کیا اور نہایت ٹھوس بنیادوں پر اس کام کو اٹھایا، الزام لگانے والوں نے اس کو بھی نہ بخشا، اس سے بڑھ کر اور ظلم کیا ہوگا کہ ایسی ہستی پر انکار ختم نبوت کا الزام لگایا، ان پر کفر کے فتوے دیئے، ان کے خلاف کتابیں لکھیں، تقریریں کیں، مقالے پڑھے اور شائع کئے اور عوام الناس کو ان کے خلاف ابھارا، کسی پاکدامن پر تہمت لگانے پر حد قذف لگتی ہے، عام مسلمان کو کافر کہنے سے انسان لعنت کا حق دار ٹھہرتا ہے تو بتائیں کہ ختم

نبوت کے اتنے بڑے مجاہد پر یہ الزام کتنا بڑا صریح ظلم ہوگا، حضرت نانوتویؒ کو اس حوالے سے اگر ''تحریک ختم نبوت کا مظلوم مجاہد'' کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔

علماءِ حق نے حضرت نانوتویؒ پر الزامات کا دفاع کیا اور اس پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے مگر راقم کے خیال میں یہ دفاع کافی نہیں بلکہ ان کی روحانی اولاد کی ذمہ داری ہے کہ ان کے فیوضات کو پھیلائے، عوام کو بھی پتہ چلے کہ مولانا کیا تھے؟ اور لوگوں نے ان کو کیا سمجھ لیا؟ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ سمینار ہے، بندہ اس میں اپنا مقالہ بعنوان ''حضرت نانوتویؒ اور خدمات ختم نبوت'' پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے، اس مقالہ میں حضرت کی مختلف کتابوں سے بالخصوص ان عبارتوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کی شان کو یا آپ کے آخری نبی ہونے کو بیان کیا ہے، بعض کتابیں تحذیر الناس کے بعد کی ہیں، آخر میں تحذیر الناس کی عبارات کا حل بھی دیا ہے، امید ہے کہ اس سمینار کے بعد ان شاء اللہ کوئی منصف مزاج شخص اُن کو ختم نبوت کا منکر کہنے کی جرأت نہ کرے گا، ذیل میں ایسی ہی حضرت کی کتابوں سے کچھ عبارتیں پیش کی جاتی ہے:

آپ نے ''میلۂ خدا شناسی'' میں دوران مباحثہ اس موضوع پر فی البدیہہ جو خطاب پیش فرمایا وہ کچھ اس طرح ہے:

انبیاء علیہم السلام کے اتباع اور اقتداء ہی میں نجات منحصر ہوگی کیونکہ اس صورت میں ان کی اطاعت خاص خدا کی اطاعت ہوگی اور ان کی نافرمانی خاص خدا کی نافرمانی ہوگی، مگر جیسے ہر زمانے میں ایک جدا حاکم ہوتا ہے؛ پہلے زمانہ میں اگر لارڈ ناتھ بروک گورنر تھے تو آج لارڈ لٹن ہیں، پہلے اور کلکٹر تھا اب اور کلکٹر ہے، ایسے ہی ہر زمانے میں مناسب وقت

ایک جُدا ہی نبی ہوگا، جیسے آج کل لارڈلٹن کے احکام کی تعمیل ضرور ہے، لارڈ ناتھ بروک کے احکام کی تعمیل سے کام نہیں چلتا، ایسے ہی ہر زمانے میں اس زمانے کے نبی کے احکام کی تعمیل ضرور ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسی علیہما السلام کی بزرگی اور نبوت مسلّم، ان کا منکر ہمارے نزدیک ایسا ہی کافر ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا منکر ہمارے نزدیک کافر ہے، علی ہذا القیاس سری رام چندر اور سری کرشن کو بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، پر آج کل نجات کا سامان بجز اتباع نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کچھ نہیں، جیسے اس زمانہ میں باوجود تقرر گورنر حال لارڈلٹن گورنر سابق لارڈ ناتھ بروک کے احکام کی تعمیل پر اگر کوئی شخص اصرار کرے اور لارڈلٹن کے احکام کی تعمیل سے انکار کرے تو باوجود اس کے کہ لارڈ نارتھ بروک بھی سرکاری کی طرف سے گورنر تھا، اس وقت میں اصرار بیشک منجملہ بغاوت ومقابلۂ سرکاری سمجھا جائے گا، ایسے ہی اگر کوئی شخص اس زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر اوروں کی اتباع کرے تو بیشک اس کا یہ اصرار اور یہ انکار از قسم بغاوت خداوندی ہوگا جس کا حاصل کفر والحاد ہے، القصہ اس وقت اتباع حضرت عیسیٰ وغیرہم ہرگز باعث نجات نہیں ہوسکتا، ہاں حضرت عیسیٰ وغیرہم اگر خاتم الانبیاء ہوتے تو پھر بیشک نجات انہیں کے اتباع میں منحصر ہوجاتی لیکن ایسا ہوتا تو بالضرور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سدّ باب ضلالت کے لئے دعویٰ خاتمیت کرتے تاکہ آئندہ کو لوگ اوروں کے اتباع سے گمراہ نہ ہوجائیں، انبیاء کا یہ کام نہیں کہ ایسے موقع میں چپکے بیٹھے رہیں، اور آدمیوں کو گمراہ ہونے دیں، مگر سب جانتے ہیں کہ سوائے حضرت رسول عربی محمد رسول اللہ ﷺ اور کسی نے دعویٰ خاتمیت نہیں کیا، اگر کرتے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرتے، انہوں نے بجائے دعویٰ خاتمیت کے الٹا یہ فرمایا کہ میرے

بعد دو جہان کا سردار آنے والا ہے جس سے بروئے انصاف آشکارا ہے کہ وہ آنے والا خاتم الانبیاء ہوگا، کیونکہ تمام انبیاء اپنے رتبوں کے موافق امتیوں کے سردار اور ان کے حاکم ہوتے ہیں، اور کیوں نہ ہوں؟ ان کی اطاعت اُمتیوں کے ذمے ضرور ہوتی ہے، اس لئے جو سب کا سردار ہوگا وہ سب کا خاتم ہوگا، کیونکہ وقت مرافعہ بادشاہ کا حکم سب میں آخر رہتا ہے، یہ اس کی خاتمیت حکومت خاص اسی وجہ سے ہے کہ وہ سب کا سردار ہوتا ہے، الغرض اتباع محمدی اب تمام عالم کے ذمہ لازم ہے، انہوں نے دعویٰ نبوت کے ساتھ دعویٰ خاتمیت بھی کیا اور وہ وہ معجزے دکھلائے کہ اوروں کے معجزے ان کے سامنے کچھ نسبت نہیں رکھتے، چنانچہ بطور مشتے نمونہ از خروارے کل بعض معجزات کی تفصیل اور انبیاء دیگر کے معجزات پر ان کی فوقیت اور افضلیت ہم بیان بھی کر چکے ہیں، پھر اب ان کے اتباع میں کیا تأمل ہے، خاص کر قرآن مجید ایک ایسا معجزہ ہے کہ کوئی اس کے برابر نہیں ہوسکتا۔ (مباحثۂ شاہجہاں پور: ۴۳،۴۷، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند)

براہین قاسمیہ میں بیان کردہ آپ کی تقریر میں اس موضوع پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کی تمام انبیاء پر فضیلت کا اثبات:

چونکہ حُکّامِ ماتحت بادشاہی متعدد اور متفاوتُ المراتب ہوتے ہیں اور خلفاء تعلیم بھی متعدد اور مراتب میں کم وبیش، چنانچہ گورنر سے لیکر کانسٹبل تک سب حاکم ہیں، مگر ایک دوسرے سے مرتبۂ حکومت واختیارات میں زیادہ کم، اور مدرّس اول سے لیکر مدرس آخر تک سب معلم، مگر درجاتِ علم وتعلیم میں زیادہ کم، اس لئے وہ نبی جو سب انبیاء کا اسی طرح افسر ہو

جیسے گورنر مثلا سب محکمہ جات اور تمام حکام کا حاکم اور افسر ہوتا ہے یا جیسے ڈائرکٹر مثلا تمام مدارس اور مدرسین کا حاکم اور افسر ہوتا ہے، خاتم مراتب کمالات انسانی اور خاتم مراتب کمالات علمی و عملی ہوگا، نہ اس کے علوم کے برابر اوروں کے علوم ہوں گے اور نہ اس کے حکم کے اوپر کسی اور کا حکم ہوگا، اس کا حکم اور حکم نامہ- جو واقعی حکم اور حکمنامۂ خداوندی ہوگا، کیونکہ نائب خدا ہے، اصل حاکم نہیں- تمام احکام اور حکمناموں کا ناسخ ہوگا، گو وہ نسخ اس قسم کا ہو جیسے نسخۂ مسہل ناسخ نسخۂ مُنضج ہوتا ہے۔

جب طبیب کو کسی مادّۂ فاسد کا تنقیہ یعنی جسم سے نکالنا مقصود ہوتا ہے تو وہ ایسا نسخہ تجویز کرتا ہے جو اس مادّہ کو نکلنے کے قابل بنا دے، اس کو نسخۂ منضج کہتے ہیں، جب مادہ نکلنے کے قابل ہو جاتا ہے تو ایسا نسخہ تجویز کرتا ہے جو اس مادہ کو بصورت اسہال خارج کردے، اس کو نسخۂ مسہل کہتے ہیں، پہلا نسخہ طبیب نے مصلحت کے پیش نظر ایک خاص وقت تک کے لئے لکھا تھا، جب وہ وقت ختم ہو گیا تو اس کو بند کر کے وقتی مصلحت کے پیش نظر دوسرا نسخہ لکھ دیا، یہ بات طبیب کے کمال فن پر دلالت کرائے گی نہ کہ نقص پر، اسی طرح باری تعالیٰ شانہ کے احکام و شرائع کا حال سمجھ لیا جائے، معترضین کی طرف سے نسخِ احکام و نسخِ شرائع پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کے جواب کی طرف اشارہ کر دیا۔

اور پھر اس کے حکمنامہ کی عبارت تمام حکمناموں کی عبارتوں سے فصاحت و بلاغت اور عُلُوّ مضامین اور جامعیتِ علومِ ضروریہ دین میں اعلیٰ اور افضل ہوگی اس کو بھی واضح فرمایا۔

آنحضرت ﷺ کا خطاب ''خاتم النبیین'' جملہ کمالات کی نہایت کی دلیل:

مگر چونکہ ایسے حاکم بالادست اور مدرِّس اعلیٰ کا خطاب جس کے اوپر اور کوئی حاکم

اور مدرّس نہ ہوا ایسا ہونا چاہئے جس سے ہر کوئی اس کی افسری اور برتری سمجھ جائے، اس لئے اس افضل المخلوقات کے لئے بھی خدا کی طرف سے ایسا خطاب ہونا چاہئے جس سے ہر کوئی یہ سمجھ جائے کہ اس شخص سے اوپر اور کسی کا مرتبہ نہیں۔ سو یہ بات سوائے حضرت سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ اور کسی کو میسر نہیں آئی، کسی دین کی کتابِ آسمانی میں اس دین کے کسی پیشوا کی نسبت اس قسم کا خطاب نہیں، ہاں حضرت سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کو البتہ خطاب خاتم النبیین عطا ہوا، جس سے صاف عیاں ہے کہ جیسے گورنر خاتم مراتبِ حکومتِ نیابت ہوتا ہے، ایسے ہی مخاطب مذکور خاتم مراتب کمالات نبوت ہے جو متضمن کمالات علمیہ وکمالاتِ حکومت ہے، کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام خدا کی عظمت وشان اور اس کے احکام سے مطلع ہو کر اوروں کو اس کی عظمت وشان سے مطلع فرماتے ہیں اور پھر وہ احکام پہنچا کر تاکید تعمیل فرماتے ہیں، اطلاع مذکور تو کمالات علمیہ کی طرف مشیر ہے اور حکم رسانی اور پھر حکمرانی کمالات حکومت کی طرف اشارہ کرتی ہے، اور جب حضرت خاتم النبیین خاتم مراتب علمیہ اور خاتم مراتب حکومت ہوئے تو نہ ان کی تعلیم کے بعد اور کوئی معلِّم تعلیم آسمانی لیکر آئے اور نہ ان کے بعد اور کوئی حاکم خدا کی طرف سے حکمنامہ لائے۔ (براہین قاسمیہ: ۱۳۹-۱۴۱)

''مکمل حجۃ الاسلام'' میں آپ کے افادات میں مذکور ہے:

اس تقریر سے اس شبہ کا ازالہ بھی مقصود ہے کہ توریت وانجیل میں وہ فصاحت وبلاغت کیوں نہیں جو قرآن مجید میں ہے جبکہ وہ بھی کلامِ الٰہی ہیں؟ اور جب کہ دونوں کا متکلم ایک ہی ہے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ ایک متکلم سے مخاطبین کے اختلاف سے دو طرز کا کلام صادر ہونا مستبعد نہیں ہے، اُس کلام کے مخاطب ایسے لوگ تھے جن کو فصاحت وبلاغت سے

کوئی سروکار نہ تھا اور اِس کلام کے مخاطب وہ لوگ تھے جو فصاحت میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔

صاحب اعجازِ علمی کا صاحبِ اعجازِ عملی سے افضل ہونا:

اور بایں وجہ کہ علم تمام ان صفات سے جو جو مربی عالم ہیں یعنی ان صفات کو عالم سے تعلق ہے جیسے علم وقدرت، ارادہ، مشیئت، کلام، کیونکہ علم کو معلوم اور قدرت کو مقدور اور ارادہ کو مراد اور مشیئت کو مرغوب اور کلام کو مخاطب کی ضرورت ہے، (کیونکہ علم ان سب کے تصرفات کا موقوف علیہ ہے) اس لئے وہ نبی جس کے پاس معجزہ علمی ہو تمام ان نبیوں سے اعلیٰ درجہ میں ہوگا جو معجزہ عملی رکھتے ہوں گے، کیونکہ جس درجہ کا معجزہ ہوگا وہ معجزہ اس بات پر دلالت کرے گا کہ صاحب معجزہ اس درجہ میں یکتائے روزگار ہے اور اس فن میں بڑا سردار ہے، اس لئے ہمارے حضرت رسول اللہ ﷺ کی افضلیت کا اقرار بشرط فہم وانصاف ضرور ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا:

علی ہذا القیاس، جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ علم سے اوپر کوئی ایسی صفت نہیں جس کو عالم سے تعلق ہو تو خواہ مخواہ اس بات کا یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ پر تمام مراتب کمال اسی طرح ختم ہو گئے جیسے بادشاہ پر مراتب حکومت ختم ہو جاتے ہیں، اس لئے جیسے بادشاہ کو خاتم الحکماء کہہ سکتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کو خاتم الکاملین اور خاتم النبیین کہہ سکتے ہیں۔ (مکمل حجۃ الاسلام: ۱۰۶)

پھر حضرت نے اپنی تقریر وتحریر سے ختم نبوت کو منطقی وعقلی پہلو سے ثابت ہی نہیں کیا بلکہ خود اپنا عقیدۂ راسخ بھی لوگوں کے سامنے بیان کیا، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کا عقیدۂ ختم نبوت:

(۱) اپنا دین وایمان ہے کہ بعد رسول اللہ ﷺ کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں، جو اس میں تأمل کرے اسے کافر سمجھتا ہوں۔ (مکتوبات حضرت مولانا محمد قاسمؒ: ص:۱۰۳)

(۲) خاتمیتِ زمانی سے مجھ کو انکار نہیں بلکہ یہ کہئے کہ منکروں کے لیے گنجائشِ انکار نہ چھوڑی، افضلیت کا اقرار ہے بلکہ اقرار کرنے والوں کے پاؤں جما دیئے۔ (جواب محذورات از حضرت مولانا محمد قاسم: ص:۵۰)

(۳) جب حضرت خاتم النبیین خاتم مراتب علمیہ اور خاتم مراتب نبوت حکومت ہوئے تو نہ ان کی تعلیم کے بعد کوئی معلم تعلیم آسمانی لے کر آئے اور نہ ان کے بعد اور کوئی حاکم خدا کی طرف سے حکم نامہ لائے۔ (آریہ سماج کو جواب ترکی بہ ترکی: ص:۵۱، مطبوعہ دیوبند)

(۴) حضرت خاتم المرسلین کی خاتمیت زمانی تو سب کے نزدیک مسلم ہے۔ (جواب محذور اول: ص:۳۰، از حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ)

(۵) درصورتیکہ زمانہ کو حرکت کہا جائے تو اس سے کوئی مقصود بھی ہوگا جس کے آنے پر حرکت منتہی ہو جائے، سو حرکتِ سلسلۂ نبوت کے لیے نقطہ ذات محمدی منتہیٰ ہے، یہ نقطہ اس ساق زمانی اور ساق مکانی کے لئے ایسا ہے جیسا نقطہ رأس زاویہ؛ تاکہ اشارہ شناسان حقیقت کو یہ معلوم ہو کہ آپ کی نبوت کون ومکان، زمین وزمان کو شامل ہے...... منجملہ حرکات حرکت سلسلہ نبوت بھی تھی، سو بوجہ حصول مقصود اعظم ذاتِ محمدی ﷺ وہ حرکت مبدل بہ سکون ہوئی، البتہ اور حرکتیں ابھی باقی ہیں اور زمانہ آخر میں آپ کے ظہور کی ایک وجہ یہ بھی

تھی۔(تحذیرالناس:ص:۱۹)

(۶) خاتمیتِ زمانی اپنا دین وایمان ہے، ناحق تہمت کا البتہ کچھ علاج نہیں۔ (جواب محذورات:۳۹)

(۷) آپ کا دین سب دینوں میں آخر ہے، چونکہ دین حکم نامہ خداوندی کا نام ہے تو جس کا دین آخر ہوگا وہی شخص سردار ہوگا کیونکہ اس کا دین آخر ہوتا ہے جو سب کا سردار ہوتا ہے۔(قبلہ نما:ص:۱۱،مصنفہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ،عقیدۃ الامت فی معنی ختم النبوت:ص:۲۱۵-۲۱۷)

ان تصریحات کی موجودگی میں بعض حضرات کا یہ دعویٰ کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اجرائے نبوت کے قائل ہیں اور حضور ﷺ کے بعد کسی اور نبی کے پیدا ہونے کو اسلام کے عقیدہ ختمِ نبوت کے منافی نہیں سمجھتے کس قدر علم اور دیانت کا خون ہے!!

اقسام ختم نبوت:

حضرت کی جس عبارت سے عوام کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، ذیل میں اس کی وضاحت کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

اس کی وضاحت سے پہلے حضرت مفتی سعید صاحب دامت برکاتہم نے جو خلاصہ پیش کیا ہے وہ سمجھ لیا جاے؛ تاکہ حضرت نانوتویؒ کا دقیق مضمون سمجھنے میں آسانی رہے،فرماتے ہیں:

اس کی تشریح یہ ہے کہ ختمِ نبوت کی تین قسمیں ہیں اور تینوں حضور اکرم ﷺ کو حاصل ہیں یعنی آپ ﷺ تینوں اعتبار سے خاتم النبیین ہیں،ختمِ نبوت کی تین قسمیں یہ ہے:(۱)ختم نبوت رتبی،(۲)ختم نبوت زمانی،(۳)ختم نبوت مکانی۔

ختم نبوت رتبی:

ختم نبوت رتبی کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نبوت بالذات ہے اور دیگر انبیاء کرام از آدم تا عیسیٰ علیہم السلام کی نبوت اور دوسری چھ زمینوں کے نبیوں کی نبوت بالعرض ہے اور حضور ﷺ کی نبوت کا فیض ہے یعنی آپ ﷺ پر نبوت کے تمام مرتبے ختم ہوگئے ہیں۔ یہ ختم نبوت رتبی کا مطلب ہے۔

ختم نبوت مکانی:

اور ختم نبوت مکانی کا کیا مطلب ہے؟ حضرت نانوتویؒ نے بڑی تفصیل سے سمجھایا ہے کہ سات زمینوں میں سب سے افضل ہماری یہ زمین ہے، اس لئے حقیقی خاتم النبیین بھی اسی اعلیٰ اور افضل زمین میں تشریف لائے ہیں، پس مکان (زمینوں) کے اعتبار سے بھی اس زمین کے خاتم حقیقی خاتم النبیین ہوئے۔ یہ ختم نبوت مکانی کا مطلب ہے۔

ختم نبوت زمانی:

تیسری قسم ختم نبوت زمانی ہے، ختم نبوت زمانی کا مطلب یہ ہے کہ جو ہستی حقیقی خاتم النبیین ہے اس کا دور اور زمانہ دوسرے بالعرض متصفین کے بعد ہے اور سب انبیاء کے آخر میں وہ تشریف لائے ہیں، ان کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، یہ ہے ختم نبوت زمانی کا مطلب۔

ختم نبوت رتبی اور زمانی میں تلازم:

حضرت نانوتوی قدس سرّہ نے یہ مسئلہ بھی صاف کردیا ہے کہ ختم نبوت رتبی

کے لئے ختم نبوت زمانی لازم ہے، کیونکہ جو ہستی وصف نبوت کے ساتھ بالذات متصف ہے اگر وہ تمام نبیوں سے پہلے آئے ، یا ان کے درمیان میں آئے تو محذور لازم آئے گا اور وہ خرابی یہ ہے کہ خاتم النبیین کے بعد جو نبی آئیں گے، اگر اُن کے پاس وحی نہ آئے اور وہ نئی شریعت نہ دی جائیں تو وہ نبی نہیں ہوں گے، اور اگر ان انبیاء متأخرین کے پاس وحی تو آئی مگر اس میں علوم جدیدہ نہ ہوں تو وہ وحی تحصیل حاصل ہوگی ، اور اگر ان کے پاس وحی آئے اور نئی شریعت دی جائیں تو موصوف بالعرض کی شریعت سے موصوف بالذات کی شریعت کا منسوخ ہونا لازم آئے گا ، حالانکہ ناسخ کے لئے منسوخ سے افضل یا کم از کم مساوی ہونا ضروری ہے ، مفضول افضل کے لئے ناسخ نہیں ہوسکتا، اللہ پاک کا ارشاد ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا اَوْ مِثْلِهَا (ہم کسی آیت کا حکم جو موقوف کر دیتے ہیں یا اس آیت ہی کو ذہنوں سے فراموش کر دیتے ہیں تو ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کے مثل لے آتے ہیں) اس آیت سے دو اور دو چار کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ ناسخ ہمیشہ منسوخ سے بہتر یا منسوخ کے مانند ہوتا ہے، پس اگر خاتم النبیین شروع میں آجائیں یا درمیان میں آجائیں تو بعد میں آنے والے نبیوں کی شریعت اُن کی شریعت کو منسوخ کر دے گی اور یہ بات ممکن نہیں ہے، اسی لئے حضرتؒ نے فرمایا کہ خاتم النبیین کے لئے سب سے اخیر میں آنا ضروری ہے اور ختم نبوت رتبی کے لئے تأخر زمانی لازم ہے، حضرت قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"بالجملہ رسول اللہ ﷺ وصفِ نبوت میں موصوف بالذات ہیں اور سوا آپ ﷺ کے اور انبیاء موصوف بالعرض، اس صورت میں اگر رسول اللہ ﷺ کو اول یا اوسط میں رکھتے تو انبیاء متأخر کا دین اگر مخالف دین محمدی ہوتا تو اعلیٰ کا ادنیٰ سے منسوخ ہونا لازم آتا ،

حالانکہ خود فرماتے ہیں: مَانَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَأۡتِ بِخَيۡرٍ مِنۡهَا اَوۡ مِثۡلِهَا اور کیوں نہ ہو، یوں نہ ہوتو اعطاءِ دین منجملۂ رحمت نہ رہے، آثارِ غضب میں سے ہوجائے، ہاں اگر یہ بات متصور ہوتی کہ اعلیٰ درجہ کے علماء کے علوم ادنیٰ درجہ کے علماء کے علوم سے کمتر اور اَدْ وَن ہوتے ہیں تو مضائقہ بھی نہ تھا، پر سب جانتے ہیں کہ کسی عالم کا عالی مراتب ہونا علوِ مراتب علوم پر موقوف ہے، یہ نہیں تو وہ بھی نہیں، اور انبیاء متأخرین کا دین اگر مخالف نہ ہوتا تو یہ بات تو ضرور ہے کہ انبیاء متأخر پر وحی آتی اور افاضۂ علوم کیا جاتا؛ ورنہ نبوت کے پھر کیا معنیٰ؟ سو اس صورت میں اگر وہی علوم محمدی ہوتے تو بعد وعدۂ محکم اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ کے جو بہ نسبت اس کتاب کے جس کو قرآن کہتے، اور بشہادت آیت وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتَابَ تِبۡيَانًا لِكُلِّ شَيۡءٍ جامع العلوم ہے، کیا ضرورت تھی؟ اور اگر علوم انبیاء متأخر علوم محمدی کے علاوہ ہوتے تو اس کتاب کا ''تِبۡيَانًا لِكُلِّ شَيۡءٍ'' ہونا غلط ہوجاتا۔

بالجملہ جیسے ایسے نبی جامع العلوم کے لئے ایسی ہی کتاب جامع چاہئے تھی تاکہ علوِ مراتب جو لاجرم علوِ مراتب علمی ہے، چنانچہ معروض ہوچکا میسر آئے، ورنہ یہ علوِ مراتب نبوت بے شک ایک قول دروغ اور حکایت غلط ہوتی، ایسے ہی ختم نبوت بمعنی معروض کو تأخر زمانی لازم ہے''۔ (مسئلۂ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے: ص: ۳۵-۳۹)

پس ثابت ہوا کہ بریلوی حضرات کا بہتان اور دیگر فرق ضالہ کا مغالطہ اور اجراء نبوت کا تاثر صحیح نہیں ہے، حضرتؒ کی عبارت سے ایسا کوئی وہم بھی پیدا نہیں ہوتا۔

ختم نبوت زمانی اور ختم نبوت مرتبی میں باہمی ربط:

آنحضرت ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے عام طور پر یہی معنی لیے جاتے ہیں

کہ آپ سب سے آخر میں تشریف لائے حالانکہ تقدیم یا تاخیر زمانہ میں بالذات کچھ فضیلت نہیں، مسجد میں جو شخص سب سے آخر میں آئے ضروری نہیں کہ وہ سب سے اعلی ہو لیکن قرآن کریم آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت کو مقامِ مدح میں بیان کر رہا ہے، صرف اطلاع ہی نہیں دے رہا، پس ضروری ہوا کہ ختم نبوت زمانی کے ساتھ ختم نبوت مرتبی کا اقرار کیا جائے اور مراتب وکمالات کے لحاظ سے بھی آپ کو خاتم النبیین مانا جائے، صرف ختم نبوت زمانی کا اقرار کرنا اسے آپ نے عوام کا خیال ظاہر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

عوام کے خیال میں تو رسول اللہ ﷺ کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانہ کے بعد اور آپ سب میں آخری نبی ہیں مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدیم یا تاخیر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں، پھر مقام مدح میں '' ولکن رسول اللہ و خاتم النبیّن ''فرمانا اس صورت میں کیونکر صحیح ہوسکتا ہے بلکہ بنائے خاتمیت اور بات ہے جس سے تاخرزمانی اور سدّ باب مذکور خود بخود لازم آجاتا ہے اور فضیلتِ نبوی دوبالا ہوجاتی ہے۔ (تحذیر الناس:۳،۵)

''تاخرزمانی اور سد باب مذکور خود بخود لازم آجاتا'' کیا اس میں صریح طور پر ختم نبوت زمانی کا اقرار نہیں، اس تصریح کے بعد اس دعوے کی کچھ گنجائش ہے کہ مولانا مرحوم معاذ اللہ ختم نبوت زمانی کے قائل نہ تھے اور کیا اس عبارت کے ہوتے ہوئے اس کے پہلے حصہ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فقط تاخرزمانی کو عوام کا خیال بتلانا دراصل تاخرزمانی کا انکار تھا کہ ایسا دعویٰ انصاف ودیانت کا خون نہیں، ان لوگوں کے علم وشرافت پر حیرت ہوتی ہے جو عبارت مذکورۃ الصدر کا پہلا حصہ تو اپنے الزامات میں نقل کرتے ہیں لیکن ''بلکہ'' کا جو ارتقاء اس ارتقاء زمانی

کومع شیئ زائد ثابت کرتا ہے اسے یکسر ہضم کر جاتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے آنحضرت ﷺ کی اس ختم نبوت پر دوطرح سے تقریر فرمائی ہے: اولاً یہ کہ ختم نبوت مرتبی کو ختم نبوت ذاتی ہونے کے اعتبار سے آیت خاتم النبیین کا مدلول مطابقی قرار دیا جائے اور ختم نبوت زمانی کو اس کے ساتھ لازم کر کے اسے خاتم النبیین کا مدلول التزامی تسلیم کیا جائے، ثانیاً یہ کہ ختم نبوت کو مطلق اور عام رکھا جائے اور ختم نبوت زمانی اور ختم نبوت مرتبی کو (بلکہ ختم نبوت مکانی کو بھی) اس کی مختلف قسمیں قرار دے کر سب قسموں کا ختم آیت خاتم النبیین کا مدلول مطابقی قرار دیا جائے۔

اس دوسری تقریر کو ہی مولانا نے اپنا مختار قرار دیا ہے؛ تاہم دونوں تقریروں میں سے جس تقریر کو بھی پیش نظر رکھیں ختم نبوت زمانی کا اقرار ہر جگہ موجود ہے اور ختم نبوت مرتبی اس کے علاوہ ایک اور فضیلت ہے۔

ماحاصل تقریر اول بر معنی خاتم النبیین:

آیت خاتم النبیین سے ختم نبوت مرتبی اور ختم نبوت زمانی دونوں ثابت ہیں، امرِ اول دلالتِ مطابقی سے اور امر ثانی دلالتِ التزامی سے، صرف ختم نبوت زمانی مراد لینے کی آپ نے مخالفت کی ہے، اس سے اگر کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ آپ ختم نبوت زمانی کے قائل نہیں تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ عاقبت کی روسیاہی سے ڈرے۔

اس کے بعد مولانا نے حضور ﷺ کی خاتمیت پر دوسری تقریر فرمائی ہے:

اگر بطور اطلاق یا عموم مجاز اس خاتمیت کو زمانے اور مرتبے سے عام رکھا جائے تو پھر دونوں طرح خاتم مراد ہوگا۔ (تحذیر: ص:۸)

پھر حضرت مولانا نے مکان وزمان اور مرتبہ کو ''مفہوم خاتمیت'' کی تین انواع قرار دے کر ہر لحاظ سے حضور ﷺ کو خاتم النبیین مانا ہے، اس طرح سے خاتمیت زمانی، خاتمیت مکانی اور خاتمیت رتبی تینوں دلالت مطابقی کے ساتھ ثابت ہوجاتی ہیں؛ چنانچہ فرماتے ہیں:

(۱) اگر ''خاتم'' کو مطلق رکھیے تو پھر خاتمیت مرتبی، خاتمیت زمانی اور خاتمیت مکانی تینوں ثابت ہوجائیں گی۔ (جوابات محذورات: ص: ۴۷)

(۲) وہ تقریر لکھی ہے جس سے خاتمیت زمانی، خاتمیت مکانی اور خاتمیت مرتبی، تینوں بدلالت مطابقی ثابت ہوجائیں اور اسی تقریر کو اپنا مختار قرار دیا ہے۔ (جوابات محذورات: ص: ۵۵)

(۳) معنی مختار احقر مثبت خاتمیت زمانی ہیں۔ (جوابات محذورات: ص: ۶۸)

(۴) تحذیر کو غور سے دیکھا ہوتو اس میں خود موجود ہے کہ لفظ خاتم تینوں معنوں پر دلالت مطابقی دلالت کرتا ہے، اور اسی کو اپنا مختار قرار دیا ہے۔ (جوابات محذورات: ص: ۸۳)

پس آپ خاتم ہوئے ذاتاً بھی اور زماناً بھی اور آپ کی خاتمیت صرف زمانہ کے اعتبار سے نہیں ہے، اس لئے کہ یہ کوئی بڑی فضیلت نہیں کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابقین کے زمانہ سے پیچھے ہے؛ بلکہ کامل سرداری اور غایت رفعت اور انتہا درجہ کا شرف اسی وقت ثابت ہوگا جب کہ آپ کی خاتمیت ذات اور زمانہ دونوں اعتبار سے ہو؛ ورنہ محض زمانہ کے اعتبار سے خاتم الانبیاء ہونے سے آپ کی سیادت ورفعت نہ مرتبہ کمال کو پہونچے گی اور نہ آپ کو فضل کلی کا شرف حاصل ہوگا۔

اور یہ دقیق مضمون جناب رسول اللہ ﷺ کی جلالت ورفعت شان وعظمت کے بیان میں مولانا کا مکاشفہ ہے۔

خلاصہ تحقیق نانوتوی درشان رسالت وختم نبوت:

اوراق سابق میں حضرت نانوتویؒ کے موقف کی وضاحت کی جا چکی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے نبی کریم ﷺ کی شان کو بیان کیا ہے اس طرح اوروں نے بیان نہ کیا اور ساتھ ہی ختم نبوت کا اعلام بھی کرتے گئے، حضرتؒ نے درج ذیل وجوہات سے دیگر انبیاء علیہم السلام پر نبی کریم ﷺ کی فوقیت کو ثابت کیا ہے۔

نمبر(۱) : نبوت کا تفوق:

آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت سورج کی طرح ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوت چاند ستاروں کی طرح، ایک جگہ آپ نے لکھا ہے کہ جس طرح آپ ﷺ امت کے نبی ہیں اسی طرح آپ ﷺ انبیاء کے بھی نبی ہیں۔ (تحذیر الناس:۳،۴)

حضرت کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ باقی انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کیلئے نبی ہیں مگر وہ ہمارے نبی ﷺ کیلئے امتی ہیں، آپ ﷺ امت کے بھی نبی اور معراج کی رات انبیاء علیہم السلام کے بھی امام بنے، پہلے زمانے میں ایک وقت میں ایک سے زیادہ نبی ہوتے تھے جیسے موسیٰ علیہ السلام، ہارون علیہ السلام؛ مگر نبی ﷺ کی شان ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے کوئی اور نبی نہیں، اگر بالفرض آپ ﷺ پہلے انبیاء کے زمانے میں تشریف لاتے تو وہ انبیاء علیہم السلام آپ کی اتباع کرتے۔

دوسری جگہ حضرت فرماتے ہیں کہ آپ سب سے اعلیٰ ہیں، اس لئے آخر میں آئے کہ جیسے بڑی عدالت میں انسان بعد میں جاتا ہے اسی طرح اعلیٰ نبی کو اللہ نے آخر میں بھیجا۔ (انتصار الاسلام: ص:۵۸)

حضرت نانوتویؒ کا منشا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو نبوت آپ ﷺ کی برکت سے ملی، حضرت کی اس بات کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قیامت کے دن جب تک آپ ﷺ شفاعت نہ کریں گے کوئی اور نبی شفاعت نہ کرے گا، جب تک آپ ﷺ گواہی نہ دیں گے اوروں کی گواہی موقوف رہے گی۔

نمبر (۲) : معجزات کا تفوق:

حضرت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے معجزات دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے اعلیٰ ہیں، موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے کہ پتھر سے پانی کے چشمے نکلتے ہیں، کمال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی انگشتان مبارک سے پانی کے چشمے نکلتے تھے جس سے لشکر کے لشکر سیراب ہو جاتے تھے، گوشت پوست سے پانی کا نکلنا زیادہ عجیب ہے کیونکہ زمین اور پتھر سے تو چشمے نکلا ہی کرتے ہیں، مگر انگلیوں سے تو پانی نہیں نکلا کرتا۔

موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ لاٹھی سانپ بن گئی اور عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ گارے سے پرندہ بن گیا، مگر نبی ﷺ کا معجزہ ہے کہ سوکھا تنا آپ کے غم میں رونے لگ گیا اور یہ معجزہ ان معجزوں سے زیادہ عظیم ہے، اس لئے کہ لاٹھی نے سانپ بن کر وہی کام کیا جو سانپ کیا کرتے ہیں اور گارے سے بنے ہوئے پرندے نے وہی کام کیا جو پرندے کیا کرتے ہیں، مگر آپ ﷺ کا معجزہ زیادہ عجیب ہے کہ کھجور کے تنے نے تنا ہوتے ہوئے

محبت میں روکر وہ کام کیا جو ایک سمجھدار اور عقلمند درد دل رکھنے والے انسان کا ہوتا ہے۔(ماخوذ از مباحثہ شاہجہانپور:ص:۳۵تا۴۰،قبلہ نما:ص:۱۴،۱۵)

نمبر(۳) : آپ کا عقل وفہم میں اعلیٰ وافضل ہونا:

حضرت فرماتے ہیں کہ عقل وفہم میں آپ ﷺ اوروں سے ممتاز تھے،اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ خود امی تھے اور جس ماحول میں پیدا ہوئے ،ہوش سنبھالا ؛ بلکہ عمر گزاری ،وہ علوم سے یکلخت خالی ،نہ علوم دینی کا پتہ ، نہ علوم دنیوی کا،اس کے باوجود ایسی لاجواب کتاب لائے ،ایسا محکم آئین اور ایسی واضح ہدایات دے گئے کہ اُن اَن پڑھ لوگوں کو عقائد وعبادات ،معاملات ،اخلاق اور سیاسیات میں بڑے بڑے اہل عقل کا پیشوا بنادیا،ان کے کمال پر اہل اسلام کی بیشمار کتابیں شاہد ہیں،ایسے علوم بتائیں تو سہی کسی قوم اور کسی مذہب والوں کے پاس ہیں،جس کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ کا یہ حال ہو،ان کے استاد اور مربی یعنی حضرت محمد ﷺ کا کیا حال ہوگا؟ (مباحثہ شاہجہانپور:ص:۳۰،۳۱)

نمبر(۴): اخلاق میں بلندی:

حضرت فرماتے ہیں: آپ ﷺ اخلاق میں سب سے بلند تھے،اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نہ کہیں کے بادشاہ تھے نہ بادشاہ زادے،نہ امیر نہ امیر زادے،نہ تجارت کا سامان ، نہ کھیتی کے بڑے اسباب ، نہ میراث میں کوئی چیز ہاتھ آئی ، نہ خود کوئی دولت کمائی ، ایسے افلاس میں ملک عرب کے گردن کشوں ، جفاکشوں برابر کے بھائیوں کو ایسا مسخر کرلیا کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہانے کو تیار ہوں۔

پھر یہ بھی نہیں کہ ایک دوروز کا ولولہ تھا؛نکل گیا،ساری عمر اسی کیفیت میں گزاردی

، یہاں تک کہ گھر بار چھوڑا، زن وفرزند چھوڑے، مال دولت چھوڑی، آپ کی محبت میں سب پر خاک ڈالی۔ اپنوں سے آمادۂ جنگ و پیکار ہوئے، کسی کو آپ مارا، کسی کے ہاتھوں آپ مارے گئے، یہ تسخیر اخلاق نہیں تھی تو اور کیا تھی، یہ زورِ شمشیر کس تنخواہ میں آپ نے حاصل کیا، ایسے اخلاق کوئی بتائے تو سہی، کس میں تھے؟ کسی اور کی نبوت میں شک ہو کہ نہ ہو، حضرت محمد ﷺ کی نبوت میں کسی اہل عقل وانصاف کو شک کی گنجائش نہیں، بہر حال یہ بات واجب التسلیم ہے کہ آپ ﷺ تمام انبیاء کے قافلہ کے سالار، سب رسولوں کے سردار اور سب میں افضل اور سب کے خاتم ہیں۔ (مباحثہ شاہجہانپور: ص:۳۱،۳۲)

نوٹ:۔ یادرہے کہ کتاب قبلہ نما ایک ہندو پنڈت دیانند سرسوتی کے جواب میں لکھی گئی اور کتاب مباحثہ شاہجہانپور عیسائیوں کے ساتھ کئے گئے مناظرہ کی روئیداد ہے، ان کتابوں اور ان مباحثوں کے اندر مولانا نے آپ ﷺ کی ختم نبوت کو واضح الفاظ میں ذکر فرمایا۔ ایک موقعہ پر فرماتے ہیں: کسی اور نبی نے دعویٰ خاتمیت نہ کیا، کیا تو حضرت محمد ﷺ نے کیا، چنانچہ قرآن وحدیث میں بتصریح موجود ہے، سوا آپ کے اگر آپ سے پہلے دعویٰ خاتمیت کرتے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرتے مگر دعویٰ خاتمیت تو درکنار؛ انہوں نے یہ فرمایا کہ میرے بعد جہاں کا سردار آنے والا ہے۔ (مباحثہ شاہ جہانپور: ص:۳۵)

کتنے تعجب کی بات ہے کہ وہ شخص جو غیر مسلموں کے مجمعوں میں جا کر کھول کھول کر نبی کریم ﷺ کی خاتمیت کا اعلان کرتا رہا، لوگوں نے اس کی نامکمل عبارتوں کو لے کر اس پر ختم نبوت کے انکار کا الزام لگا دیا۔

(۵) آنحضرت ﷺ کی پیشینگوئیاں اور انبیاء سے بڑھ کر ہیں:

جوشخص وقائع آخرت کی خبر دیتا ہے وہ دور تک کی خبر دیتا ہے.....اب دیکھئے کس کی پیشینگوئیاں زیادہ ہیں اور پھر وہ بھی کہاں کہاں تک اور کس کس قدر دور ودراز زمانہ کی باتیں ہیں؟ رہا یہ احتمال کہ آخرت کی پیشینگوئیوں کا صدق اور کذب کس کو معلوم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی پیشینگوئی کیوں نہ ہو قبل وقوع سب کا یہی حال ہوتا ہے، اگر دو چار گھڑی پیشتر کی ہو تب تو اکثر حاضرین کو معلوم ہوگا ورنہ بیان کسی کے سامنے کی جاتی اور ظہور کسی کے سامنے ہوتا ہے۔

توارت کی پیشینگوئیوں کو دیکھ لیجئے، بعض بعض تو اب تک ظہور میں نہیں آئیں، بہر حال پیشگوئیاں اگلے ہی زمانے میں جا کر معجزہ ہوجاتی ہیں یعنی ان کا معجزہ ہونا اگلے زمانے میں معلوم ہوتا ہے..... بالجملہ ہمارے پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی پیشگوئیاں بھی اس قدر ہیں کہ کسی اور نبی کی نہیں، کسی صاحب کو دعوی ہو تو مقابلہ کر کے دیکھیں جن میں سے کثرت سے صادق بھی ہوچکی ہیں، مثلاً خلافت کا ہونا، حضرت عثمانؓ اور حضرت حسینؓ کا شہید ہونا اور حضرت حسنؓ کے ہاتھ دو گروہ اعظم کا صلح ہوجانا، الخ..(حجۃ الاسلام: ص: ۳۹، ۴۰)

خلاصہ: حضرت کا یہ عقیدہ بھی تھا اور اس کو ثابت بھی کیا لیکن بعض لوگوں نے پھر بھی حضرتؒ پر انکار ختم نبوت کا بہتان باندھا، خاص طور پر مولوی نقی علی خان اور اس بہتان کے مشن کو آگے بڑھانے میں ان کے لائق فرزند مولوی احمد رضا خان پیش پیش رہے۔ خاص طور پر آخر الذکر نے ''تحذیر الناس'' کی عبارت نقل کرنے میں نہایت افسوس ناک تحریف سے کام لیا اور امانت و دیانت کی حدود دفلانگ گئے، کیونکہ انہیں نے تحذیر الناس کے تین مختلف صفحات کے متفرق فقروں کو جور کر ایک عبارت بنائی، اس طور پر کہ ایک فقرہ صفحہ: ۳ کا ہے

،دوسرا صفحہ ۱۴ کا ہے اور تیسرا صفحہ ۱۸ کا ہے، فقروں کا نمبر تو درکنار فقروں کے درمیان امتیازی خط (ڈیش) تک نہیں دیا تاکہ لوگوں کو دھوکا دیا جا سکے اور ختم نبوت زمانی کے انکار کے معنی پیدا کر دیئے جائیں، اس کے بعد پھر انہوں نے -نعوذ باللہ- کفر کا فتوی بھی دے دیا، تحریف کا خود ارتکاب کیا اور عبارتوں میں الٹ پلٹ سے کام لیا، اسی لئے ہم اس فتوے کو دانستہ فریب اور معاندانہ تلبیس سمجھنے پر مجبور ہیں۔

کیونکہ تحذیر الناس کا تو موضوع ہی آنحضرت ﷺ کی ہر قسم کی خاتمیت ذاتی ،زمانی، مکانی وغیرہ کی حمایت وحفاظت ہے، اور بالخصوص ختم زبانی کے متعلق تو اس میں صاف اور واضح تصریحات ہیں، چہ جائیکہ اس میں ختم نبوت کا انکار کیا جائے۔

بہرحال سابق صفحات میں جو مضامین پیش کئے گئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ نے ختم نبوت محمدی کو علی وجہ الکمال ثابت کیا ہے، دقیق مضامین بیان فرما کر گاہے گاہے حسی اور مشاہد مثالوں سے عام فہم انداز میں سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے تاکہ آپ کی خاتمیت کو کامل وتام ظاہر کیا جائے ،آپ نے جنسِ خاتمیت کی دو نوع خاتمیت باعتبار زمانہ اور خاتمیت باعتبار ذات فرما کر واضح کیا کہ آپ کا زمانۂ نبوت سب سے متأخر ہے لہذا آپ خاتم ہیں، نیز آپ کی نبوت بالعرض نہیں کیونکہ ہر وہ شیئ جو بالعرض ہو وہ ختم ہو جاتی ہے، گویا تمام انبیاء کی نبوت بالعرض ہے، اس لئے کہ تمام کی نبوت آپ کی نبوت کے واسطے سے ہے، اس اعتبار سے آپ خاتم ہوئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ علمائے اسلام نے ہر دور میں مسئلۂ ختم نبوت کو نہایت واضح اور مبرہن صورت میں پیش کیا ہے، خصوصا ہندوستان میں انگریزوں کے دور میں مسلمانوں کی

سیاسی شوکت تو ختم ہوئی، لیکن انہوں نے مسلمانوں کے کئی بنیادی عقائد کو بھی تختۂ مشق بنانے کے لئے پادریوں کو ایک بڑی تعداد میں ہندوستان بلایا، ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دو بڑی اکثریت میں خلیج پیدا کرنے کے لئے پنڈتوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف میدان میں لا کھڑا کر دیا، حضور ﷺ کے دور سے کئی عقائد و تعلیمات اپنے ثبوت و مفہوم میں قطعی اور صریح چلی آرہی تھیں، اب اس کو نظری بنانے کی کوششیں کی جارہی تھی، اسی میں سے ایک مسئلہ ختم نبوت کا تھا جو قطعی تھا، اس باب کا اثر ابن عباس مولانا نقی علی خان والدِ احمد رضا خان نے کچھ بڑے علماء کے درمیان میں استفتاء کے لئے پیش کیا، چونکہ ان کی نیت بھی اس استفتاء سے حق کی تلاش اور صحیح حکم کی طلب نہ تھی، اس لئے جواب ملتے ہی اس پر اعتراضات اور بڑے علماء کے خلاف لوگوں کو اکسایا، اور بدظن کر دیا۔

انہیں جواب دینے والے علماء میں سے ایک صاحب نے یہ اثرِ ابن عباس اور پوری صورت حال سے حضرت نانوتویؒ کو آگاہ فرماتے ہوئے جواب طلب فرمایا، حضرت نے اس کا ایسا عام جواب دیا جو تمام معترضین کو ساکت کر دے، اور اثرِ ابن عباس کو تسلیم کرنے کی صورت میں بھی ختم نبوت پر کوئی حرف نہ آئے۔

مذکور اجمال کی تفصیل ذیل میں درج کرتا ہوں، جس میں تحذیر الناس کے پس منظر میں پوری بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

تحذیر الناس کا پس منظر:

رسالہ ''تحذیر الناس'' ایک استفتاء کا جواب ہے جو ہندوستان کے شہر بریلی میں رہنے والے ایک ممتاز عالم دین مولانا محمد احسن نانوتوی نے حجۃ الاسلام قاسم العلوم

والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا، یہ فتوی جس کا پورانام ”تحذیر الناس من انکار اثر ابن عباس رضی الله عنهما“ ہے، کتابی صورت میں پہلی بار 1290 ہجری بمطابق 1873 میں مطبع صدیقی بریلی کے زیر اہتمام چھاپا گیا۔

ہندوستان میں اُن دنوں ''امکان نظیر'' اور ''امتناع نظیر'' پر بحث ہورہی تھی، مولانا عبدالقادر بدایونی ''امتناع نظیر'' اور شمس العلماء مولانا امیر سہسوانی ''امکان نظیر'' کا نظریہ پیش کرتے تھے اور مناظرے کی نوبت بھی آتی تھی، ان کے مناظرہ کے مفصل حالات کتاب کی صورت میں ''مناظرۂ احمدیہ'' کے نام سے 1289 ہجری میں مطبع شعلہ کانپور سے طبع ہوئے، اس مناظرہ میں درمنثور میں نقل شدہ اثر - جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے- پر بھی بحث کی گئی اور امکانیوں نے اس کا اثبات اور امتناعیوں نے اس کی صحت کا انکار کیا، وہ اثر درج ذیل ہے:

ان الله خلق سبع ارضین، فی کل ارض آدم کآدمکم و نوح کنوحکم وابراهیم کابراهیمکم وعیسی کعیسکم ونبی کنبیکم.

مولوی نقی علی خان صاحب نے ایک استفتاء بابت صحت وعدم صحت اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما مولانا محمد احسن نانوتویؒ صاحب کے پاس ارسال کیا، مولانا صاحب نے جواب دینے سے انکار کردیا، مگر بعد میں جب مولانا عبدالحئ فرنگی محلی نے ''صحت اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما'' کا فتوی دے دیا اور مفتی سعد اللہ صاحب نے اس کی تصدیق کردی تو مولانا محمد احسن صدیقی نانوتویؒ نے ان دو حضرات کی تصدیق پر اپنی مہر تصدیق بھی ثبت کردی جس پر

رسالہ ’’مناظرۂ احمدیہ‘‘ کے مؤلف مولوی محمد نذیر سہسوانی نے آخر میں ایک جملہ بڑھادیا کہ:
’’مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی بھی اس اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صحت کے معتقد ہیں اور اسی پر ان کی مہر بھی ثبت ہے، اس کے علاوہ اور علماء بھی ان کے قائل ہیں‘‘۔ (مولانا محمد احسن نانوتوی مؤلف ڈاکٹر محمد ایوب قادری، روھیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی :ص:۸۵)

دراصل یہ استفتاء اولا مولانا محمد احسن نانوتوی کو بدنام کرنے کے لیے ان کے پاس ارسال کیا گیا تھا، انہوں نے مستفتی کی سازش کو بھانپ لیا تو خود کوئی جواب نہ دیا، چنانچہ مستفتی نے مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کے پاس ارسال کیا تو انہوں نے ’’صحت اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما‘‘ کا فتوی دیا اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی سے بھی تصدیق کروائی، مولانا محمد احسن نانوتوی نے ان دو حضرات کی تصدیق پر گو کہ مہر ثبت کردی، لیکن مولوی نقی علی خان کے ساتھی رحمت حسین کو ایک خط میں یہ لکھا کہ اگر کسی معتمد عالم کی تحقیق اس کے علاوہ ہوئی تو مجھے اس تصدیق سے رجوع کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا، چنانچہ لکھتے ہیں:

جناب مخدوم ومکرم دام مجدہم ’’پس از سلام مسنون التماس یہ ہے کہ واقع میں جواب مرسلہ مولوی نقی علی خان صاحب میری تحریر کے مطابق ہے، میں نے یہ جواب اس جواب کا خلاصہ لکھا تھا جو مولوی عبدالحیؒ فرنگی محلی نے لکھا تھا اور زبانی سامنے شاہ نظام حسین صاحب کے میں نے یہ اقرار کیا کہ مجھ کو اس تحریر پر اصرار نہیں، جس وقت علماء کے اقوال کتب مستندہ سے آئیں، غلطی ثابت ہوگی، میں فورًا مان لوں گا، مگر مولوی نقی علی خان صاحب نے براہ مسافر نوازی کوئی غلطی تو ثابت نہ کی اور نہ مجھ کو اطلاع دی؛ بلکہ اول ہی کفر کا حکم شائع فرمادیا اور تمام بریلی میں لوگ اس طرح کہتے پھرے، خیر میں نے خدا کے حوالے کیا اگر اس

تحریر سے عنداللہ کافر ہوں تو توبہ کرتا ہوں، خدا تعالی قبول کرے، زیادہ نیاز عاصی محمد احسن عفی عنہ۔ (مولانا احسن نانوتوی، ڈاکٹر ایوب قادری، روھیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی: ص: ۸۷)

ان اقتباسات اور اس وقت کی بعض دیگر تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخالفت وتفرقہ کا ماحول بنانا پہلے سے طے شدہ تھا، اس مقصد کے تحت جونہی ''مناظرۂ احمدیہ'' شائع ہوا، مخالفت اور طعن و تشنیع کا بازار گرم کردیا گیا، مولوی نقی علی خان نے اصل مجیب مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور ان کی پہلے تصدیق کرنے والے مفتی سعداللہ صاحب کو چھوڑ کر تیسرے نمبر پر دستخط کرنے والے مولانا محمد احسن نانوتوی پر ہی کفر کا فتوی لگا کر اس کو بازار بریلی میں خوب مشتہر کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1290 ہجری میں مدرسہ ''مصباح التہذیب'' بند ہوگیا اور ساتھ ہی لوگوں کو ابھارا گیا کہ مولانا محمد احسن نانوتوی کی اقتدا میں عیدین کی نماز نہیں ہوتی اور دوسری جگہ حسین باغ بریلی میں خود مولوی نقی علی خان نے عید کی نماز پڑھائی، حالانکہ بریلی میں مولوی نقی علی خان کے علاوہ جید علماء کرام کی کوئی کمی نہ تھی جن کی اکثریت مولانا محمد احسن نانوتوی کو نہ صرف باکردار عالم سمجھتی تھی بلکہ ان کی عقیدت سے سرشار تھی۔

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس سازش کی بنیادی وجہ مولانا محمد احسن نانوتوی کی عوامی مقبولیت وشہرت اور عیدگاہ کی امامت تھی جو مولوی نقی علی خان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے ایک اور نقطہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

''یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ''اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما'' کے مسئلہ میں علماء بریلی اور بدایونی نے مولانا محمد احسن کی بڑی شدومد سے مخالفت کی ، بریلی میں اس محاذ کی قیادت مولوی نقی علی خان کررہے تھے، اور بدایوں میں مولوی عبدالقادر

بدایونی بن مولانا فضل رسول بدایونی سرخیل جماعت تھے، یہی بریلی اور دیوبند کی مخالفت کا نقطہ آغاز تھا جو بعد میں ایک بڑی وسیع خلیج کی شکل اختیار کر گیا۔ (مولانا محمد احسن نانوتوی - ڈاکٹر محمد ایوب قادری - روھیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی: ص:۹۴)

عیدالفطر شوال 1290 ہجری کے موقع پر مولوی نقی علی خان نے عیدگاہ میں مولانا محمد احسن نانوتوی کے نماز پڑھانے کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی، حالانکہ مولانا ایک مدت سے عیدین کی امامت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، اس صورت حال کو دیکھ کر مولانا محمد احسن نانوتوی نے درج ذیل تحریر لکھنی موزون سمجھی:

"اگر سید احمد شاہ صاحب نماز عیدگاہ میں پڑھادیں تو کسی طرح کا نزاع اور تکرار پیش نہ ہوگا؛ نہ ہماری طرف سے نہ ہمارے دوستوں کی طرف سے، اور درصورت نہ ہونے یا انکار کرنے سید صاحب کے قاضی غلام حمزہ صاحب کا امام ہونا مناسب ہے، اس پر بھی کچھ تکرار نہ ہوگی، اگر انہوں نے بھی قبول نہ کیا تو ہم کو کچھ بحث نہیں کسی کی امامت سے ہماری طرف سے نزاع نہ ہوگی"۔ (حوالہ بالا: ص:۸۶)

مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ آئی، آخر کار مولانا محمد احسن نانوتوی نے مولوی نقی علی خان کو عیدگاہ سے یہ پیغام بھجوایا کہ "میں نماز پڑھنے کو آیا ہوں؛ پڑھانا نہیں چاہتا، آپ تشریف لائیں جسے چاہیں امام کیجئے، میں اس کی اقتداء کرلوں گا"۔ (حوالہ بالا: ص:۸۷)

لیکن پھر بھی مولوی نقی علی خان نے اپنی علیحدہ حسین باغ میں نماز پڑھائی اور نماز کے بعد "اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ" کی صحت تسلیم کرنے کی وجہ سے مولانا محمد احسن نانوتوی کی تکفیر کی۔

اس صورت حال کے پیش نظر مولانا محمد احسن نانوتوی نے مولوی نقی علی خان کے

ساتھ رحمت حسین کے نام تحریر ارسال کردی تھی مگر مولوی نقی علی خان اس تحریر سے مطمئن نہ تھے، ان کی رائے میں ''اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ'' کی صحت قبول کرنے کے بعد مولانا محمد احسن نانوتوی (نعوذ باللہ) منکر خاتم النبیین ﷺ ٹھہرتے تھے، اس لئے انہوں نے رام پور سے ایک فتوی مولانا محمد احسن نانوتوی کی تکفیر کے مضمون کا منگوایا اور خوب مشتہر کرایا، چنانچہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے مولانا محمد احسن نانوتوی نے اپنی صفائی میں درج ذیل اشتہار پیش کیا:

''عید الفطر کے روز چرچا ہو رہا تھا کہ مولوی نقی علی خان صاحب نے ایک استفتاء رام پور سے منگوایا ہے جس کی رو سے میری تکفیر مشتہر کی، وہ استفتاء میری نظر سے بالتفصیل نہیں گزرا، بعد میں تشریف آوری مولوی یعقوب خان صاحب اس کی نقل میں نے مفصل دیکھی اور اس عقیدہ رکھنے والے کی تکفیر پر میں بھی علماء کے ساتھ متفق ہوں یعنی جو شخص خاتم النبیین سوائے آنحضرت ﷺ کے ساتھ کسی دوسرے کو جانے اور آپ ﷺ کی نبوت مخصوص کسی طبقہ کے ساتھ مانے؛ وہ شخص میرے نزدیک بھی خارج از دائرہ اسلام اور کافر ہے؛ لہذا برنظر دور کرنے مظنہ عوام کے یہ اشتہار دیتا ہوں کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سوا نہ کوئی خاتم النبیین ہوا نہ ہوگا؛ پس خلاف اس عقیدہ کے غیر صحیح اور غلط تصور کیا جائے۔ المشتہر: محمد احسن نانوتوی۔ (حوالہ بالا: ص: ۸۸)

یہ سارے جتن کر چکنے کے بعد جب کوئی بات کارگر ثابت نہ ہوئی اور مولوی نقی علی خان فتوی کفر پر مصر رہے جو انہوں نے خود ساختہ تشریح کی بنیاد پر جاری کیا تھا تو ان حالات میں مولانا محمد احسن نانوتوی صدیقی نے درج ذیل استفتاء اسی اثر کے متعلق اس وقت کے

بڑے عالم" جامع المعقول والمنقول، فلسفی اور اسلام کے بڑے داعی ومناظر" حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی خدمت میں ارسال کیا:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بات میں کہ زید نے بہ تتبع ایک عالم کے جس کی تصدیق ایک مفتی مسلمین نے کی تھی درباره قول "ابن عباس رضی اللہ عنہ" جو درمنثور وغیرہ میں یوں ہے "ان اللہ خلق سبع ارضین، فی کل ارض آدم کآدمکم و نوح کنوحکم و ابراھیم کابراھیمکم وعیسی کعیسکم ونبی کنبیکم." کے متعلق یہ عبارت تحریر کہ میرا عقیدہ ہے کہ حدیث مذکورہ صحیح اور معتبر ہے اور زمین کے طبقات جدا جدا ہیں، ہر طبقہ میں مخلوق الٰہی ہے اور حدیث مذکورہ سے ہر طبقہ میں انبیاء کا ہونا معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اگرچہ ایک ایک خَتم کا ہونا طبقات باقیہ میں ثابت ہوتا ہے مگر ان کا مثل ہونا ہمارے خاتم النبیین کے ثابت نہیں اور نہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ وہ خاتم مماثل آنحضرت ﷺ کے ہوں، اس لیے کہ اولاد آدم جس کا ذکر "ولقد کرمنا بنی آدم" میں ہے اور سب مخلوقات سے افضل ہے تو بلاشبہ آپ ﷺ جو تمام مخلوقات سے افضل ہوئے پس دوسرے طبقات کے خاتم جو مخلوقات میں داخل ہیں آپ ﷺ کے مماثل کسی طرح نہیں ہوسکتے اور باوجود اس تحریر کے یہ کہتا ہے کہ اگر شرع سے اس کے خلاف ثابت ہوگا تو مان لوں گا، میرا اصرار اس تحریر پر نہیں، پس علماء شرع سے استفسار ہے کہ الفاظ حدیث ان معنوں کے متحمل ہیں یا نہیں اور زید بوجہ اس تحریر کے کافر یا فاسق یا خارج از اہل سنت و جماعت ہوتا ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔ (تحذیر الناس، مولانا محمد قاسم نانوتوی، قاسمی پریس دیوبند: ص:۲)

اس کے جواب میں جو تحریر مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے لکھی وہ ایک مکمل

رسالہ بن گیا اور ''تحذیر الناس'' کے نام سے چھپا، اس رسالہ کے آخر میں مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کا جواب بھی شامل ہے اور مفتی محمد نعیم کی تائید بھی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے اس مدلل جواب نے بحث کا رخ ہی موڑ دیا، ابھی تک تو ''اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ'' کی صحت وغیرہ پر مناظرہ ہو رہا تھا، چونکہ بظاہر اس کے صحیح نہ ہونے کی اصولی طور پر کوئی دلیل موجود نہ تھی، اس لیے صحت کا انکار ممکن نہ تھا، چنانچہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

''اس اثر ابن عباسؓ میں علت غامضہ بھی نہیں جو اس راہ سے انکار صحت کیجئے، کیونکہ اول تو امام بیہقی رحمہ اللہ کا اس کی نسبت صحیح کہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں کوئی علت غامضہ خفیفہ قادحہ فی الصحیحہ نہیں ہے۔'' (تحذیر الناس، مولانا محمد قاسم نانوتوی، قاسمی پریس دیوبند :ص:۲۸)

چونکہ بنیاد مولانا محمد احسن نانوتوی صدیقی صاحب کی تکفیر تھی اور یہ اس وقت کے حالات میں ان لوگوں کی ضرورت تھی اور ادھر مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی وضاحت اس بحث کو مکمل طور پر بند کر رہی تھی؛ اس لئے صاحبوں نے ''تحذیر الناس'' کی تین مختلف عبارتوں کو یکجا کر کے ایسا مضمون تیار کیا جس سے کفر لازم آتا ہو اور پھر اس مزعومہ مضمون کو اہل علم اور عوام کے سامنے اس طرح بیان کیا کہ جس سے مولانا محمد احسن صاحب کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی پر الزام دھرنے کی راہ نکالی جا سکے اور اپنے غیظ وقلب کو تسکین دلا سکیں، چنانچہ بعد ازاں مولوی نقی علی خان کے فرزند مولوی احمد رضا خان نے بھی اس کو بنیاد بنا کر ان باصفا اور ختم نبوت کے عقیدہ کے لیے جان کی بازی لگانے والوں کو اپنے فتوی کفر کا نشانہ بنایا، جس کی وضاحت سابق اوراق میں آچکی۔

استفتاء میں موجود حدیث کی اصولی حیثیت:

مذکور استفتاء میں جس اثر پر مفصل بحث کی گئی ہے وہ اصطلاح حدیث کے پہلو سے نہیں ہے؛ بلکہ عقلی و منطقی انداز میں عقل کے پرستاروں کو موقع حال کے مناسب دیا گیا جواب ہوسکتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذیل میں اسی اثر پر اصول حدیث کے اعتبار سے بھی غور فرمالیں:

حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ان اللہ خلق سبع ارضین، فی کل ارض آدم کآدمکم ونوح کنوحکم وابراھیم کابراھیمکم وعیسیٰ کعیسکم ونبی کنبیکم.

یہ حدیث ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر (تفسیر القرآن العظیم: سورۃ الطلاق، رقم الحدیث: ۱۸۹۱۸، ص: ۳۳۶۱، ج: ۱۰، ط: مکتبہ نزار مصطفیٰ باز مکۃ المکرّمہ) میں نقل فرمائی ہے، اگرچہ انہوں نے اس پر کوئی کلام نہیں فرمایا ہے۔

حاکم نے مستدرک (کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الطلاق، رقم الحدیث: ۳۸۲۲/۹۵۹، ص: ۵۳۵، ج: ۲، ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت) میں نقل فرمائی ہے، اس کے بعد لکھا ہے: ھذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ. اور علامہ ذہبی نے بھی امام حاکم کی تصحیح کو صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: نقد احادیث کے معاملہ میں امام حاکم بہت زیادہ متساہل مشہور ہیں، اسی لئے انہوں نے بہت سی ایسی حدیثوں کو علی شرط الشیخین یا علی شرط احدھما سمجھ کر اپنی کتاب میں درج کرلیا ہے جو درحقیقت بہت ضعیف ہیں۔ (درس ترمذی: ۱/ ۴۸، مکتبہ رشیدیہ، دیوبند)

لہذا اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ اس حدیث کا درجہ کیا ہے، اور سند بھی درجۂ صحت کو پہنچتی ہے یا نہیں؟ یہ حدیث شاذ کی قبیل سے ہے، اور شذوذ پیدا ہوا ہے ایک راوی مُرہ کے سبب، اسی لئے علامہ سیوطیؒ نے مذکور حدیث کے بارے میں امام حاکم کی تصحیح پر حیرت وتعجب کا اظہار فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں:

قال شيخ الإسلام : وبقي من كلام الحاكم: وينقدح في نفس الناقد أنه غلط ولا يقدر على إقامة الدليل على هذا ، قال: وهذا القيد لا بد منه ، قال : وإنما يغاير المعلل من هذه الجهة ، قال: وهذا على هذا أدق من المعلل بكثير فلا يتمكن من الحكم به إلا من مارس الفن، غاية الممارسة ، وكان في الذروة من الفهم الثاقب ورسوخ القدم في الصناعة ، قلت: ولعسره لم يفرده اَحد بالتصنيف ومن أوضح أمثلته ما أخرجه في المستدرك من طريق عبيد بن غنام النخعي عن علي بن حكيم عن شريك ، عن عطاء بن السائب عن أبي الضحى عن ابن عباس قال: في كل أرض نبي كنبيكم وآدم كآدم ونوح كنوح وإبراهيم كإبراهيم وعيسىٰ كعيسى، وقال الصحيح الإسناد ، ولم أزل أتعجب من تصحيح الحاكم له ؛ حتى رأيت البيهقي قال: إسناده صحيح ، ولكنه شاذ بمرة. (تدريب الراوي : ١٩٤/١ ،ط: اتحاد بکڈپو دیوبند)

پھر بھی اگر اس سند کی صحت کو تسلیم کرلیا جائے تو اس سے متن کی صحت لازم نہیں آتی ، اسی لئے محدثین نے اس کی صحت پر کلام کیا ہے، چنانچہ علامہ عجلونی تحریر فرماتے ہیں:

قال البيهقى فى الشعب (شعب الإيمان): هو شاذ بمرة، قال السيوطي : هذا من البيهقي في غاية الحسن ، فانه لايلزم من صحة الاسناد صحة المتن، لاحتمال

صحة الاسناد مع ان فی المتن شذوذا او علة تمنع صحته. (کشف الخفاء ومزیل الالباس : رقم الحدیث: ۳۱۶،باب الھمزة مع الراء ، ص:۱۰۰،ج: ۱،ط: عباس احمد باز مکة المکرمه)

جب یہی صورت حال ہے تو اب اس کے متن کی تحقیق یا تاویل ضروری ہے،اور یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ ہر دو زمینوں کے درمیان میں اتنا فاصلہ ہے کہ مستقل مخلوق اسی طرح آباد ہو سکے جس طرح دنیا میں انسان آباد ہے یا دو زمینوں کے درمیان کوئی فاصلہ ہی نہیں ہے یعنی تہ بہ تہ زمینیں ہیں،اس بارے میں محدثین کا اختلاف ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرضِ مِثْلَھُنَّ ، اس آیت سے اتنی بات تو واضح طور پر ثابت ہے کہ جس طرح آسمان سات ہیں ایسے ہی زمینیں بھی سات ہیں، پھر یہ سات زمینیں کہاں کہاں اور کس وضع وصورت میں ہیں؟ اوپر نیچے طبقات کی صورت میں تہ بر تہ ہیں یا ہر ایک زمین کا مقام الگ الگ ہے؟ اگر اوپر نیچے طبقات ہیں تو کیا جس طرح سات آسمانوں میں ہر دو آسمان کے درمیان بڑا فاصلہ ہے اور ہر آسمان میں الگ الگ فرشتے آباد ہیں،اسی طرح ایک زمین اور دوسری زمین کے درمیان بھی فاصلہ اور ہوا فضا وغیرہ ہیں، اور اُس میں کوئی مخلوق آباد ہے؟ یا طبقات زمین ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں،قرآن مجید اس سے ساکت ہے اور روایات حدیث جو اس بارے میں آئی ہیں،ان میں اکثر احادیث میں ائمہ حدیث کا اختلاف ہے ،بعض نے ان کو صحیح ثابت قرار دیا ہے،بعض نے موضوع ومنگھڑت تک کہہ دیا ہے۔(معارف القرآن: سورۃ الطلاق، آیت:۱۲،ص:۱۶۶،۱۶۷،ج:۸،ط: اشرفی بکڈپو)

تمام صورتوں اور جوابات کی تفصیلات سے یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ یہ موضوع تین امور کے ارد گرد دائر ہے،جو درج ذیل ہے:

(۱) حدیث کی کوئی مناسب تاویل کی جائے تا کہ محدثین کے دوسرے قول پر عمل ہو جائے اور متن بھی اپنی جگہ قابل تسلیم باقی رہے۔

(۲) روایت کو اسرائیلیات کی قبیل سے مان لی جائے۔

(۳) متن حدیث کو انتہائی ضعیف مانا جائے اور ضمنا اس سے ثابت معنی کی نفی ہو جائے۔

پہلے نمبر میں جو وضاحت ہے اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ ابن حجر ہیتمیؒ نے اپنے فتاوی میں لکھا ہے کہ یہ مقام ایسا ہے کہ اس میں ضعیف احادیث قابل قبول نہ ہوگی، بلکہ صحیح احادیث چاہئے، پھر بھی اگر اس معنی و مفہوم کو تسلیم کرلیا جاوے تو یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ اس سے مراد ہر زمین میں انسانوں کے علاوہ جن یا اور کوئی مخلوق ہے، اور ان میں ہر نبی کی طرف سے کچھ مبلغ اور نذیر موجود ہیں، اور ان زمینوں میں موجود مخلوقات ان مبلغین کو اسی نبی کے نام سے یاد کرتی ہے جس نبی کے یہ داعی اور مبلغ ہیں، اور ان کے اصلی ناموں سے یاد نہیں کرتے ہیں۔

قيل: هل آدم ومن بعده المذكورون فيما عدا الأرض الاولى من الإنس أو من غيرهم؟ وهل هم متعبّدون بمثل من تعبد في الأرض الأولى، وهل هم مقارنون لهم في زمنهم ، قال ابن حجر الهيتمي في فتاويه: إذا تبين ضعف الحديث أغنى عن تأويله لأن مثل هذا المقام لا تقبل فيه الأحاديث الضعيفة،

وقال: يمكن أن يؤول الحديث على أن المراد بهم النذر الذين كانوا يبلغون الجن عن أنبياء البشر، ولا يبعد أن يسمى باسم النبي الذي بلغ عنه انتهى فتدبر، فإنه لو صح في نبينا لم يستقم في غيره. (كشف الخفاء ومزيل الالباس :رقم الحديث :٣١٦،ص:١٠٠،ج:١،باب الهمزة مع الراء ،ط: عباس احمد باز مكة المكرمة)

جبکہ علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: جہاں ایسی حدیث پائی جائے جس کی تأویل بھی مشکل ہوتو اسے قائل کے حوالے کردینی چاہئے،ممکن ہے کہ یہ حدیث اسرائیلیات کی قبیل سے ہواور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسی طرح نقل کردیا ہو۔

وهو محمول ان صح نقله عنه على انه اخذه ابن عباس عن الاسرائيليات ،والله أعلم . (البداية والنهاية : باب ماجاء فی سبع ارضين، ص:٣١،ج:١،ط:دارالفكر العربی)

اور علامہ عجلونی ابن کثیرؒ کی مذکور عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: وذلك وامثاله اذا لم يصح سنده الى معصوم فهو مردود على قائله .انتهىٰ.(كشف الخفاء :حواله بالا)

تیسرے نمبر میں جو وضاحت ہے اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے ابوحیان اندلسی نے اس حدیث کوموضوع قراردیاہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں: وهذا حديث لاشك فی وضعه. (البحر المحيط: سورة الطلاق:آيت: ١٢،ص: ٢٠٥،ج:١٠، ط:المكتبة التجارية مكة المكرمة)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس حدیث کی سند کوصحیح قرار دینے میں بھی کلام ہےاوراگر

سند کو صحیح مان بھی لیں تو اس سے متن کی صحت لازم نہیں آتی ،اس کے باوجود اگر متن کو تسلیم کرلیں تو اس مسئلہ کا تعلق عقیدۂ ختم نبوت سے ہے اور اصولی واعتقادی مسائل میں صحیح احادیث قبول ہوتی ہے، انتہائی ضعیف یا جس حدیث کے حکم کے بارے میں شدید اختلاف ہو کہ بعض حضرات اس کو موضوع یا اسرائیلیات کی قبیل سے مانتے ہوں ایسی حدیث کسی طرح قبول نہیں کی جاسکتی۔

اور مذکور حدیث کی یا تو تاویل کی ہے یا اس کو اسرائیلیات یا موضوعات کی قبیل سے مانا ہے، رہا مسئلہ حاکم کی تصحیح کا تو ان کے اوپر تساہل کا الزام ہے اور خود ان کی تصحیح پر علامہ سیوطی اور دیگر حضرات محدثین نے حیرت وتعجب کا اظہار فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ محض ختم نبوت کو موضوع بنا کر مستقل بحث غالبا تحذیر الناس میں مفصل فرمائی ہو اور اس میں اصالۃً بحث تو مذکور اثر کے حکم کے بارے میں ہی ہے، باقی ہمارے سامنے موجود تمام کتابوں میں حضرت نانوتویؒ نے عقائد کے تمام موضوعات پر بحث فرمائی ہے، مستقل ایک موضوع پر بحث نہیں ہے ، چونکہ آپ کے دور میں تمام عقائدی موضوعات پر اعتراضات ومناظرے ہورہے تھے ،اور منطقی وعقلی دلائل سے گفتگو ہوا کرتی تھی، اس لئے آپ نے اعتراضات کے جوابات اور مباحثہ میں گفتگو انہیں دلائل کی روشنی میں فرمائی اور تمام موضوعات پر مفصل بحث فرمائی۔

مسئلہ ختم نبوت پر آپ کے مضامین ودلائل نہایت ہی جامع اور مفید ہے اور آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہے، آپ کے مضامین اسلام دشمن طاقتوں اور معترضین کے لئے دندان شکن اور خاموش کن ہے تو اہل اسلام کے لئے باعث تسکین ،آپؒ اپنے دور کی مختلف

تحریکات کا بحسن وخوبی تعاقب کے لئے کمر بستہ ہوئے اور کامیاب مقابلہ فرمایا۔

یہ حضرتؒ کی خدماتِ ختم نبوت پر مختصر روشنی ہے، دارالعلوم وقف دیوبند کے اہل انتظام وانصرام نے اس موضوع پر تحریر کا موقع فراہم کرتے ہوئے ہمیں سعادت بخشی، ہم ان کا دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کرتے ہیں اور دعاء ہے کہ اللہ پاک اس ادارہ کی ہمہ جہتی خدمات کو قبول فرمائے۔آمین..

صحابہ کا امتیازی وصف
اجتہادات میں مقاصد شریعت کی رعایت

اس مقالہ میں صحابۂ کرام کے بارے میں قرآنی بشارتیں، ان کی عظمت وافضلیت اور اس کے اسباب، صحابہ کا امتیازی وصف، خلافت کی اہمیت اور خلفاء راشدین کے فقہ واجتہاد میں مقاصد شریعت کی رعایت جیسے اہم عناوین پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، یہ مقالہ حیدر آباد ''عظمت صحابہ کانفرنس'' کی دعوت پر لکھا گیا تھا۔

صحابہ کا امتیازی وصف
اجتہادات میں مقاصد شریعت کی رعایت

الحمد لله رب العالمين ،والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلىٰ آله واصحابه اجمعين . **امابعد!**

اس کائناتِ رنگ و بو میں ازل ہی سے قدرت کا یہ نظام رہا ہے کہ ہر عہد میں خیر وشر کے درمیان رسہ کشی چلتی رہی ہے، پھر جب جب شر کا پلّہ بھاری ہونے لگا، اللہ تعالی نے خصوصی اوصاف کے حامل افراد کو مبعوث فرمایا کہ وہ اس معرکۂ خیروشر میں فیصلہ کن کردارادا کریں، اورصرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا؛ بلکہ انہیں ایسے لوگوں کی حمایت ونصرت سے بھی نوازا جو اپنی زندگی کی ہر ایک سانس نظام الٰہی کی اصلاح اور دین الٰہی کے قیام کی خاطر وقف کر چکے تھے، اس مبعوث شخصیت کو نبی اوران عظیم صفات کے حاملین افراد کو ہم حواریین اور صحابہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، جن کی عظمت کا ہر دور معترف رہا ہے۔

بعثت انبیاء کرام کا مبارک سلسلہ حضرت محمد ﷺ پر آ کر ختم ہو گیا کہ آپ آخری نبی قرار پائے ، اور آپ کی لائی ہوئی شریعت آخری دستور حیات قرار پائی ، دنیوی واخروی فلاح اسی دین وشریعت سے متعلق قرار دی گئی ،تو لازمی طور پر اس کی حفاظت کا انتظام بھی کچھ زیادہ خاص ہونا ضروری تھا، یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے قرآن کی بالخصوص اور مفاہیم وعلوم قرآن کی بالعموم حفاظت کی ذمہ داری لے لی ، اورسبب کے طور پر نبی ﷺ کی بابرکت

صحبت وہم نشینی کے لیے ان انفاس قدسیہ کا انتخاب فرمایا جو اپنی مثال آپ تھے، جنہوں نے نبی ﷺ سے ملنے والے قول وفعل کو ایک امانت وذمہ داری جان کر اس کی حفاظت کی اور اسے دوسروں تک پہونچایا، اگر وہ عظیم صحابہ اپنے مال وجان کی قربانی پیش نہ کرتے تو اس امانت کے اور اس آخری دین کے ہم تک پہونچنے کا ظاہری سبب کچھ نہ ہوتا۔

صحابہ کرام اور قرآنی بشارتیں:

ان صحابہ کرام کو اللہ رب العزت نے جہاں اس اہم ذمہ داری کے لیے قبول فرمایا، وہیں انہیں دائمی جنت اور اپنی رضامندی کا پروانہ بھی عطا فرمادیا، جو ان کے لئے سب سے بڑا اعزاز تھا، چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے: "رضي الله عنهم ورضوا عنه ، ذٰلك لمن خشيَ ربّه". (البينة:٨) جس میں عمومی طور پر تمام صحابۂ کرام کو رضامندی کی خوشخبری دی گئی ہے، نیز اللہ رب العزت نے صحابہ کی جانی ومالی قربانیوں کا ذکر کرنے کے بعد انہیں کامیابی کی بشارت دی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "لٰكن الرسول والذين آمنوا معه جٰهدوا بأموالهم وأنفسهم وأولئك لهم الخيرٰت وأولئك هم المفلحون ٥ أعدّ الله لهم جنٰت تجرى من تحتها الأنهٰر خٰلدين فيها ذلك الفوز العظيم". (التوبة:٨٨، ٨٩) اسی طرح نبی علیہ الصلوۃ والتسلیم اور صحابہ کو تسلی دی گئی کہ تکالیف پر غم ورنج نہ کریں، اللہ رب العزت آپ کے اور آپ کے متبعین کے لئے کافی ہیں، جیسا کہ سورۂ انفال میں ارشاد ہے: "يـأيها النبي حسبك الله ومن اتبعك من المؤمنين". (انفال:٦٤) **الغرض اللہ رب العزت** نے دنیا وآخرت میں صحابہ کرام کی کامیابی وابدی رضامندی کے حصول کا اظہار فرما کر تا ابد ان کی عظمت کا اعلان فرمادیا ہے۔

فضیلت صحابہ احادیث وآثار کی روشنی میں:

پھر دیکھیں کہ اصحاب رسول جس شمع نبوت کے نور سے مستفید ہورہے تھے، اس ذات اقدس نے بھی اپنے اصحاب کی مدح فرمائی اوران کی شان میں گستاخی کرنے یا زبان طعن دراز کرنے سے روکا ہے۔ چنانچہ صحیحین میں ذکرکردہ روایت: ”لاتسبُّوا أصحابي ، فلو أن أحدكم أنفق مثل أحد ذهبًا مايبلغ مُدّ أحدهم ولا نصيفه“. (بخاری:٣٦٨٣، مسلم: ٢٥٤٠) نیز ”خير أمتي قرني ، ثم الذين يلونهم ، ثم الذين يلونهم...“ (بخاری: ٣٦٥٠، مسلم:٢٥٣٥) اوراس جیسے ملفوظات اس کی واضح دلیل ہے کہ نبی ﷺ اپنے اصحاب کی پاکیزگی سے واقف تھے لہذا ان سے متعلق کسی طرح کی بدزبانی وبدگمانی کو یا بدخیالی وبدکلامی کو پسند نہیں فرماتے تھے، یہ گویا ان کی بیش بہا خدمات اور بے لوث کوششوں کا اعتراف تھا، یہی نہیں بلکہ یہ اصحاب آپس میں ایک دوسرے کی عزت افزائی، تکریم وتقدیم میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔

حضوراقدس ﷺ کے فیض یافتہ ایک صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے عجیب تاریخی درس دیا؛ چنانچہ فرماتے ہیں: ”من كان مستنا فليستن بمن قد مات ، فإن الحي لا تؤمن عليه الفتنة ، أولئك أصحاب محمد ﷺ ، أبرّهم قلوباً ، أعمقها علما، أقلّها تكلّفا، اختارهم الله لصحبة نبيه ولإقامة دينه، فاعرفوا لهم فضلهم ، واتبعوهم على آثارهم ، وتمسكوا بما استطعتم من أخلاقهم وسيرتهم ؛ فإنهم كانوا على الهُدى المستقيم“. (مشكوٰة عزوا إلى رزين برقم: ١٩٣) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جولوگ وفات پاچکے ان کی اقتدا کرنا بہتر ہے مقابل اس کے کہ زندہ شخص کی پیروی کی جائے

؛ کیونکہ زندہ شخص کے فتنہ میں ملوث ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، مزید یہ کہ صحابہ کرام اقتدا کیے جانے کے سب سے زیادہ اہل ہیں جو نہایت درجہ کے نیک دل، گہرے علم کے حامل اور تکلفات کے بوجھ سے خالی ہیں، اقامت دین اور رسول اللہ ﷺ کی رفاقت کے لیے اللہ تعالی نے انہیں منتخب فرمایا، جس کا لازمی اثر یہ ہونا چاہیے کہ ان کی قدر ومنزلت کو جان کر ان کی اتباع کی جائے، اور جہاں تک ممکن ہو ان کے اخلاق حمیدہ کو خود میں پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے کہ وہ لوگ راہ راست کے مسافر ہیں۔ نیز امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں سند صحیح سے آپ ہی کا ایک اور قول نقل کیا ہے کہ آپؓ فرماتے ہیں: ”إن الله نظر في قلوب العباد ، فوجد قلب محمد ﷺ خير قلوب العباد ، فاصطفاه لنفسه ، فابتعثه برسالته ، ثم نظر في قلوب العباد بعد قلب محمد ، فوجد قلوب أصحابه خير قلوب العباد ، فجعلهم وزراء نبيه، يقاتلون علىٰ دينه ، فما رأى المسلمون حسنًا فهو عندالله حسن، وما رأوا سيئاً فهو عند الله سيئ“. (مسند أحمد: ٣/٥٠٥،٥٠٦، برقم: ٣٦٠٠) جس کا مفہوم ہے کہ اللہ رب العزت نے محمد ﷺ کے قلب مبارک کو سب سے بہتر دل پایا، چنانچہ اسے اپنے لیے منتخب فرمالیا، پھر بندوں میں سے اصحاب محمد کے قلوب کو سب سے زیادہ پاکیزہ پایا تو انہیں اپنے نبی کی رفاقت وحمایت کے لیے منتخب فرمالیا، لہذا جس چیز کو اہل اسلام پسندیدہ سمجھیں وہ اللہ کے یہاں بھی پسندیدہ ہوتی ہے، اور جس چیز کو وہ برا سمجھیں تو وہ اللہ کے یہاں بھی ناپسندیدہ ہے۔

عظمت صحابہ کے اسباب:

یہاں پہونچ کر ہمارے ذہن میں یہ سوال بیدار ہونے لگتا ہے کہ وہ کیا اسباب

تھے اور وہ کونسی صفات تھیں جنہوں نے صحابہ کرام کو اتنے بلند مرتبہ پر فائز کر دیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہمارے لیے اس سوال کا جواب دینا اس لئے بہت مشکل ہے کہ اگر ایک دو وصف یا چند اسباب ہوتے تو انہیں ذکر کرنے پر اکتفا کر لیتے، لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ اسباب عظمت اور اوصاف حمیدہ کی لمبی فہرست ہے، اور پھر یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار ہے کہ کس بات کو ذکر کریں اور کسے ترک کریں، البتہ چند اقتباسات پیش خدمت ہیں، جو اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ صحابہ کیوں عظیم تھے۔

چنانچہ علامہ ابن عبد البر مالکیؒ لکھتے ہیں: ''......وثبتت بهم حجة الله عزوجل على المسلمين، فهم خير القرون وخير أمة أخرجت للناس ، ثبت عدالة جميعهم بثناء الله عزوجل عليهم وثناء رسوله ﷺ ، ولا أعدل ممن ارتضاه الله لصحبة نبيه ونصرته ، ولا تزكية أفضل من ذلك ولا تعديل أكمل منها ، قال الله عزوجل ذكره :محمد رسول الله، والذين معه أشداء على الكفار رحماء بينهم ...، فهذه صفة من بادر إلى تصديقه والإيمان به وآزره ونصره ولصق به وصحبه ....'' (الاستیعاب: ۵/۱) کہ یہ صحابہ ہی ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالی نے مسلمانوں پر حجت تام فرمائی ہے، جو صرف اپنے ہی زمانہ کے نہیں بلکہ ساری امت کے سب سے بہترین لوگ ہیں ،اللہ تعالی اور اس کے رسول نے ان صحابہ کی تعریف فرما کر ان کی پاکیزگی پر مہر لگا دی ہے، اور جس کو اللہ رب العزت اپنے نبی کی رفاقت اور اس کی مدد کے لیے منتخب فرمالے اس کے لئے اب کوئی مزید تصدیق وشہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔

اسی طرح ساتویں صدی ہجری کے مشہور عالم حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :

"الصحابة كلهم عدول عند أهل السنة والجماعة، لما أثنى الله عليهم في كتابه العزيز ، وبما نطقت به السنة النبوية في المدح لهم في جميع أخلاقهم وأفعالهم وما بذلوه من الأموال والأرواح بين يدي رسول الله ﷺ ، رغبة فيما عند الله من الثواب الجزيل والجزاء الجميل". (الباعث الحثيث:١٧٦،١٧٧)

ماضی قریب کی عبقری شخصیت حضرت مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں: یہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے ساتھی، آپ کی تعلیمات کو تمام دنیا اور اپنے زن و فرزند اور اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھنے والے، آپ کے پیغام کو اپنی جانیں قربان کر کے دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلانے والے ہیں، ان کی سیرت رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا ایک جزو ہے، یہ عام دنیا کی طرح صرف کتب تاریخ سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ نصوص قرآن وحدیث اور سیرت رسول اللہ ﷺ سے جانے پہچانے جاتے ہیں، ان کا اسلام اور شریعت اسلام میں ایک خاص مقام ہے"۔ (مقام صحابہ:ص:۸)

اسی طرح ملک شام کے صاحب قلم ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے عظمت صحابہ کے کچھ اسباب شمار کروائے جو اس طرح ہیں:

الف: صحابہ کرام آپ ﷺ پر نازل ہونے والی ہر آیت اور آپ ﷺ سے صادر ہونے والے ہر ہر عمل کو محفوظ کرنے کے عادی تھے۔

ب: زبان عربیت میں پختگی اور اس کے اتار چڑھاؤ سے کامل واقفیت رکھتے تھے۔

ج: صحابہ کرام فطرتاً معاملہ فہم اور بہت جلد مسئلہ کی تہہ میں پہونچ جانے والے تھے۔

د: دین کی زیادہ سے زیادہ اور صحیح فہم کے حصول کی سچی تڑپ ان میں موجود تھی۔

ہ :اخلاص کے اعلی مراتب پر فائز تھے۔

و:انوار نبوت کا مسلسل مشاہدہ کرنے کی وجہ سے روحانی کیفیت کا عروج انہیں حاصل تھا۔

ز: قرآنی احکامات اور سیرت نبی ﷺ کا عملی نمونہ بننے کی جستجو کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جہاں کوئی وضاحت مطلوب ہوتی فوراً بارگاہ رسالت کا رخ کرتے تھے۔(فقہ حضرت ابوبکرؓ (مترجم)،ص:۱۲،۱۳)

صحابہ کا امتیازی وصف:

علامہ ابن الجوزیؒ نے صحابہ کرام کا ایک امتیازی وصف یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ وہ حضرات ان مسائل میں اجتہاد کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے جن میں انہیں کوئی واضح نص نہ ملی ہو، اور خود نبی ﷺ نے انہیں اس کی تربیت دی تھی، چنانچہ حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے ہوئے نبی ﷺ نے پوچھا کہ اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جو تمہیں قرآن وحدیث میں نہ ملے تو تم کیا کروگے؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا: "أجتهد رأيي ولا آلو"، کہ میں وہاں اجتہاد سے کام لوں گا اور کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونے دوں گا۔آپ کے اس جواب سے نبی ﷺ خوش ہوئے اور آپ کی تصویب فرمائی۔اسی طرح آپ ﷺ نے چند صحابہ کو غزوہ اُحزاب کے موقع پر حکم دیا تھا کہ وہ عصر کی نماز بنو قریظہ پہونچ کر پڑھیں، آپ کے اس حکم کو بعض صحابہ نے ظاہر پر محمول کیا اور رات میں جب بنی قریظہ پہونچے تب نماز عصر ادا کی، جبکہ دیگر صحابہ نے کہا کہ اس حکم کا مقصود یہ تھا کہ ہم جلد بنو قریظہ میں پہونچ جائیں، لہذا انہوں نے وقت ہونے پر نماز ادا کر لی۔(اعلام الموقعین:۱/۲۰۲،۲۰۴)

الغرض یہ چند جھلکیاں ہیں ان انفاس عالیہ اور بابرکت شخصیات کی، جنہوں نے

براہ راست درسگاہ نبوی سے سیرابی حاصل کی اوراعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر دین کی ایک ایک بات ہم تک پہونچائی، ان تمام باتوں سے جہاں صحابہ کرام کی عظمت ومنزلت کا پتہ چلتا ہے ،وہیں ان کی دینی سوچ واسلامی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ترتیب خلافت کی اہمیت:

اس کے بعد ہمیں ایک اور حقیقت جاننے کو ملتی ہے، وہ یہ کہ ان تمام صحابہ کرام میں افضل ترین صحابہ چار ہیں جو نبی ﷺ کے وصال کے بعد آپ کے نائب اور خلیفہ بنے، جن کے نام بالترتیب یوں ہے: ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم، اور اسی ترتیب کے ساتھ اللہ رب العزت نے ان کے لیے منصب خلافت کا انتخاب فرمایا تھا، کہ نبی ﷺ کے وصال کے بعد جیسے جیسے حالات میں تبدیلی آئی ویسے ویسے ان حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے ایسے خلیفہ کا انتخاب کیا گیا جو اس ذمہ داری کو اس کی اہمیت سمجھ کر درست انداز میں ادا کر سکے، بقول مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ کے کہ جس طرح نظام شمسی ایک مخصوص طرز پر کارگر ہے اور تقدیر الٰہی کی جانب مشیر ہے اسی طرح مسند خلافت پر جس ترتیب سے جو شخصیتیں آئیں اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا، یہ بالکل "ذلك تقدير العزيز العليم" کا مظہر ہے۔

حضرت ابوبکرؓ بحیثیت خلیفہ:

چنانچہ ذرا نگاہ بصیرت کو وا کر کے دیکھیں تو یہ منظر سامنے آتا ہے کہ نبی ﷺ داعی اجل کو لبیک فرما چکے ہیں، صحابہ کرام کو کسی ایسے قائد کی ضرورت ہے جو اسی نہج پر ان کی تربیت کرے جس پر وہ نبی کے زمانہ میں تھے، سقیفۂ بنی ساعدہ میں ہونے والے چند

مشوروں کے بعد اور بالخصوص حضرت عمرؓ کی مخلصانہ جدوجہد کے بعد تقدیر الٰہی سے حضرت ابوبکر صدیقؓ زمام خلافت سنبھالتے ہیں ،اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت کے حالات میں آپ ہی اس قابل تھے ،مشکل سے مشکل وقت میں جان ومال کی بے مثال قربانیاں پیش کرنے اور تعلق مع اللہ میں نیز حقوق العباد کی رعایت میں اپنی مثال آپ تھے، نیز مذہب اسلام کے لیے آپ کی غیرت وحمیت سب سے زیادہ تھی ،یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا: "أینقص الدین و أنا حيّ" کہ ابوبکر کے جیتے جی احکام اسلام میں کمی زیادتی ہونے لگے؟ گویا یہ آپ کی دینی غیرت کے خلاف تھا، اسی دینی حمیت کا نتیجہ تھا کہ آپ نے تمام صحابہ کے لاکھ سمجھانے کے باوجود مانعین زکوۃ کے خلاف جہاد کا حکم دیا؛ حتی کہ صحابہ کو بھی شرح صدر ہوگیا، اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ آج زکوۃ کی ادائیگی سے انکار کررہے ہیں، توکل روزہ کی باری ہوگی اور پھر حج کا مرحلہ آئے گا، اس طرح احکام اسلام کی دینی حیثیت یکسر ختم ہوجائے گی، لہذا آپ نے فرمایا: "واللہ لأقاتلن من فرّق بین الصلاۃ والزکوۃ ؛ فإن الزکوۃ ھو حق المال" کہ جو انسان نماز وزکوۃ میں فرق کرے ہم اس سے ضرور جہاد کریں گے، کیونکہ زکوۃ تو مال پر واجب ہونے والا حق ہے۔

اسی طرح آپؓ نے دوسرا عہد ساز فیصلہ یہ فرمایا کہ نبی ﷺ نے یہ تمنا ظاہر فرمائی تھی کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کو لشکر دے کر رومیوں سے مقابلہ کے لیے بھیجا جائے ، حضرت ابوبکرؓ نے اس نازک موقع پر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اور اس فلسفہ پر یقین رکھتے ہوئے کہ منشأ نبوی کی تکمیل پر نصرت الٰہی کا نزول یقینی ہے لشکر روانہ فرمادیا، اور ہوا بھی یہی کہ اُدھر اللہ تعالی نے لشکر اسلام کی حمایت فرمائی اور ادھر مدینہ منورہ میں موجود اہل اسلام کی

حفاظت فرمائی، اس طرح فتنۂ ارتداد کا قلع قمع فرما کراور غیر اسلامی سلاطین کے دلوں میں اسلام کی ہیبت بٹھا کر حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دی اور نبی ﷺ سے جا ملے۔

حضرت عمرؓ مسند خلافت پر:

آپؓ کے بعد امت اسلامیہ کو ایک ایسے نگران کی ضرورت محسوس ہوئی جو دین کے اس قلعہ کی حفاظت کرے اور حضرت ابوبکرؓ کی محنتوں کو ضائع ہونے سے بچائے، فتوحات اور مال کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہونے والی اخلاقی بیماریوں کا توڑ جانتا ہو اور اسلام کا سچا و مخلص خادم ہو، چنانچہ خلافت کی باگ ڈور حضرت عمرؓ کے ہاتھوں میں دی گئی جن میں یہ تمام اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے، آپ نے اونٹ کا گوشت کھانے والے اور کافور کو نمک سمجھ کر استعمال کرنے والے سادہ لوح مسلمانوں کی ایسی خدمت کی کہ انہیں جادہ حق سے ہٹنے نہ دیا، سادگی کا وہ نمونہ پیش کیا کہ تمدن وتہذیب کی نئی چمک دمک اور قیصر وکسریٰ کے خزانوں کی کھنک نے مسلمانوں کو متأثر نہیں ہونے دیا، عدل وانصاف کا وہ معاشرہ قائم کیا کہ وقت آنے پر خود اپنے لڑکے کو درے لگوائے اور حضرت عمرو بن عاصؓ کے صاحبزادہ کو قبطی سے کوڑا لگوایا، اور دنیا کو یہ سبق دیا کہ عدل وانصاف کے بغیر کوئی قوم وتہذیب ترقی نہیں پاسکتی اور مذہب اسلام کے بغیر یہ دنیا ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔

حضرت عثمانؓ بحیثیت خلیفۃ المسلمین:

حضرت عمرؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو خلافت کی یہ ذمہ داری حضرت عثمان

رضی اللہ عنہ کے کاندھوں پر آئی جو ذوالنورین تھے، نبی ﷺ کی دو چہیتی لڑکیوں سے نکاح کرنے کا عظیم شرف آپ کو حاصل ہوا تھا، مجسم حیا تھے، آپ نے دیکھا کہ ارتداد کی ہوائیں تھم چکی ہیں، عدل وانصاف بھی قائم ہو چکا ہے لیکن اب ایک چیز کی ضرورت ہے، اور وہ یہ کہ اسلامی ملک کے قیام کے لیے اور اس کی توسیع کے لیے ایسے افراد کا انتخاب ہو جو صرف ملازم اور جوابدہ ہوکر ذمہ داری نہ نبھائیں بلکہ گھر کے ایک فرد کی طرح مخلصانہ طور پر اور رضا کارانہ انداز میں دین اسلام کی آبیاری کریں، چنانچہ تاریخ گواہی دینے پر مجبور ہے کہ آپؓ نے ایسے حضرات کا انتخاب فرمایا جو آپ سے دینی رشتہ بھی رکھتے تھے اور خونی رشتہ بھی، آپؓ کی اس دور اندیشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپؓ کے عہد میں قبرص اور افریقہ کا بڑا حصہ اور شیراز واصفہان، طبرستان وسجستان اور نیشاپور وغیرہ اسلام کے پرچم تلے آ گئے، اور پھر وہیں سے بخاری ومسلم جیسے محدث، ابوحنیفہ ومالک، شافعی واحمد جیسے فقیہ، محمد وابویوسف جیسے قانون ساز اور عقبہ بن نافع اور طارق بن زیاد جیسے محافظ پیدا ہوئے؛ بالآخر منافقین کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوکر آپؓ نے جام شہادت نوش فرمالیا لیکن اس نیابت سے دستبردار نہیں ہوئے جو انہیں نبی ﷺ سے ملی تھی، اور نہ ہی یہ گوارا کیا کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کا خون بہائیں۔

حضرت علیؓ اور زمام خلافت:

آپؓ کی شہادت کے بعد منجانب اللہ حضرت علیؓ کا انتخاب ہوا کہ اب اس ذمہ داری کو وہ سنبھالیں، چنانچہ آپؓ نے سیاسی اصولوں اور سیاسی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر

خالص دینی منافع کو ترجیح دی، سلطنت اسلامی کے عاملین کا محاسبہ کرنے میں ذرا بھی نہ جھجکتے اور ستّو کھا کر عالم اسلام کی حفاظت فرماتے ،ایک مقدمہ کے سلسلہ میں یہودی کے حق میں اورآپ کے خلاف قاضی نے فیصلہ سنایا لیکن آپ کی جبین پر شکن تک نہیں آئی ،اپنی خلافت کے عہد میں آپ نے اندرونی فتنوں اورآپسی انتشار کو دفع کرنے کی بہترین مثال قائم فرمائی اور مسلمانوں کو درس دیا کہ اندرونی اختلافات سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔تو یہ ہے وہ ترتیب خلافت جسے اللہ تعالی نے اوراس کے رسول ﷺ نے منتخب کیا اور پھر تمام صحیح العقیدہ مسلمانوں نے اُسے بصدق قلب قبول کیا۔

خلفاء اربعہ کی افضلیت کی وجہ:

ان چاروں کوان کی دینی خدمات، نبوی زندگی سے بہت درجہ مشابہت اور مزاج رسول ومنشأ خداوندی کی صحیح سمجھ کی بنا پر یہ فضیلت حاصل ہوئی تھی کہ دین اسلام کی حفاظت وبقااور غیر اسلامی امور کی دراندازی سے حفاظت کی خاطر ان حضرات نے روشن کارنامے انجام دیئے، جن میں سے ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ شریعت اسلامیہ کی روح کو درست انداز میں سمجھ کر، اس کے مقاصد کو جان کر ایسے اصول وضوابط متعین فرمائے جو پوری دنیا تک کی انسانیت کے لیے مشعل راہ ہیں، اور جنہیں بعد کے علماء نے ''مقاصد شریعت'' کے عنوان سے ایک مستقل فن کی حیثیت سے شمار کیا ہے۔

مقاصد شریعت کا مختصر تعارف:

اس اجمال کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے مقاصد شریعت کا مختصر تعارف ضروری محسوس ہوتا ہے ؛ تاکہ صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کی فقہی بصیرت اور مذہب

اسلام کی بہترین نمائندگی ہمارے سامنے آسکے، اوران حضرات کی زندگیوں کے اس باب پر بھی کچھ روشنی پڑ سکے کہ یہ بھی ان کی عظمتوں کا اہم سبب ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ مقاصد شریعت کی بنیاد ''دفع مضرت وجلب منفعت'' کے قانون پر قائم ہے کہ شریعت اسلامی کے تمام مامورات ومنہیات میں سے کوئی بھی حکم جلب منفعت یا دفع مضرت کی غرض سے خالی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ متقدمین ومتأخرین میں سے امام الحرمین عبدالملک جوینی (م:۴۷۸ھ) سے لے کر محمد طاہر بن عاشور (م:۱۹۷۳ء) تک اور ان کے بعد آنے والے متعدد ارباب علم ودانش نے اپنی تحریرات میں مقاصد شریعت کو بہت واضح انداز میں پیش کیا ہے، ان تمام حضرات کی یہ علمی کاوشیں درحقیقت رسول اللہ ﷺ کے مزاج اور خلفاء راشدین وصحابہ کرام کی طبائع سلیمہ کا طویل مطالعہ کرنے کے بعد ہی معرض وجود میں آئیں، جس سے جہاں ان حضرات کی قوت فکر واجتہاد کا پتہ چلتا ہے وہیں رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام کے دینی افکار کی عکاسی ہوتی ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر احکام شریعت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ اللہ رب العزت نے انسان کو مکلّف بنایا ہے، جس کا لازمی پہلو یہ ہے کہ انسان کو جو بھی حکم دیا جائے گا یا جس کام سے روکا جائے گا اس میں یقیناً کوئی مصلحت ضرور ہوگی؛ کیوں کہ اللہ رب العزت کی ذات حکیم ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ: "فعل الحکیم لایخلو عن حکمة" جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تمام احکام اسلام کسی نہ کسی حکمت سے متصف اور مصلحت پر مبنی ضرور ہیں، ان مصلحتوں اور حکمتوں کو بعد کے علماء

نے کبھی ''مصالح مرسلہ'' کا نام دیا،تو کبھی ''مقاصد شریعت'' کا نام دیا کہ علماء نے احکام شریعت میں غور وفکر کرنے کے بعد ان کا استنباط کیا اور پھر جہاں جس مسئلہ میں کوئی واضح جواب نہ ملے ،وہاں مقاصد شریعت ہی کی روشنی میں نصوص سے ہی استفادہ کرکے اس کا جواب دے دیا۔

امام غزالیؒ کی شخصیت ان چند لوگوں میں سے ہے جنہوں نے اس جانب سب سے پہلے توجہ کی ،چنانچہ اپنی مشہور کتاب "المستصفیٰ" میں فرماتے ہیں: "مقصود الشرع من المخلوق خمسة: وهو أن يحفظ عليهم دينهم ونفسهم وعقلهم ونسلهم ومالهم ، فكل مايتضمن حفظ هذه الأصول الخمسة فهو مصلحة ، وكل مايفوت هذه الأصول فهو مفسدة، ودفعها مصلحة". (المستصفیٰ :۱/ ۲۷۸) یعنی شریعت مخلوق سے پانچ چیزوں کا تقاضہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ لوگ اپنے دین، جان، عقل، نسل واولاد اور اپنے مال کی حفاظت کریں،لہذا جو حکم ان پانچوں اسباب میں سے کسی ایک پر مشتمل ہوگا اسے اس حکم کی مصلحت سمجھا جائے گا ،اور وہ کام جو ان مصالح کو ضائع کرنے کا سبب بنے ،اسے مفسدہ سمجھا جائے گا اور اسے دور کرنا مصلحت شمار ہوگا۔

امام غزالیؒ کی اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ مقاصد شریعت کل پانچ ہیں:

۱) حفظ دین: یعنی دین اسلام کے وہ تمام احکام جن کا تعلق براہ راست دین سے ہو ان کے تحفظ کا خیال کرنا،انہیں بجالانا اور ان کی عدم ادائیگی سے اجتناب کرنا۔

۲) حفظ نفس: اس سے مراد یہ ہے کہ انسان جس طرح احکام شریعت کا مکلّف ہے اسی طرح اس بات کا بھی مکلّف ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کرے، اسے ہلاکت

میں نہ ڈالے، ان اشیاء کا استعمال نہ کرے جو جان لیوا ہوسکتی ہیں،اسی طرح شریعت کا قانون قصاص و دیت بھی اسی مقصد پر مبنی ہے۔

۳) حفظ عقل: دنیا کی دیگر مخلوقات میں اور انسان میں صرف ایک فرق ایسا ہے جو اسے فوقیت دیتا ہے،اور وہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے عقل کی نعمت سے نوازا ہے، اسی لیے اس کی حفاظت کرنا انسان کی اہم ذمہ داری ہے ،شریعت میں شراب ومخدّرات کی حرمت،سفیہ کے تصرفات پر روک اور اس جیسے مسائل اس حکمت سے متعلق ہیں۔

۴) حفظ نسل: نسل کی حفاظت کرنا ایک ایسا جذبہ ہے جو قدرت کی طرف سے انسان میں فطری طور پر رکھا گیا ہے،اور شریعت نے اسی کی رعایت کرتے ہوئے زانی کے لیے سخت ترین سزا، نیز بہتان تراشنے پر حدقذف جاری کرنے کا حکم دیا، حضانت اور حرمت اختصاء کا تعلق بھی اسی مقصد کے تحت آتا ہے۔

۵) حفظ مال: شریعت اسلامیہ نے طلب رزق حلال کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اس پر ابھارا بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مستحکم معاشی نظام کو پسند کیا گیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے دھوکہ، جوا،رشوت خوری،سود،ظالمانہ ٹیکس،ڈاکہ زنی اور ان جیسے دیگر معاشی جرائم پر سخت سے سخت دنیاوی سزا اور اخروی وعید کے ذریعہ قابو پانے کی کوشش کی گئی۔

مدارج شریعت:

الغرض شریعت کے تمام احکام کی مقصدیت ان پانچوں میں سے کسی ایک کو

اپنے اندر یقیناً سموئے ہوئے ہوگی، پھرایک اور بات واضح کرنا ضروری ہوجاتا ہے کہ علماء اصولیین کی تحقیق وتنقیح کے مطابق ان پانچوں مقاصد میں سے ہرایک کاتعلق مدارج شریعت سے ضرورہوتا ہے ،اور مدارج شریعت تین ہیں: (۱) ضروریات(۲) حاجیات (۳) تحسینیات۔

عصر حاضر کے مشہوراور مقاصد شریعت پر گہری نظر رکھنے والے عرب عالم دکتور یوسف حامد العالم اپنی کتاب "المقاصد العامة للشريعة الإسلامية" میں ان کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں: "والمقاصد الضرورية: وهى ما لابد منها لقيام نظام العالم وصلاحه بحيث لايبقى النوع الإنسانى مستقيم الحال بدونه"، یعنی مقاصد ضروریہ سے وہ مقاصد مراد ہیں کہ نظام زندگی کے قیام اوراس کے سدھار کے لیے ان کا ہونا ضروری ہو، اگر وہ نہ ہوں تو انسانوں کا درست حالت میں باقی رہنا ناممکن ہوجائے۔ پھر فرماتے ہیں:"الحاجيات :وهو ماتدعو حاجة الناس إليه من غير أن يصل إلى حدّ الضرورة"، یعنی حاجیات سے مراد وہ مقاصد ہیں جوضرورت کی حدتک تو نہ پہونچیں لیکن لوگوں کواس کی کمی کا احساس ہوتا ہواوروہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔آگے تحسینیات سے متعلق لکھتے ہیں:"التحسينيات : وهو ما لا يرجع إلىٰ ضرورة ولا إلى حاجة، ولكن يقع موقع التحسين والتزيين والتوسعة والتيسير للمزايا والمراتب، ورعاية أحسن المنهاج في العبادات والعادات والمعاملات والحمل علىٰ مكارم الأخلاق ومحاسن العادات"، کہ تحسینیات ان مقاصد کو کہتے ہیں جوضرورت وحاجت کے درجہ کو تو نہیں پہونچتے ہیں،لیکن ان کی رعایت کرنا احکام اسلام کی ادائیگی میں حسن

وجمال پیدا کرتا ہے، جن احکام میں مختلف پہلو ہوں یا مختلف مراتب ہوں وہاں ان مقاصد کی رعایت وسعت وسہولت کا سبب بنتی ہے، اسی طرح عبادات وعادات اور معاملات میں بہتر طریقہ کی رعایت کا سبب بن کر اخلاق حسنہ وخصائل حمیدہ سے متصف ہونے پر ابھارتی ہیں۔(المقاصد العامة للشريعة الإسلامية : ١٦١-١٦٤)

اجتہادات خلفاء راشدین اور مقاصد شریعت کی رعایت:

اس تمہید کے بعد دیکھیں کہ خلفاء راشدین نے اپنے اپنے عہد خلافت میں مقاصد شریعت کی رعایت کس حد تک کی، یا بالفاظ دیگر خلفاء راشدین کے عہد زریں میں ظاہر ہونے والے وہ امور جو بعد میں مقاصد شریعت کی ترویج کے لیے بنیاد بنے وہ دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ جن کا تعلق عبادات سے یا عائلی زندگی کے مسائل جیسے نکاح وطلاق اور میراث وغیرہ سے ہے، اور دوسرے وہ ہیں جن کا تعلق معاملات، حدود وجنایات اور حکومت شرعیہ وغیرہ سے ہے، خلفاء اربعہ نے ان مسائل میں نصوص کی اور نبی ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں اجتہاد فرما کر اور مقاصد شریعت کی کلّی رعایت کرتے ہوئے بہت سے مشکل مسائل کو حل فرمالیا۔

زکوۃ کے باب میں حضرت ابوبکرؓ کا اجتہاد:

چنانچہ زکوۃ کے باب میں دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ فرضیت زکوۃ اور اس کی اہمیت کا مکمل شعور صحابہ کرام کو تھا، یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ کے وصال کے بعد جب ایک طبقہ نے ادائے زکوۃ سے انکار کر دیا اور ارتداد کی ہوائیں چلنے لگیں تو خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کا حکم دیا، جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ذرا توقف سے کام

لیا جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے آپ کو تنبیہ فرمائی اور مانعین زکوۃ سے علی الفور جہاد کرنے کا حکم دیا جس پر بعد میں حضرت عمرؓ بھی مطمئن ہو گئے۔

اب غور فرمائیں تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اگر ان مانعین زکوۃ کو مہلت مل گئی تو دوسرے قبائل بھی ان کے ساتھ ہو جائیں گے اور کفر وردّت کا شکار ہو کر بغاوت پر اتر آئیں گے، جس میں دین اسلام کا بڑا نقصان ہو سکتا ہے، جبکہ حضرت عمرؓ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ان مرتدین و مانعین زکوۃ کا مقابلہ کرنے کے لیے جتنی قوت وطاقت کی ضرورت ہے اس کا انتظام ہونے تک تھوڑا انتظار کر لیا جائے، تو یہ ان دونوں حضرات کے اپنے اجتہاد تھے جو مقصد حفظ دین اور دفع مضرّت پر مبنی تھے، یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ کرام نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فتنۂ ارتداد کا قلع قمع فرمایا۔

علامہ ابن العربی نے اسی بات کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ”لما مات رسول الله ﷺ ،ارتدّ العرب وانقاض الإسلام، وتزلزلت الأفئدة وماج الناس ؛ فارتاع الصحابة، فقال عمر وغيره لأبي بكر: خُذ منهم الصلاة ، ودع الزكاة حتى يتمكن الدين ويسكن جأش المسلمين فقال أبو بكر رضي الله عنه : والله لأقاتلنّ من فرّق بين الصلاة والزكاة ، والله لو منعوني عقالا كانوا يؤدونه إلى رسول الله ﷺ لقاتلتهم عليه“. (اجتهاد الخلفاء الراشدين الأربعة : ١٤١، بحواله أحكام القرآن لابن العربي)

تراویح میں حضرت عمرؓ کا اجتہاد:

اسی طرح تراویح کا مسئلہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ بعض افراد تنہا اور بعض

جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں؛ چنانچہ آپؓ نے تمام لوگوں کو ایک امام کی اقتداء میں باجماعت تراویح پڑھنے کی نیت سے حضرت أبي بن کعبؓ کے پیچھے جمع فرمایا، علامہ باجی فرماتے ہیں:"فبان أن ذلك فيما أدّى إليه اجتهاده ورأيه واستنباطه ذٰلك من إقرار النبيﷺ الناس على الصلاة معه في الليلتين، وقيامه ذلك علىٰ جمع الناس علىٰ إمام واحد في الصلوات المفروضة، ولما في اختلاف الأئمة من اختلاف الكلمة وأسباب الحقد". (المنتقىٰ للباجي: ١/٢٠٧)

آپ کا یہ عمل دفع مضرت کے اصول پر مبنی تھا، کیوں کہ آپ کو اندازہ تھا کہ اگر اس صورت کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو مستقبل میں اختلافات شدید ہوسکتے ہیں، تو ان اختلافات کو دور کرنے اور امت اسلامیہ کی صفت اتحاد و اتفاق باہمی کو باقی رکھنے کی غرض سے آپ نے یہ کام انجام دیا۔

مؤلفۃ القلوب اور حضرت عمرؓ کا اجتہاد:

اسی قسم کا ایک مسئلہ مؤلفۃ القلوب کا ہے، جنہیں قرآن نے مصارف زکوۃ میں سے ایک مصرف قرار دیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے: " إنما الصدقٰت للفقراء والمسٰكين والعٰملين عليها والمؤلّفة قلوبهم وفي الرقاب والغٰرمين وفي سبيل الله وابن السبيل، فريضة من الله، والله عليم حكيم". (التوبة: ٦٠) اور نبی ﷺ کے عہد سے لیکر عہد فاروقی تک اس پر عمل ہوتا رہا، پھر حضرت عمرؓ نے اس مصرف میں زکوۃ کی ادائیگی کو وقتی طور پر موقوف قرار دیا، اور اس سلسلہ میں عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابسؓ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بہتر مثال ہے۔ حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی فیصلہ کی بنیاد یہ بات تھی کہ مؤلفۃ

القلوب کو زکوۃ دینے کا مقصد اہل اسلام کی تعداد بڑھانا اور مذہب اسلام کی جڑوں کو مضبوط کرنا تھا، اب جب یہ مقصد حاصل ہوگیا تو وہ علت ہی ختم ہوگئی، جس کی وجہ سے وہ حکم بھی ختم ہوگیا۔

امام بیہقی ؒ نے اس پورے واقعہ کو نقل کیا جس میں یہ حصہ قابل ذکر ہے :

" ....فقال عمر رضي الله عنه : إن رسول اللهﷺ كان يتألفكما والإسلام يومئذ ذليل، وأن الله قد أعزّ الإسلام فاذهبا فاجهدا جهديكما، ولا أرعى الله عليكما إن رعيتكما". (سنن البيهقى : ۷/۲۰)

آپؓ کا یہ فیصلہ دفع مضرّت وجلب منفعت دونوں کو گھیرے ہوئے تھا کہ ایک جانب امت اسلامیہ کے ہر فرد کو خود مختار وخود کفیل بنانا تھا اور دوسری جانب امت کے مستحق طبقہ تک زکوۃ کا مال بہتر انداز میں پہونچانا تھا، البتہ اس سلسلہ میں ایک وضاحت ضروری ہے کہ آپ کا یہ عمل الغاء نص کی غرض سے ہرگز نہیں تھا، بلکہ وقتی طور پر آپ نے اسے موقوف رکھنا مناسب سمجھا، یہی وجہ ہے کہ اگر دوبارہ کہیں یہ علت پائی جائے گی تو اس کا حکم بھی لازماً پایا جائے گا۔ اسی بات کو شیخ محمود علی داود العبیدی نے ابوعبید کی ''کتاب الأموال'' سے نقل کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: "..... وربما يعتقد معتقد أن فعل عمر بن الخطاب إنما هو إلغاء النص ومنع العمل به ، لكنه كان إيقافا مؤقتا للنص ؛ لأنه لايمكن لعمر رضي الله عنه ولا لغيره أن يجرءَ علىٰ إيقاف العمل بالنص أو إلغاء ه ، لأن هذا النص حتىٰ ما توفّرت شروط تطبيقه فإنه يطبق ، خصوصاً إذا رأى وليّ الأمر من

يتألفه على الإسلام ". (اجتهاد الخلفاء الراشدين الأربعة:ص/١٤٥) یہی وجہ ہے کہ جب عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آیا تو آپ نے تالیف قلب کی غرض سے جسے مناسب سمجھا اسے مال زکوۃ میں سے حصہ عنایت فرمایا، چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے:"أنـه ربّما يعطى المال من يُستألف على الإسلام". (طبقات ابن سعد : ٥/ ٢٧٠)

حضرت عمرؓ کا کتابیات سے نکاح پر روک لگانا:

اس بحث میں دوسری قسم کے مسائل وہ ہیں جن کا تعلق مناکحات اور باہمی ازدواجی زندگی سے ہے، خلفائے راشدین نے دینی بصیرت اور فراست ایمانی کی وجہ سے بہت سے ایسے فیصلے صادر فرمائے جو ان کی مجتہدانہ صفت پر دلالت کرتے ہیں، ان ہی میں سے ایک مسئلہ کتابیہ سے نکاح کا ہے کہ فی نفسہ پاکدامن کتابیہ عورت سے نکاح کرنا درست ہے اور بعض صحابہ کرام نے کتابیات سے نکاح کیے بھی تھے، لیکن ایک وقت آیا کہ حضرت عمرؓ نے کتابیات سے نکاح کرنے پر روک لگادی، چنانچہ جب آپ کو پتہ چلا کہ حضرت حذیفہؓ نے کتابیہ سے نکاح فرمایا ہے تو انہیں حکم دیا کہ اس کو چھوڑ دیں، حضرت حذیفہؓ نے پوچھا کہ کیا وہ حرام ہے؟ تو جواب دیا کہ حرام تو نہیں ہے، مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں آگے چل کر ان کی فاحشہ عورتوں سے تم نکاح نہ کر بیٹھو۔ امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اسے یوں نقل فرمایا ہے:"... فكتب إليه عمر: لا، ولكني أخاف أن تواقعوا الموسمات منهن". (اجتهاد الخلفاء الراشدين الأربعة : ١٣، بحواله تفسير ابن كثير) اور ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ مجھے خوف ہے کہ لوگ تمہاری اقتداء میں کتابیات سے ان کے حسن و جمال کی بناپر

شادی کرنے لگ جائیں اورامت مسلمہ کی باعفت خواتین سے بے رغبت ہوجائیں۔اس اثر کوامام محمدؒ نے کتاب الآثار میں نقل فرمایا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:"..... فإني أخاف أن يقتدي بك المسلمون فيختاروا نساء أهل الذمة لجمالهن، و كفىٰ بذلك فتنة لنساء المسلمين ".(كتاب الآثار : باب من تزوج اليهودية أو النصرانية .....:١/٣٩٤ برقم: ٤١٢)

اسی کوابن کثیرؒ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"....وإنما كره عمر ذلك لئلا يزهد الناس في المسلمات". (اجتهادات الخلفاء الراشدين الأربعة: ١٣٤، بحواله ابن كثير)

حضرت عمرؓ کے اس عمل کا سبب جو بھی ہو؛ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ نسل انسانی کی حفاظت اور اصلاح معاشرہ کی غرض سے کیا،آپ کو یہ خوف تھا کہ اگر منع نہیں کیا گیا تو آہستہ آہستہ کتابیات کی فاحشہ عورتوں سے اہل اسلام کے روابط بڑھیں گے،آپس میں نکاح ہوگا اور پھر اس بچہ کا نسب عورت کے فاحشہ ہونے کی وجہ سے مشتبہ رہے گا، نیز یہی بچہ غیر اسلامی طرز زندگی پر پروان چڑھ کر وہی طبیعت و معاشرہ پیش کرے گا جو اس نے اپنی ماں کی گود میں حاصل کیا ہے، دوسری جانب آپ کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر اہل اسلام کتابیات سے نکاح کرنے کے عادی ہوجائیں تو پھر مسلم لڑکیوں کے نکاح کا مسئلہ پیدا ہوجائے گا،اوران سے عدم رغبت کا نقصان ایک فتنہ کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔الغرض اس مسئلہ میں مقاصد شریعت میں سے ایک مقصد ''حفظ نسل'' کی مکمل رعایت کی گئی ہے،جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے پتہ چلتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا معذور شوہر کو مہلت دینا:

اسی طرح نکاح ہی سے متعلق ایک مسئلہ ہے کہ بسا اوقات زوجین میں سے کسی

ایک میں کوئی ایسی بیماری پائی جاتی ہے کہ جس کی بناپر وظیفۂ زوجیت کا وقوع ممکن نہیں ہوتا ہے، اس سلسلہ میں شرعی حکم یہی ہے کہ اگر ایسی کوئی صورت پائی جائے تو رشتۂ نکاح کو فوراً ختم کر کے دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے، لیکن اس مسئلہ میں حضرت عمرؓ کا اجتہادی نقطۂ نظر یہ تھا کہ جو شخص عنّین ہو-یعنی مباشرت پر قادر نہ ہو- اسے ایک سال کی مہلت دی جائے اور فوراً نکاح ختم نہ کردیا جائے، چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں سعید بن المسیب سے منقول ہے: "قضىٰ عمر بن الخطاب رضي الله عنه في الذي لايستطيع النساء أن يؤجل سنة". (مصنف عبدالرزاق: ٦/٢٥٣ برقم: ١٠٧٢٠) نیز سعید بن المسیب ہی فرماتے ہیں: "أن عمر جعل للعنّين أجل سنة، وأعطاها صداقا وافيًا". (المصدر السابق، رقم: ١٠٧٢١) اب حضرت عمرؓ کے اس اجتہاد پر نظر کریں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے یہ مہلت اس لیے دی کہ بسا اوقات کسی انسان میں قدرت وطاقت تو ہوتی ہے لیکن کسی عارض کی وجہ سے وہ معذور ہوجاتا ہے، لہذا اس کو ایک سال کی مہلت دی جائے تاکہ سال بھر کے مختلف مواسم اور ماحول کی تبدیلی اس میں تبدیلی لاسکے، اب اگر ایک سال کی مدت میں وہ قادر ہوجائے تو نکاح باقی رہے گا ورنہ ختم کردیا جائے گا۔ آپؓ کا یہ فیصلہ سراسر جلب منفعت ودفع مضرت پر مبنی تھا کہ آپ ایک بنے بنائے رشتہ کو یوں ختم کردینا مناسب نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہی یہ پسند فرماتے تھے کہ ایک لڑکی طلاق کا کلنک لگائے معاشرہ میں گھومے، اسی طرح یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ کی اس رائے سے حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، مغیرہ بن شعبہؓ اور حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہؓ نے بھی اتفاق کیا ہے جبکہ حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت سمرۃ بن جندبؓ مہلت دیئے جانے کے حق میں نہیں تھے، ان حضرات کی اس رائے کا سبب اگرچہ

کسی نے ذکر نہیں کیا ہے البتہ یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان حضرات کو ممکن ہے یہ اندیشہ ہو کہ اگر زوجین کو اسی حالت پر باقی رکھا جائے تو بہت ممکن ہے کہ آپسی اختلافات بڑھیں گے، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ عورت اپنی جائز شہوت کو پورا کرنے کے لیے کوئی غلط قدم اٹھالے، تو ان تمام خدشات کے پیش نظر ان حضرات نے مہلت دینا مناسب نہیں سمجھا، بلکہ تفریق کرنا بہتر سمجھا کہ ہر کوئی اپنی ضرورت کو پورا کرنے میں آزاد رہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

الغرض اس طرح کے نہ جانے کتنے مسائل ہیں جن میں صحابہ کرام وخلفاء راشدین نے دینی فکر پر مبنی اجتہاد کرتے ہوئے اور مقاصد شریعت کی روح کو سمجھتے ہوئے ان کا استنباط کیا ہے، اگر صحابہ اس میدان کو یونہی کھلا چھوڑ دیتے تو آج ہزاروں مسائل ایسے ہوتے کہ جن کا حل کرنا ایک بہت بڑا چیلنج ہوتا۔

اجتہاد عمرؓ ایک عظیم کارنامہ:

مقاصد شریعت کی صحیح ترجمانی اور اسرار شریعت کو سمجھ کر شریعت کی تنفیذ میں حضرت عمرؓ کا خصوصی کردار رہا ہے، آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو گئے تھے کہ مشکوٰۃ نبوت سے صادر ہونے والے وہ احکام جن میں صاحب نبوت نے اجتہاد کی گنجائش رکھی ہے، ان میں اجتہاد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ آپؓ نے جزیہ کی تعیین، خراج کی توضیح اور ام ولد کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں اجتہاد سے کام لیا اور یہ نکتہ واضح فرمایا کہ شریعت کے تمام احکام مصالح عقلیہ پر مبنی ہیں۔

بالخصوص آپ نے تمدن وثقافت اور سیاست ملکیہ سے متعلق جو احکامات نافذ کیے وہ آپ کی اجتہادی فوقیت کو ثابت کرتے ہیں، جیسے خمس کا مسئلہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے

حکم قرآنی اورآپ ﷺ کے معمول کو مدنظر رکھ کر مال خمس کی تقسیم میں مثبت تبدیلی فرمائی۔
اسی قبیل کا ایک مسئلہ ''فیئ'' کا ہے کہ جو زمین فتح ہوکر مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے، اسے تقسیم نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ وقف کی شکل میں محفوظ کردی جائے گی، جس کے منافع سے اس دور کے اور بعد کے مسلمان فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام وعراق فتح ہوئے تو بعض صحابہ نے اس زمین کی تقسیم پر اصرار کیا، لیکن حضرت عمرؓ نے قرآن کی آیت:''.......والذین جاء وا من بعد'' پڑھ کر فرمایا: '' فکانت هذه عامة لمن جاء من بعدهم ، فصار هذا الفيئ بين هؤلاء جميعا ، فكيف نقسمه لهولاء و ندع من يخلف بعدهم ؟ '' یعنی فیئ کا مال مشترک مال ہے، جس میں بعد میں آنے والے مسلمان کا بھی حصہ ہے، اگر اسے ابھی تقسیم کردیا گیا تو پھر ان کو کہاں سے دیا جائے گا؟ اسی طرح جزیہ کی تعیین میں آپؓ کا اجتہاد آپ کی بصیرت پر دلالت کرتا ہے، آپ نے وقت اور حالات کے پیش نظر اس میں تبدیلی بھی فرمائی اور بسا اوقات ادائیگی جزیہ میں رعایت دی اور کبھی وقتی طور پر معاف بھی کردیا، خراج کے سلسلہ میں ارض عراق میں آپ نے زمین کی پیداوار اور زرعی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ایسا خراج متعین کیا کہ جس میں ذمیوں کے حقوق کی ازحد رعایت کی گئی، اور اس صوابدیدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم مدت میں خراج سے حاصل ہونے والی رقم دس کروڑ بیس ہزار درہم ہوگئی۔

خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے منقول وہ اقوال وافعال جو منصب نبوت سے تعلق نہیں رکھتے ہیں ان میں آپؓ نے اجتہاد کیا؛ کیونکہ آپؓ نے اقوال وافعال رسول کے درمیان موجود فرق کو سمجھا تھا، اور اسی سمجھ کی بنا پر آپ نے ایسا کیا، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر حضور

ﷺ کے تمام اقوال وافعال تشریعی حیثیت کے حامل ہوتے تو حضرت عمرؓ ہی کیا، کوئی اور بھی یہ جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ان میں اپنے اجتہاد سے کمی بیشی کرے، اسی طرح دیگر صحابہ کرامؓ کا حضرت عمرؓ کے فیصلوں کو تسلیم کرنا خود ثابت کرتا ہے کہ وہ بھی اس حقیقت سے واقف تھے، ورنہ وہ یہ کیسے گوارا کرتے کہ حضور اکرم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت میں حضرت عمرؓ تبدیلی کریں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: الفاروق از علامہ شبلی نعمانیؒ)

حضرت عثمانؓ کے اجتہادات:

نیز ہم دیکھتے ہیں کہ عبادات میں سے نماز جمعہ کے لیے اذان کا مسئلہ ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت تک ایک ہی اذان ہوتی تھی جو خطیب کے سامنے دی جاتی تھی ، پھر جب حضرت عثمانؓ کا عہد خلافت شروع ہوا تو آپ نے محسوس کیا کہ مدینہ کی آبادی کافی پھیل چکی ہے اور لوگ تجارت و دنیوی امور میں مشغولی کی وجہ سے وقت جمعہ کا دھیان نہیں رکھ پاتے ہیں، تو آپ نے اس غرض سے کہ لوگ نماز جمعہ سے پہلے مسجد میں پہونچ جائیں اور خطبہ میں شریک ہوجائیں، ایک اور اذان کو جاری کروایا جو دیگر اذانوں کی طرح ابتداء وقت پر دلالت کرتی ہو۔ چنانچہ ابن حجر لکھتے ہیں: ”وتبین مما مضیٰ أن عثمان رضي الله عنه أحدثه لإعلام الناس بدخول الوقت قیاسا علی بقیة الصلوات ، فألحق الجمعة بها وأبقیٰ خصوصیتها بالأذان بین یدی الخطیب...“ (اجتهاد الخلفاء الراشدین الأربعة ، بحواله فتح الباري :۱۳۳) اور آپ کا یہ عمل محض جلب منفعت کی غرض ہی سے تھا کہ لوگوں کا جمعہ اور خطبہ چھوٹنے نہ پائے۔

اسی قبیل کا ایک مسئلہ منیٰ میں قصر واتمام کا ہے، آپ ﷺ، حضرت ابوبکر و

حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دور میں منیٰ میں نمازیں قصراً پڑھی جاتی تھیں، لیکن بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اتمام کرنا شروع کردیا، علماء کرام نے آپ کے اس عمل کی مختلف وجوہات بیان کی کہ آپ نے اقامت کی نیت کی تھی، یا یہ کہ آپ نے وہاں نکاح فرمایا تھا، لیکن ابن حجرؒ نے جس سبب کو ترجیح دی وہ یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں بعض عرب قبائل نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور آپؓ کو خوف تھا کہ کہیں وہ یہ خیال نہ کر بیٹھیں کہ نماز میں دو ہی رکعتیں پڑھنا فرض ہے، تو ان کو اس گمان سے بچانے کی خاطر آپ نے اتمام فرمایا، اس میں ایک اور سبب کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ آپؓ کو اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ قصر کو جو کہ رخصت ہے واجب نہ سمجھ لیں، اور بہرحال اسی پر عمل پیرا ہونے کو ضروری نہ سمجھ لیں، تو اس اندیشہ کو بھی دور کرنا مقصود تھا، اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کا یہ اجتہاد دفع مضرت کی غرض سے تھا، اسی بات کو ذکر کرتے ہوئے ابن حجر امام بیہقی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ”إن عثمان أتم بمنیٰ ثم خطب فقال: إن القصر سنة النبی وصاحبیه، ولكن حدث طغام -أی الأعراب الجهلة- فخفت أن يستنوا، وأورد ابن جريج أن أعرابياً ناداه في منٰی: يا أمير المؤمنين! مازلتُ أصليها منذ رأيتك عام أول ركعتين“. ان عبارات کے بعد ابن حجر فرماتے ہیں: ”وهذه طرق يقوي بعضها بعضا، ولا مانع أن يكون هذا سبب الإتمام“.

(اجتهاد الخلفاء الراشدين الأربعة: ۱۱۹ بحواله فتح الباری)

اجتہادات حضرت علی رضی اللہ عنہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے علم وافر کی وجہ سے جس مقام پر تھے؛ اس میں کوئی شبہ

نہیں کیا جا سکتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ وحضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی بعض مسائل میں آپ سے جواب دریافت فرماتے تھے، جو آپؓ کے علمی مرتبہ کو واضح کرتا ہے، آپؓ کے قضایا اپنی مثال آپ تھے، جن سے آپؓ کی دینی بصیرت کا پتہ چلتا ہے، روٹیوں کی تقسیم والا مسئلہ اور کنویں میں گر کر مرنے والے افراد کے سلسلہ میں آپ نے جو فیصلے صادر فرمائے، وہ آپ کی فقاہت پر دلالت کرتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے مسائل میں آپؓ نے اسلاف کی طرح اجتہاد اور قیاس سے بھی کام لیا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے دور میں حد شرب خمر کا مسئلہ درپیش ہوا، تو آپؓ نے رائے دی کہ شرابی کو اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں اور اس کا سبب یہ بتایا کہ شراب پی کر انسان بکواس کرتا ہے اور لوگوں کی عزت وآبرو کو نشانہ بناتا ہے، جس کی سزا شریعت میں اسی (۸۰) کوڑے ہیں، لہذا شرابی کو بھی اسی کوڑے لگنے چاہیئے، حضرت عمرؓ نے آپؓ کی رائے کو قبول کرتے ہوئے شرابی کو اسی کوڑے مارنے کا حکم فرمایا، پھر خود اپنے دور خلافت میں آپؓ نے ماہ رمضان میں شراب پینے والے شخص کو سو (۱۰۰) کوڑے لگوائے اور وضاحت بھی فرمادی کہ اسی (۸۰) کوڑے شراب نوشی کی سزا کے طور پر اور بیس (۲۰) کوڑے ماہ رمضان کی بے حرمتی کرنے کے جرم میں لگائے گئے، آپؓ کا یہ عمل اجتہاد پر مبنی تھا کہ حالات ومصلحت کے پیش نظر آپ نے اس اضافے کو مناسب سمجھا۔ (دیکھئے: اجتهاد الخلفاء الراشدين الاربعة: ۱۹۲-۱۹۵)

حضرت عمرؓ کے دربار میں ایک پاگل عورت لائی گئی، جس سے زنا کا صدور ہوگیا تھا، حضرت عمرؓ نے حد رجم جاری کرنے کا حکم دیا، لیکن حضرت علیؓ نے آپؓ کو روکا اور بتایا کہ مجنون اپنے عذر کی بناء پر احکام شرعیہ کا مکلّف نہیں ہوتا ہے، لہذا اس عورت پر بھی حد جاری

نہیں کی جاسکتی۔ (مسند احمد: ۲/۹۵، برقم: ۱۱۸۳)اس سے حضرت علیؓ کے علمی استحضار کا اندازہ ہوتا ہے، نیز ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے مسئلہ دریافت فرمایا کہ خنثٰی مشکل کی وراثت کی کیا صورت ہوگی؟ تو آپؓ نے جواب دیا کہ پیشاب گاہ سے اندازہ لگایا جائے کہ وہ مرد ہے یا عورت؟ گویا اس طرح آپؓ نے اس مسئلہ کو حل فرمالیا جو حضرت معاویہؓ جیسے صحابی جلیل پر واضح نہ ہوسکا تھا۔ (تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۱٦۵)

اور یہ واقعہ تو آپؓ کی فقہی بصیرت کا ترجمان ہے جب کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک ایسی خاتون لائی گئی جس نے شادی کے چھ ماہ بعد بچہ کو جنم دیا تھا، حضرت عمرؓ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا، حضرت علیؓ کو پتہ چلا؛ تو آپؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ قرآن پاک میں مدت حمل ومدت رضاعت تیس مہینے بتائی گئی ہے، جب کہ دوسری جگہ رضاعت کی تعیین دو سال سے کی گئی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ حمل کی اقل مدت چھ مہینے ہیں؛ لہٰذا اس عورت کو سزا نہیں دی جاسکتی ہے، اس طرح قرآنی آیات کا صحیح مطلب ومفہوم کو آپؓ نے صحیح انداز میں سمجھ کر ایک غلط فیصلے کو صادر ہونے سے روک دیا۔

الغرض آپؓ نے اسلاف کی روش پر چلتے ہوئے اور احکام دینیہ کے مناسب انداز میں نفاذ کے لئے شریعت کی مقصدیت کو سمجھ کر خلافت کی ذمہ داری بہتر طریقے سے انجام دی۔

اقوال صحابہ میں سے کسے ترجیح ہوگی؟

ہماری اس تحریری گفتگو کو ختم کرنے سے قبل دوبارہ اپنے عنوان کی جانب لوٹتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق دو اہم اقتباسات آپ کے حوالے کرنا مناسب سمجھتے

ہیں، جو اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کے آپسی علمی اختلافات کس نوعیت کے ہوتے تھے اور ان کے زمانہ میں کس کی رائے کو فوقیت واقدمیت حاصل ہوتی تھی؟ چنانچہ ابن قیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' میں اختلافات صحابہ، ان کے فتاوی اور اس جیسے مسائل پر مفصل گفتگو فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب صحابی کوئی بات کہے تو اس قول کی مخالفت میں بھی کوئی قول ہوگا یا نہیں ہوگا، پھر اگر مخالف قول موجود ہے اور وہ اس جیسے ہی دوسرے صحابی کا ہے تو اب ایک کا قول دوسرے کے خلاف حجت نہیں بن سکتا، کیونکہ دونوں نے یقیناً رسول اللہ ﷺ کی مجالس سے استفادہ کرنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کی ہے، لیکن اگر مخالف قول کسی ایسے صحابی کا ہے جو علم وعمل، تقویٰ وصلاح میں ان سے بہتر ہے، جیسے خلفاء راشدین کا یا ان میں سے کسی کا قول دیگر صحابہ کے قول کے مقابل ہو، تو ایسی صورت میں خلفاء راشدین کی رائے کو راجح قرار دیا جائے گا، پھر ان چاروں میں سے زیادہ جس طرف ہو، وہ قول راجح ہوگا، اور اگر خلفاء راشدین میں بھی دو اور دو کا تناسب ہو جائے تو حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو ترجیح دی جائے گی، پھر اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ میں بھی اختلاف ہو تو حضرت ابوبکرؓ کی رائے راجح ہوگی، اسی طرح صحابہ کرام کے آثار وفتاویٰ متاخرین کے فتاوی وآراء کے مقابلہ میں مقدم رکھے جائیں گے، الغرض مشکوۃ نبوت سے جس کو جتنا زیادہ قرب حاصل ہوگا اس کی رائے اتنی زیادہ اہمیت کی حامل ہوگی، اسی کو ابن قیم لکھتے ہیں:''......وكلما كان العهد بالرسول أقرب كان الصواب أغلب''. (أعلام الموقعين: ٤/١١٨-١٢٠)

اقوال صحابہ میں اختلاف کے اسباب:

اس بارے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں کافی اطمینان بخش

گفتگوفرمائی ہے، نیز اس حقیقت کو بھی واضح فرمایا کہ عہد نبوی ﷺ میں شاذ ونادر ہی ایسے مسائل پیش آئے تھے کہ ان کی بابت صحابہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیا کرتے تھے، ورنہ اکثر تو یہی ہوتا کہ نبی کو جو کام جیسا کرتا دیکھتے صحابہ اسی طرح اسے کرنے کی کوشش کرتے، یا جس کام سے متعلق نبی اس کا طریقہ سکھلا دیتے اسے ویسے ہی ادا کرتے، پھر رفتہ رفتہ اسلام نے مختلف ممالک میں اپنا سکہ جمایا اور حالات وافراد کی تبدیلی کی وجہ سے نئے نئے مسائل سامنے آنے لگے تو صحابہ کرام نے نصوص شرعیہ کی روشنی میں ان کا حل پیش کیا، اور جن مسائل میں نصوص سے کوئی جواب سمجھ میں نہ آسکا، ان میں نصوص ہی کی قیادت میں اجتہاد واستنباط سے کام لے کر اور شریعت کے احکام کی علت کو سمجھ کر حتی الامکان صحیح جواب دینے کی کوشش کی، شاہ ولی اللہؒ نے صحابہ کے ان اجتہادات اور ان کی بنا پر ہونے والے اختلافات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:"فعند ذلك وقع الاختلاف بينهم على ضروب ، منها أن صحابيا سمع حكما في قضية أو فتوىً لم يسمعه الآخر فاجتهد برأيه في ذٰلك ، وهذا علىٰ وجوه : أحدها : أن يقع اجتهاده موافق الحديث....وثانيها: أن يقع بينهما المناظرة، ويظهر الحديث بالوجه الذى يقع به غالب الظنّ، فيرجع عن اجتهاده إلى المسموع.....وثالثها: أن يبلغه الحديث، لكن لا على الوجه الذى يقع به غالب الظن، فلم يترك اجتهاده ، بل طعن فى الحديث ...ورابعها: أن لايصل إليه الحديث أصلا"، یعنی بسا اوقات اختلاف اس لیے واقع ہوتا تھا کہ ایک صحابی کسی مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ یا فتویٰ جانتے تھے جبکہ دوسرے صحابی اس سے لاعلم ہوتے تھے اور اجتہاد فرماتے تھے، تو کبھی ان کا اجتہاد حدیث کے

موافق ہی رہتا تھااور کبھی یہ ہوتا کہ وہ اپنے اجتہاد سے رجوع کر لیتے اور حدیث پر عمل کرتے ،کبھی حدیث میں کوئی ایسی بات ہوتی جو ان تک پہونچتی تو سہی لیکن دیگر نصوص کی روشنی میں وہ اپنے اجتہاد پر ہی قائم رہتے ، اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ سرے سے کوئی حدیث ان تک پہونچی ہی نہ ہوتی۔ پھر شاہ صاحب نے اختلاف کے دوسرے سبب یا دوسرے حصہ کو ذکر کیا، چنانچہ لکھتے ہیں: ”ومن تلك الضروب أن يروا رسول الله ﷺ فعل فعلا، فحمله بعضهم على القُربة وبعضهم على الإباحة، ...ومنها اختلاف الوهم...ومنها اختلاف السهو والنسيان ...ومنها اختلاف الضبط....ومنها اختلافهم في علة الحكم ....ومنها اختلافهم فی الجمع بین المختلفین “، کہ صحابہ میں بسا اوقات اختلاف اس لیے ہوتا تھا کہ وہ نبی ﷺ کو کوئی کام کرتا دیکھتے ،تو بعضے حضرات اسے تطوع اور نیکی کے کام پر محمول کرتے اور بعض اسے مباح گردانتے ،جس کی وجہ سے ان کی آراء میں بھی اختلاف ہوجاتا، کبھی اندازہ وگمان کے اختلاف کی وجہ سے بھی اختلاف ہوتا تھا، اسی طرح کبھی کبھی بھول بھی اختلاف کی وجہ بن جاتی تھی، تو کبھی روایت کو ضبط کرنے میں اور اسے سمجھنے میں اختلاف ہوتا تھا، نیز کبھی کسی حکم کی علت کو سمجھنے میں اختلاف ہوجاتا تھا۔

(دیکھیے رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ :۲/ ۵۸۸-۵۹۵)

صحابہ میں سب سے افضل کون ہے؟

دوسرا مسئلہ یہ کہ وفات رسول اللہ ﷺ کے بعد سے آج تک ، بلکہ رہتی دنیا تک اہل سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ صحابہ میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، گر چہ اس مسئلۂ تفضیل

میں دسیوں اقوال ہیں اوران کے معتقدین آج بھی کئی ممالک میں پائے جاتے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ جمہور علماء کا اسی ترتیب پر اتفاق ہے جو ابھی گزری۔

اللہ جزائے خیر دے امام بخاریؒ کو جنہوں نے ایک روایت نقل کرکے ہمارے لیے سامان تسلی مہیا کردیا ہے، چنانچہ آپ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کے حوالہ سے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ: ”كنا نخيّر بين الناس في زمن النبي ﷺ ، فنخيّر أبا بكر ثم عمر بن الخطاب ،ثم عثمان بن عفان “. (كتاب فضائل الصحابة ، باب فضل أبي بكرؓ بعد النبیﷺ ، برقم: ٣٦٥٥) اسی طرح ابن کثیر ”الباعث الحثيث “ میں لکھتے ہیں: ”و أفضل الصحابة بل أفضل الخلق بعد الأنبياء أبو بكر الصديق ... ثم من بعده عمر بن الخطاب ، ثم عثمان بن عفان ثم علی بن أبی طالب رضي الله عنهم “. (الباعث الحثيث:١٦٧) نیز مقدمہ ابن الصلاح میں مذکور ہے :”أفضلهم على الإطلاق : أبوبكر، ثم عمر ،ثم إن جمهور السلف علىٰ تقديم عثمان علىٰ علي رضى الله عنهم أجمعين“. (مقدمة ابن الصلاح:١٧٨) ان تمام عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جمہور علماء کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق افضل الصحابہ ہیں اور پھر تینوں صحابہ ہیں جو آپؐ کے بعد بالترتیب خلیفہ بنے، اوراس عقیدہ کے علاوہ کسی دوسرے عقیدہ کو ماننا ایمان سے خارج کرے نہ کرے، ایمان کو مخدوش ضرور کردے گا۔

ساتھ ہی ساتھ یہاں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ دنیا چاہے ترقیات کی دوڑ میں حیرت انگیز رفتار سے دوڑے، مریخ وماہ پر اپنے نقش قدم چھوڑ آئے، سمندروں کی گہرائی میں چھپے لعل وگوہر سے اپنے دامن بھرلے اور چاہے نظام قدرت میں شیطانی دماغ کا استعمال

کر کے وقتی طور پر کچھ کامیابی حاصل کرلے، تب بھی اس کائنات میں موجود ہر انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات صرف اسی شریعت اسلامیہ سے متعلق ہے جو اللہ رب العزت نے محمد مصطفیٰ ﷺ کو عطا فرمائی، اور جسے آپ کے جاں نثار صحابہ نے بے مثال قربانیاں دے کر مکمل احساس ذمہ داری کے ساتھ ہم تک پہونچایا ہے، کہ ان کے نقش قدم پر اٹھنے والا ہر قدم درحقیقت جنت کے قریب ہو رہا ہے۔

اجتہادات خلفاء اربعہ اور عصر حاضر:

خلاصہ یہ ہے کہ خلفاء راشدین کے ان اجتہادات سے ہمیں یہ سبق ضرور ملتا ہے کہ فی زمانہ دنیا عروج کی شکل میں زوال کی جانب بڑھتی جارہی ہے، ایسے حالات میں حضرت ابوبکرؓ کے اجتہادات ہمیں سکھلاتے ہیں کہ فتنوں کا مقابلہ کیسے کرنا ہے، اور امت اسلامیہ کا داخلی انتشار جو ساری دنیا پر واضح ہو گیا ہے، حضرت علیؓ کے اجتہادات ہمیں ان سے نمٹنے کا راستہ دکھاتے ہیں، دنیا میں پھیلی بے امنی اور بدامنی، مذہبی تعصب اور نسلی منافرت کے سیلاب کو روکنے کے لیے حضرت عثمانؓ کی سوچ اور عمل مشعل راہ ہے کہ بقائے باہمی کی غرض سے آپ نے بہت مناسب فیصلے کیے، اور بالآخر غربت وافلاس کے شکنجے میں جکڑی اور بھکمری سے پریشان دنیا کے معاشی استحکام، اسلام کی سیاسی واخلاقی بالادستی کے اثبات اور فرسودہ نظام جمہوریت کے مقابل خلافت اسلامیہ کے قیام کی افادیت کے لیے ہمارے یہاں حضرت عمرؓ کی عالی فکر اور معتدل و برحق اجتہادات کا ذخیرہ موجود ہے، ان کی اتباع کرتے ہوئے دنیا کو دوبارہ اس عہد زریں کی جانب لوٹایا جاسکتا ہے کہ انسانیت نے جس کے خواب دیکھنے بھی چھوڑ دیئے ہیں۔

❖❖❖

فهرست مراجع ومصادر

(۱) بخاری :۳۶۷۳، مسلم : ۲۵٤۰

(۲) بخاری : ۳۶۵۰، مسلم : ۲۵۳۵

(۳) مشکوۃ المصابیح ، حدیث :۱۹۳

(٤) مسند احمد :۵۰۵/۳، ۵۰۶ برقم : ۳۶۰۰

(۵) الإستیعاب : ۵/۱

(۶) الباعث الحثیث،ص:۱۷۶، ۱۷۷

(۷) مقام صحابه از مفتی محمد شفیع عثمانی ، ص:۸

(۸) فقه حضرت ابوبکرؓ (مترجم) ص:۱۲، ۱۳

(۹) اعلام الموقعین : ۲۰۲/۱-۲۰٤

(۱۰) المستصفیٰ للغزالي :۲۷۸/۱

(۱۱) المقاصد العامة للشریعة الإسلامیة ، ص:۱۶۱-۱۶٤

(۱۲) اجتهاد الخلفاء الراشدین الأربعه از شیخ محمود علی داود العبیدی،ص:۱٤۱

(۱۳) المنتقیٰ للباجی :۲۰۷/۱

(۱٤) السنن الکبریٰ للبیهقی : ۱۱۳/۱۰ برقم: ۱۳٤۶٤

(۱۵) اجتهادات الخلفاء الراشدین الأربعه از شیخ محمود علی داود العبیدی،ص:۱٤۵

(۱۶) طبقات ابن سعد :۲۷۰/۵

(۱۷) اجتہادات الخلفاء الراشدین الأربعہ از شیخ محمود علی داود العبیدی،ص:۱۳۳

(۱۸) کتاب الآثار ، باب من تزوج الیہودیة اوالنصرانیة ...: ۳۹۴/۱ برقم : ۴۱۲

(۱۹) اجتہادات الخلفاء الراشدین الأربعہ از شیخ محمود علی داود العبیدی،ص:۱۳۴

(۲۰) مصنف عبدالرزاق :۲۵۳/۶برقم: ۱۰۷۲۰

(۲۱) مصنف عبدالرزاق :۲۵۳/۶برقم: ۱۰۷۲۱

(۲۲) اجتہادات الخلفاء الراشدین الأربعہ از شیخ محمود علی داود العبیدی،ص:۱۳۳ (۲۳) ایضا. (۲۴) ایضا.

(۲۵) مسند أحمد :۹۵/۲،برقم: ۱۱۸۳

(۲۶) تاریخ الخلفاء للسیوطی : ص:۱۶۵

(۲۷) أعلام الموقعین :۱۱۸/۴-۱۲۰

(۲۸) رحمة الله الواسعة شرح حجة الله البالغة :۵۸۸/۲-۵۹۵

(۲۹) بخاری برقم: ۳۶۵۵، کتاب فضائل الصحابة ، باب فضل أبی بکر بعد النبی ﷺ

(۳۰) الباعث الحثیث: ص:۱۶۷

(۳۱) مقدمة ابن الصلاح : ص:۱۷۸

قرون وسطی میں گجرات کے علمائے کرام کی

حدیثی خدمات

گجرات میں علم حدیث کی اشاعت، اس میں علماء گجرات کا کردار اور اس فن کے ماہر علماء کی تصنیفات کے تعارف پر مشتمل یہ مقالہ احمد آباد پیر محمد شاہ لائبریری ہال میں بعنوان ''قرون وسطی میں گجرات کی علمی وادبی سرگرمی'' پڑھا گیا۔

قرون وسطی میں گجرات کے علمائے کرام کی حدیثی خدمات

الحمد لله رب العالمین ،والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آله واصحابه اجمعین . **امابعد!**

اسلامی علوم میں علوم القرآن اگر دل کی حیثیت رکھتا ہےتو علم حدیث شہ رگ کی ، یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء وجوارح تک خون پہنچا کر ہرآن ان کے لئے تازہ زندگی کا سامان مہیا کرتی ہے ،آیات کا شان نزول اور تفسیر، احکام قرآن کی تشریح وتعیین ،اجمال کی تفصیل ،عموم کی تخصیص ،مبہم کی تعیین ،آپ ﷺ کی سیرت طیبہ، اخلاق کریمانہ ،آپ ﷺ کے اقوال وافعال، نیز صحابہ کرامؓ کے اجتہادات واستنباطات کا خزانہ بھی اسی مبارک علم کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے،اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ مذہب اسلام کے عملی پیکر کا صحیح مرقع اس علم کی بدولت مسلمانوں میں ہمیشہ کے لئے موجود وقائم ہے اوران شاءاللہ تا قیامت قائم وموجود رہے گا۔

روح دین قرآن ہے اور دل حدیث مصطفیٰ
غور سے پڑھ غور سے غافل حدیث مصطفیٰ
دوں اگر تشبیہ قرآن کو بہ رخسار جمیل
تو اسی رخسار کا تل ہے حدیث مصطفیٰ

اسی اہتمام شان کے پیش نظر مسلمانوں نے آغاز اسلام سے ہی قرآن پاک کے

بعداس علم کواپنے سینہ سے لگایااوراپنی پوری محنت وقابلیت اوراخلاص وعقیدت کے ساتھ اس کی ایسی خدمت کی کہ دنیا کی کوئی قوم اپنی روایات واسناداوراسمائے رجال کی چھان بین میں اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔

محترم سامعین! اس خدمت جلیلہ کے سلسلہ میں محدثین گجرات نے بھی بہت شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں، اورایسے حالات میں حدیث شریف کی ترویج وتدریس کی جبکہ ہندوستان کے بیشتر خطوں کے علمائے کرام منطق وفلسفہ کی موشگافیوں میں الجھے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ کے عہد سے ہندوستان کے ساحلی علاقوں پراسلامی لشکر کی حملہ آوری شروع ہوچکی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہرکلمہ گو کے لب ودہن اخبرنا و حدثنا کی خوشبو سے معطر تھا، اسلام کا یہ پہلا داعیانہ اورمجاہدانہ قافلہ تھانہ پرحملہ آور ہوا، پھربھروچ شہراس کی دوسری منزل تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان فوجیوں میں دیدارنبوی ﷺ سے مشرف ہستیوں کی بھی کچھ تعداد ہوگی، اس کے بعد یکے بعد دیگرے حملے ہوئے، انہیں حملوں میں محدث کبیر حضرت ربیع بن صبیح ؒ بھی گجرات تشریف لائے، اوراسی سرزمین میں نربدا کے کنارے پیوندخاک ہوئے، جب اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں سندھ فتح ہوا، تو یہاں حدیث کا چرچا ہونے لگا اور حدیث شریف سے لوگوں کا شغل بڑھ گیا، پھرسندھ سے عربوں کی حکومت ختم ہوگئی اوران کی جگہ غزنوی اورغوری سلاطین سندھ پرقابض ہوئے، خراسان اور ماوراءالنہر سے علماء آنے لگے، تو حدیث کا علم کم ہوتا گیا، لوگوں میں شعروشاعری ،نجوم وریاضی اور منطق وفلسفہ کا رواج زیادہ ہوگیا، فقہ اوراصول فقہ کی ضرورت صرف اس

لئے پیش آتی تھی کہ عہدۂ قضاء کے ممتاز منصب کو حاصل کیا جاوے، اور وہ بھی صرف تقلیدی طور پر تھا، اجتہاد و تحقیق کے طور پر نہیں تھا، اور ہر طرف فقہی جمود چھایا ہوا تھا۔

حدیث شریف میں امام صغانی کی مشارق الانوار اور زیادہ سے زیادہ امام بغوی کی مصابیح السنہ یا مشکوۃ پڑھائی جاتی تھی، اور ایسے شخص کو امام المحد ثین سمجھا جاتا تھا، علم حدیث کے ساتھ لوگوں کی بے اعتنائی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں مسئلہ سماع کی تحقیق کیلئے مناظرہ کی مجلس منعقد ہوتی ہے، شیخ نظام الدین اولیاءؒ بھی شریک مناظرہ تھے، آپ جب کوئی حدیث پیش کرتے تو دوسرے علماء بڑے استعجاب سے آپ کی طرف دیکھتے اور کہتے: ''ترا بہ حدیث چہ کار تو مرد مقلدی، روایت از ابوحنیفہ بیار، تا معرض قبول افتد'' حضرت نظام الدین اولیاء اس فقہی جمود پر کف افسوس ملتے رہ گئے۔

محترم حضرات ! اتفاق سے اسی زمانہ میں ایران میں صوفیوں نے شیعیت کو اپنا سرکاری مذہب قرار دیا، تو ایران کے بڑے بڑے سنی علماء و محدثین نے گجرات کی راہ لی، سب سے پہلے بزرگ جو حدیث شریف کے علوم کو سینہ سے لگا کر احمد شاہ اول کے زمانہ میں گجرات آئے وہ مولانا نورالدین احمد شیرازی ہیں، آپ کی بخاری شریف کی سند اتنی عالی تھی کہ جب وہ حجاز و یمن میں پہنچی تو بڑے بڑے محدثین نے اس کو شوق و ذوق اور فخر سے حاصل کیا، الغرض ہندوستان کے مختلف صوبوں میں گجرات نے سب سے پہلے اپنا طبعی حق پایا، اور بحر عرب کے اس پار کی شعائیں سب سے پہلے یہیں آ کر پڑیں، پھر یہاں سے آگرہ، جونپور، برہانپور اور مالوہ کے مناروں پر جا کر عکس انداز ہوئیں، گجرات میں بڑے پیمانے پر علم و ادب

کے چرچے شروع ہوگئے، تہذیب وتمدن کی جلوہ آرائیوں نے آنکھوں کو خیرہ کردیا، سولہویں اور سترہویں صدی میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دینی اور ثقافتی زندگی کا مرکز ثقل گجرات کی طرف منتقل ہوگیا ہے، اور شاید ہی کوئی دینی یا علمی شعبہ ایسا ہو جس کے متبحر عالم یہاں موجود نہ ہوں۔

فخر ہند، محدث کبیر حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ابھی عالم وجود میں نہیں آئے تھے کہ گجرات علم حدیث کا مرکز بن چکا تھا؛ بلکہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے گجرات کے دو عالم شیخ عبدالوہاب اور شیخ عبداللہ بھروچی سے حدیث کا علم حاصل کیا۔

علامہ سخاویؒ (جو محدث جلیل حافظ حدیث علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کے شاگرد ہیں)، حافظ ابن حجر مکی اور شیخ الاسلام زکریاؒ کے تلامذہ کافی تعداد میں یہاں بس گئے تھے، اور تشنگان حدیث ان سے سیراب ہوتے تھے، بقول مولانا سید عبدالحئ لکھنویؒ علوم وفنون میں اگر گجرات شیراز تھا تو حدیث شریف کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا۔

صحیح بخاری شریف کی دو شرحیں جو غالبا ہندوستان میں بخاری شریف کی سب سے قدیم شرحیں ہیں، یعنی علامہ بدرالدین کی مصابیح الجامع جو آپ نے احمد شاہ بادشاہ کے نام معنون کی، اور دوسری شرح سید عبدالاول حسینیؒ کی فیض الباری اسی سرزمین پر لکھی گئی ہیں۔ ۸۵۱ھ کا گجراتی عالم کا لکھا ہوا بخاری شریف کا نسخہ بھی پٹن میں موجود تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث (بخاری) کا درس نویں صدی میں بھی جاری تھا، فتح الباری شرح بخاری کا نسخہ ابوالقاسم مکی دسویں صدی کو گجرات میں لیکر داخل ہوتے ہیں، امیر الغ خاں کی

موجودگی میں بخاری شریف کا ختم ہوتا ہے، اور امیر کی طرف سے اختتام جلسہ پر پُر تکلف دعوت کا اہتمام ہوتا ہے، اسی صدی کا بخاری شریف کے ختم کا دوسرا واقعہ بھی ذکر کیا جاتا ہے، شیخ عبدالمعطی کی ایک کتاب حدیث کے اسماء رجال پر اسی صدی میں لکھی گئی تھی، صحیح مسلم شریف کا سب سے قدیم نسخہ سلطان محمود کے کتب خانہ میں تھا جس پر عبدالرحیم خاں کی مہر لگی ہوئی ہے۔۹۹۲ھ میں احمد آباد کے کتب خانہ میں آنے کی تاریخ درج ہے۔

حافظ سخاویؒ کے تلامذہ میں سب سے پہلے غالبًا مولانا راجح بن داود گجراتی ہیں، ۸۹۴ھ میں وہ حافظ موصوف کے حلقہ میں داخل ہوئے، اور الفیۃ الحدیث کی سند حاصل کی، علامہ سخاویؒ الضوء اللامع میں ان کی فہم اور عقلمندی کی تعریف کرتے ہوئے حدیث شریف کی اجازت دینے پر خود خوشی محسوس کرتے ہیں، اس کے بعد وہ گجرات وارد ہوئے، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ۹۰۴ھ میں احمد آباد میں وفات پائی، اس کے بعد مولانا وجیہ الدین مالکیؒ آئے، ان کی بڑی قدر ہوئی، سلطان گجرات نے ان کو ملک المحدثین کا لقب دیا، وہ یہیں کے ہو رہے، ۹۲۹ھ میں وفات پائی۔

ان ہی کے ہم عصر مولانا علاء الدین احمد نہروالی ہیں، عرب جا کر حافظ بن فہد اور نورالدین شیرازی سے حدیث کی سند حاصل کی، آخر عمر مکہ معظّمہ میں گذاری، حرمین شریفین کے علماء نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ آپ سے حدیث شریف کی اجازت حاصل کی اور وہیں اپنا سلسلہ درس جاری رکھا، ۹۴۹ھ میں وفات پائی۔

ان ہی کے قریب العہد حافظ سخاوی کے دوسرے شاگرد جمال الدین محمد بن عمر

حضرمیؒ مظفر شاہ حلیم سلطان گجرات کے زمانہ میں آئے ،سلطان نے خود زانوئے ادب ان کے سامنے طے کرتے ہوئے ان کو اپنا استاذ بنایا، احمد آباد (گجرات) میں ۹۳۱ھ میں وفات پائی۔

شیخ عبدالمعطی بن الحسن باکثیر المکی کو شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری سے حدیث کی سند حاصل تھی ،۹۵۳ھ میں وفات پائی۔

شہاب الدین احمد العباسی المصری شیخ الاسلام زین الدین زکریا کے شاگرد تھے، اور صاحب تصنیفات تھے، شاہان گجرات کے نام پر کئی کتابیں تصنیف کی تھیں،۹۹۲ھ میں وفات پائی ،سید عبداللہ شیرازی چانپانیر میں حدیث کا درس دیتے تھے، علم حدیث واصول حدیث میں رسالہ لکھا جو مشکل اور جمیع اقسام حدیث کو شامل ہے،۹۸۲ھ میں وفات پائی۔

شیخ محمد بن عبداللہ الفاکہی جو علامہ ابن حجر مکی کے شاگرد تھے،۹۹۲ھ میں وفات پائی، سید شیخ بن عبداللہ العیدروس علامہ ابن حجر مکی اور حافظ عبد الرحمٰن بن ربیع الشیبانی کے شاگرد تھے،۹۹۰ھ میں وفات پائی۔

شیخ محمد بن فضل اللہ احمد آباد میں پیدا ہوئے ،شاہ وجیہ الدین کے شاگرد ہیں، حدیث وتفسیر کے درس میں زندگی بھر مشغول رہے،۹۷۲ھ میں وفات پائی۔

شیخ سعید شافعی حبشی شاگرد ابن حجر مکی متوفی ۹۹۱ھ، جمال الدین محمد بن عبدالرحیم عمودی متوفی ۹۸۴ھ ، جمال الدین محمد علی بن الحشیری متوفی ۱۰۰۰، مجدالدین محمد بن محمد الایجی ، یہ چند اسماء گرامی ان محدثین کے ہیں جنہوں نے گجرات میں رہ کر اپنی عمر عزیز اس فن شریف کی خدمت میں بسر کردی۔

کچھ مدت کے لئے گجرات میں اقامت اختیار کرنے والے محدثین:

کچھ ایسے بھی ہیں جو تشریف لائے اور برسوں رہے، لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا پھر واپس تشریف لے گئے، انہیں بزرگوں میں حدیث شریف کی مشہور کتاب کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال کے مصنف حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو گجرات میں بود و باش اختیار کرنے کے بعد ہجرت کر گئے تھے، ، دو تین بار گجرات تشریف لاکر احمد آباد میں رہے، اور اپنے انفاس متبرکہ سے لوگوں کو عرصہ تک مستفید ہونے کا موقع دیا، سلطان محمد نے آپ کے قدموں میں اپنی سلطنت لاکر رکھ دی، آپ کی اور آپ کے مدرسہ وطلبہ کے وظائف بھی جاری کئے، ۹۷۵ھ میں شیخ علی متقی نے ۹۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

ان ہی بزرگوں میں سید عبدالاول حسینی شارح صحیح بخاری کی ذات گرامی ہے، جو آخر عمر میں بیرم خاں کے اصرار سے دہلی چلے گئے تھے اور وہیں رحلت فرمائی، یہ برسوں گجرات میں رہے، شیخ طیب سندی نے قیام گجرات کے زمانے میں ان سے حدیث پڑھی تھی، جو تقریباً پچاس برس تک ایلچ پور برہان پور میں اس فن شریف کی خدمت کرتے رہے۔

شیخ عبداللہ بن سعد الدین متقی اور شیخ رحمۃ اللہ بن عبداللہ سندی دونوں کا شمار محدثین کبار میں تھا، آپ کی سند حدیث بہت عالی تھی، اور دونوں مہاجر تھے، کشش آب ودانہ سے گجرات تشریف لائے، اور برسوں احمد آباد میں رہ کر حدیث کی خدمت کرتے رہے، اسی زمانہ میں شیخ بہلول دہلوی نے گجرات پہنچ کر ان دونوں بزرگوں سے حدیث پڑھی تھی، اور دہلی واپس جاکر مدۃ العمر اسی فن شریف کی خدمت کرتے رہے، مولانا عبدالملک عباسی کا شمار

ان محدثین کرام میں ہے جنہوں نے ساری عمر اسی فن شریف کی خدمت میں صرف کی، انہوں نے اپنے بھائی مولانا قطب الدین سے حدیث پڑھی تھی اور انہوں نے علامہ سخاویؒ سے استفادہ کیا تھا، ۹۷۰ھ میں وفات پائی، صحیح بخاری ان کو لفظا ومعنا یاد تھی، ایک مؤرخ ان کی نسبت لکھتا ہے "کان حافظا للقرآن وصحیح البخاري لفظا ومعنا وكان يدرس عن ظهر قلبه ولم يكن مثله في زمانه في التوكل والتجريد". یعنی وہ قرآن شریف اور صحیح بخاری کے لفظا ومعنا حافظ تھے، اور اپنی یادداشت سے درس دیتے تھے، ان کے زمانہ میں توکل وتجرید میں ان کی کوئی نظیر نہ تھا۔

حدیث شریف کے درس وتدریس اور کتابوں کی تصنیفات میں خاص اہمیت کے مالک علامہ مجد الدین محمد بن طاہر پٹنی ایسے بلند پایہ محدث تھے جن کے فضل وکمال کی شہرت دنیا بھر میں ہے، اور ان کی تصنیفات سے علماء حجاز ویمن اسی طرح سے فائدہ اٹھاتے ہیں جیسے کہ ہندوستان کے علماء، انہوں نے ملامہنہ، شیخ ناگوری، مولانا یداللہ اور مولانا برہان الدین سے علم حاصل کرنے کے بعد مکہ معظّمہ جاکر شیخ ابوالحسن بکری، علامہ ابن حجر مکی، شیخ علی بن العراق، شیخ جاراللہ بن فہد، ودیگر محدثین کرام سے حدیث پڑھی، اور عرصہ تک شیخ علی متقی کی صحبت میں رہے، وہاں سے آنے کے بعد بجز تصنیف وتدریس کے اور کوئی شغل اختیار نہیں کیا، اور جو دولت ان کو اپنے پدر بزرگوار سے ملی تھی اس کو بے دریغ وظائف طلبہ پر صرف کرڈالا، حضرت شیخ عبدالقادر حضرمی "النور السافر" میں لکھتے ہیں: حتى لم يعلم ان احدا من علماء غجرات بلغ مبلغه في فن الحديث كذا قاله بعض مشائخنا ." ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ یہ بھی معلوم نہیں کہ علماء گجرات میں سے فن حدیث کے

اندر کوئی ان کے برابر کا ہو۔

ان کی سب سے مشہور تصنیف لغت حدیث میں "مجمع بحار الانوار" ہے جس کو یہ کہنا چاہئے کہ وہ صحاح ستہ کی شرح ہے، نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم "اتحاف النبلاء" میں اس کی نسبت لکھتے ہیں: "کتاب متفق علی قبوله بين اهل العلم منذ ظهر فی الوجود، له منة عظيمة بذلك العمل علی اهل العلم" جب سے یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے اسی وقت سے اہل میں یہ مقبول ہے، اور سب کو اس پر اتفاق ہے، شیخ محمد بن طاہر نے اس کو تصنیف کر کے علماء پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

علاوہ اس کتاب کے ان کی تصنیفات میں سے "المغنی فی اسماء الرجال" اور "تذکرة الموضوعات وقانون الموضوعات" بے مثل کتابیں ہیں جو ملا علی قاری اور علامہ شوکانیؒ کی الموضوعات سے بھی بڑی اور ضخیم ہے، ایک رسالہ مشکوۃ شریف کی لغات پر بھی لکھا ہے، ۹۸۶ھ میں ان کو مرتبۂ شہادت حاصل ہوا۔

مفتی قطب الدین محمد نہر والی گجرات کے ان علماء کرام میں تھے جن پر ہم سب کو فخر ہے، یہ بہت بڑے محدث اور ادیب تھے، اپنے والد مولانا علاء الدین احمد سے علم حاصل کر کے مکہ معظّمہ گئے اور شیخ احمد بن محمد العقیلی النویری و محدث یمن عبدالرحمٰن بن علی ربیع سے حدیث پڑھی، نورالدین ابوالفتوح شیرازی سے ان کو بھی صحیح بخاری کی سند حاصل تھی، جو قلت وسائط کی وجہ سے حجاز و یمن میں بہت مقبول ہوئی، ان کو حرم شریف میں درس دینے کا شرف حاصل ہوا، اور باوجود ہندی ہونے کے شرفاء مکہ کے میر منشی قرار دیئے گئے، مزید قابل فخر بات یہ کہ ان کے حرم شرف میں قیام کے دوران محدث کبیر شارح حدیث ملا علی قاریؒ نے

آپ سے حدیث کے علم میں زانوئے تلمذ طے کیا۔

حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں جنہوں نے ۶۷ سال تک احمد آباد میں معقولات ومنقولات کا درس دیا، درس نظامی کی ۲۲ کتابوں پر حواشی لکھے، اصول حدیث کی مشہور کتاب شرح نخبة الفکر پر بھی آپ کا حاشیہ ہے، جس کا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانے میں موجود تھا، آپ کے ایک شاگرد حکیم عثمان صدیقیؒ نے بخاری شریف کی شرح بھی لکھی ہے۔

مولانا نور الدین احمد آبادی؛ کثرت تصنیفات میں شاہ وجیہ الدین کے بعد آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں گذرا، بخاری شریف کی ایک شرح لکھی ہے جس کا نام نور القاری شرح صحیح البخاری ہے۔

مولانا خیر الدین سورتی جو شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد ہیں، ۵۰ سال تک سورت میں آپ نے حدیث شریف کا درس دیا ہے۔

شیخ تاج الدین پٹنی صحاح ستہ کے حافظ تھے، شیخ عبد الکریم گجراتی جو ابن حجر مکی کے شاگرد ہیں ”النهر الجاری علی البخاری“ کے نام سے بخاری شریف کی شرح لکھی ہے، شیخ جعفر بخاری گجراتی کی ”الفیض الطاری شرح البخاری“، شیخ شطاری گجراتی کی ”ذریعة النجاة شرح مشکوة“ اور ”شرح نخبة الفکر“، شیخ سعید جعفر گجراتی کی ”زینة النکات شرح مشکوة“ عبد القادر حضرمی کا فتح الباری شرح بخاری پر حاشیہ، شیخ ابوبکر بھروچی کا شفاء قاضی عیاض کا فارسی ترجمہ، مولانا ولی اللہ سورتی کی ”التنبیهات النبوية فی سلوك الطريقة المصطفوية “ اور مشکوۃ شریف، شفاء قاضی عیاض اور المواهب اللدنيه

کی تلخیص، مولانا ہاشم سورتی کے تراجم بخاری پر عربی میں سات اجزاء، مولانا فاضل سورتی کی معین الفضائل شرح شمائل وغیرہ کتب حدیث وشروحات؛ بخاری وغیرہ علم حدیث کے ساتھ ان کے خصوصی تعلق اور شغف کی دلیل ہے۔

وہ محدثین گجرات جن کا فیض بیرون گجرات پہنچا:

اسی کے ساتھ کچھ وہ محدثین گجرات بھی ہیں جن کا فیض حرمین شریفین اور گجرات کو چھوڑ کر ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں بھی پہنچا، وہاں انہوں نے حدیث کی مسند بچھائی اور اس علاقہ کو قال الرسول ﷺ کی صداؤں سے گونجتا کر دیا، ان میں سید مولانا یسین گجراتی ہیں جنہوں نے حرمین شریفین جا کر علم حدیث کا فیض حاصل کیا، پھر پنجاب اور بنگال ہوتے ہوئے صوبۂ بہار پہنچے اور وہاں حدیث شریف کا فیض جاری کیا، بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ ’’یہ پہلا موقع ہے کہ بہار کی مسجدوں سے قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کا ترانہ سمع نواز ہوا‘‘ آپ کی دی ہوئی سند حدیث کا قلمی نسخہ پھلواری شریف میں محفوظ ہے۔

شاہان گجرات کی علم دوستی:

ان محدثین عظام کے ساتھ شاہان گجرات کو بھی فراموش نہیں کر سکتے جن کی مردم شناسی اور قدر دانی نے ان کے دربار کو ہر علم وفن کے ارباب کمال سے مزین کیا ہوا تھا، بقول مولانا سید عبدالحیؒ: ’’شاہان گجرات نے اپنی ڈیڑھ سو سالہ دور حکومت میں جس قدر علوم وفنون کی سرپرستی کی ہے دہلی کی چھ سو سالہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی‘‘ یہ صرف ان کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ شیراز ویمن اور دیگر ممالک اسلامیہ کے چیدہ علماء نے گجرات آ کر اپنے فیوض علمی کی آبیاری سے گجرات ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی درسگاہوں کو سیراب کیا،

انہیں حکمرانوں میں مظفرشاہ حلیم تھے، جنہوں نے خود بھی حدیث شریف کا درس علامہ جمال الدین الحضرمی اور محمد بن محمد الایجی سے حاصل کیا، مدۃ العمر حدیث پر عامل رہے۔

سلطان محمود شاہ دوم نے اپنے زمانے میں مکہ مکرمہ میں باب العمرۃ کے پاس عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا جس میں علامہ ابن حجر مکیؒ اور شیخ عزالدین زمزمی جیسے محدثین عظام درس دیتے تھے، وزیر خداوند خاں شاہی وزیر ہونے کے باوجود حدیث اور اسمائے رجال میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ بڑے بڑے علماء ان سے علم حدیث حاصل کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے، مغل بادشاہوں میں ہمایوں نے آپ سے حدیث کی سند حاصل کی، اسی طرح وزیر آصف خاں باوجود وزارت کے منصب جلیلہ کے وفات تک درس میں مشغول رہے، بادشاہوں کی قدردانی اور وزراء کے کمال نے ہر طرف علم کا چرچا پھیلا دیا تھا، مدارس ومکاتیب کا جال بچھا ہوا تھا، بڑے بڑے ۳۳ مدارس اور ۳۴ کتب خانوں کا ذکر کتابوں میں آتا ہے، جس میں وزیر آصف خاں کے کتب خانے میں مشکوۃ شریف کا نسخہ مشکوۃ کے مصنف ولی الدین خطیب تبریزی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اس نسخہ کو وزیر آصف خاں نے سونے سے وزن کر کے خریدا تھا، اسی طرح مولانا عمادالدین کا کتب خانہ جس میں پانچویں صدی کی احادیث کی کتابیں بھی موجود تھیں۔

تابناک ماضی سے شاندار حال کا ربط اور مستقبل کی بنیاد:

گجرات کے تابناک ماضی کے ساتھ الحمدللہ اس کا حال بھی شاندار ہے، اس وقت سینکڑوں دینی مکاتیب، دسیوں بڑے بڑے دارالعلوم اور ان کے ساتھ عالی شان کتب خانے قائم ہیں، ان دارالعلوموں میں تمام علوم وفنون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ حدیث شریف

کی تعلیم بھی خصوصیت کے ساتھ دی جاتی ہے اور کتب خانوں میں تمام علوم وفنون کی کتابوں کے ساتھ الحمدللہ احادیث کی کتابیں بڑے مصارف خرچ کر کے شاندار طباعت کے ساتھ عرب ممالک سے خریدی جاتی ہیں،اسی طرح اسلاف کی حدیث شریف کی خدمت کی جھلک اوریادتازہ کراتی ہے، فالحمد لله علی ذلك اولا و آخرا. حق تعالی شانہ سے دعاہے کہ وہ حدیثی علوم کے لئے گجرات کواپنی سابقہ روایات کےساتھ باقی رکھے،آمین۔

وصلى الله تعالى على خير خلقه ونور عرشه سيدنا محمد وآله واصحابه اجمعين.

❖❖❖

خطبۂ افتتاحیہ

ضلع بھروچ میں مودودیت وغیر مقلدیت کے داعی متحرک تھے، ان کی ریشہ دوانیوں سے متنبہ کرنے اور صحیح مسلک کی طرف رہنمائی کے لئے حضرت مولانا اسماعیل صاحب بھوٹا (مہتمم جامعۃ البنات ٹنکاریہ ضلع بھروچ) نے دار القرآن والحدیث ٹنکاریہ میں علمائے کرام کا اہم اجتماع بلایا تھا، اس اجلاس کے موقع پر افتتاحیہ تیار کرنے کی ذمہ داری راقم السطور کے سپرد کی گئی تھی، ان فرق کی مختصر تاریخ، ان کے افکار ونظریات کا اجمالی خاکہ اوران فرق کی تاریخ پیدائش ذکر کرتے ہوئے ایک تاریخی مبسوط خطبہ پیش کیا گیا ہے۔

خطبۂ افتتاحیہ

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتو كل عليه و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سيئآت أعمالنا ، من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له، و نشهد أن لا اله إلا الله و حده لاشريك له و نشهد ان سيدنا و مولانا محمدا عبده و رسوله ، صلى الله عليه وعلى آله و اصحابه و ازواجه و ذريته اجمعين .

امابعد ! خداوندرحمٰن ورحیم کا فضل وکرم ہے کہ اس نے ہمیں دین صحیح کی نعمت عطا کی، صراط مستقیم پر قائم وبرقرار رکھا اور اس بابرکت اجتماع میں شریک ہوکر نیک مقاصد کے حصول کی پاکیزہ سعی کی توفیق عنایت فرمائی۔

اس مبارک موقع پر میں مجلس تحفظ اہل سنت والجماعت اور اس کے تمام خدام کی جانب سے زحمت سفر برداشت کر کے تشریف لانے والے تمام حضرات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ ہماری کوشش کو اخلاص کی روح، افادیت کے ثمرات اور اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے ہم کنار کرے. آمین۔

بیسوی صدی کے اوائل میں دین سے متعلق جن گمراہیوں کا آغاز ہوا؛ ان میں سب سے بڑی گمراہی عقلیت پرستی کا رجحان تھا، جو انیسویں صدی میں یورپ سے زوروشور کے ساتھ اٹھا اور بعض مسلمان اہل قلب اس سے شدید متأثر ہوئے، اس کی وجہ سے اسلام کی جدید تعبیر وتشریح کا ایک نیا اور گمراہ کن سلسلہ شروع ہوگیا، اور دنیا کی ہر نئی بات، نئی تجویز اور

نئے نظریہ پر اسلام کو چسپاں کرنے کی جسارت عام ہوگئی۔

نیتوں کا خلوص اور ارادوں کی معصومیت کسی غلط چیز کو صحیح نہیں بنا دیتی، یہ نیا ذہن جن غلط تصورات کے ساتھ ابھرا وہ مسلمانوں کے لئے ایک شدید فتنہ وآزمائش بن گیا، ایک طرف اسی ذہن کے یہ دعوے ہیں کہ وہ اسلام کے تنہا صحیح ترجمان ہے اور اس کی تمام تر جدوجہد اقامت دین کی ہے، وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کا نفوذ چاہتا ہے، تو دوسری طرف گروہ بندانہ عصبیت کے ساتھ یہ ذہن اجتماعی تنظیم شروع کرتا ہے، ساتھ ہی نیک وبد کی آویزش کو جس طرح تعبیر کرتا ہے اس سے دینی خلوص کے بجائے ذاتی اور گروہی عصبیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پھر یہ ذہن اپنی پیش کردہ فکر کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے ماضی وحال کے تمام افکار کی بے رحمانہ تنقید کرتا ہے اور دوسروں کی آراء کو جانچنے کیلئے ایک محدود اور تنگ سانچہ بنالیتا ہے۔

اواخر خلافت راشدہ میں جس گروہ نے قرآن سے ماخوذ نعرہ "ان الحکم إلا لله" پر عامۃ المسلمین کے خلاف خروج کیا تھا اس نے اپنی فہم وفراست کے مطابق نیک نیتی کے ساتھ غالباً اس نعرہ میں وقت کے مسائل کا حل سمجھا تھا، لیکن اسی دور کی سب سے بڑی ہستی نے اسے مسترد کردیا۔ خلقِ قرآن کا نظریہ ایک علمی اور بے ضرر نظریہ نظر آتا ہے اور جسے ایک ایسے گروہ نے پیش کیا تھا جو بزعم خود قرآن واسلام کا بہترین خادم تھا اور دور حاضر کے متجددین کو جن کے افکار واستدلال سے گہری دلچسپی ہے؛ لیکن اسے بھی کچل دیا گیا۔

الحاصل! ابتدائے اسلام سے سرسید احمد خان مرحوم کے دور نیچریت اور مرزا غلام احمد قادیانی کے تبنیت تک ایسے اصحابِ فہم ودانش کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی

ہے جن کی نیک نیتی اور جذبۂ خدمت ملّی مسلّم ہے؛ لیکن ان کی فکری لغزشوں کے ایک معمولی اقدام کی حوصلہ افزائی نے امت مسلمہ کے مستقبل پر نہایت اندوہناک اثر ڈالا۔

بے لگام آزادیٔ افکار کے اس دور میں آزادانہ انشاء پردازی ہی شہرت وعظمت کا واحد ذریعہ ہے، چنانچہ انشاء پردازوں کا ایک گروہِ جدید بھی اسلام کو اپنی قلموں کی جولانگاہیں بنائے ہوئے ہے، ان کی انفرادی تحقیق اور دین اسلام کی نئی تعبیرات نے جہاں اسلام کو بازیچۂ اطفال بناڈالا؛ وہیں سلف سے بے زاری وبداعتمادی کی بنیاد ڈالی، نتیجہ میں مودودیت، غیر مقلدیت، پرویزیت، چکڑالویت، نیچریت، آغاخانیت، قادیانیت، و اباحیت پسند جیسی جماعتیں وجود میں آئیں، آج کے مسلمانوں میں اسلام سے بغاوت کا جو ذہن جگہ جگہ پھیلا ہے وہ اسی کی رہین منت ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ جس سے کوئی بات پوچھی بھی نہ جائے وہ بھی آگے بڑھ بڑھ کے بتانے کو موجود ہے اور جس کسی نے تھوڑی سی عربی پڑھ لی ہو اور فقہ وتفقہ کا ذرا بھی اہتمام نہ ہو وہ بھی دنیاوی حالات سے متأثر ہوکر فتوی دینے اور تحلیل محرمات کے لئے تیار ہے، ان کی ڈاڑھیاں کٹی ہوئی ہیں، ٹخنوں کے نیچے پائجامے ہیں، قرآن شریف کا ایک صفحہ بھی صحیح یاد نہیں، بخاری ومسلم کا ایک باب بھی نہیں پڑھا، قرآن مجید سے اتنا بھی لگاؤ نہیں کہ روزانہ ایک پارہ تلاوت کر لیتے ہوں، ان کا ذوق اجتہاد بہت آگے بڑھ رہا ہے، اجتہاد نے انہیں اباحیت پسندی تک پہنچادیا، اس نئے اجتہاد اور اباحیت پسندی کا کرشمہ آپ ان مثالوں میں ملاحظہ فرمائیں کہ ایک مجتہد صاحب نے فرمایا کہ ۳۰/ دن کے روزے مُلّا کی ایجاد ہے ورنہ قرآن شریف میں ایامًا جمع قلت ہے، لہذا ۹/ روزہ ہونے چاہئے، ایک منکر

حدیث نے غضب ہی کر دیا اور کہا: قرآن سے تین نمازوں کا ثبوت ہے، پانچ نمازیں ملا کی ایجاد ہے، اپنی خواہشات کی تکمیل میں الدین یسر اور وما جعل علیکم فی الدین من حرج جیسے دلائل پیش کر کے یضل بہ کثیرا کا مصداق بنتے ہیں۔

مقام شکر ہے کہ ما انا علیہ و اصحابی پر عامل گروہ ہمیشہ اس الحاد وزندقہ سے امت کو متنبہ کرتا رہا ہے، ہمارے اکابر نے جن فتنوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سے مودودیت، غیر مقلدیت، پرویزیت کی فتنہ سامانی وفتنہ سازی کا ہم روزمرّہ مشاہدہ کرتے ہیں۔

چنانچہ فتنہ مودودیت کی نشاندہی کرتے ہوئے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ نے ایک سائل کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنا اور تعاون کرنا درست نہیں، اس جماعت کی کوشش اس اسلام کے لئے نہیں جو حقیقی ہے؛ بلکہ ایک نام نہاد مودودی صاحب کے اختراعی اور نئے اسلام کے لئے ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کو کسی نے مودودی صاحب کا رسالہ ترجمان دیا تو آپ نے چند سطریں پڑھ کر ارشاد فرمایا کہ باتوں کو نجاست میں ملا کر کہتا ہے، اہل باطل کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ کو مودودی لٹریچر کے متعلق جب دریافت کیا گیا تو آپ نے یہ مضمون تحریر فرمایا: مودودی جماعت کے لٹریچر سے عام لوگوں پر یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ ائمہ ہدایت کی اتباع سے آزادی اور بے تعلقی پیدا ہو جاتی ہے جو عوام کے لئے مہلک اور گمراہی کا باعث ہے، جو حضرات اس کو معمولی سمجھتے ہیں ان کو غالبًا جماعت کے افراد

سے اختلاط کی نوبت نہیں آتی، جس سے ان کو مضرتوں کا اندازہ نہیں ہوتا، بہر حال یہ ناکارہ اس جماعت میں شرکت یا ان کے لٹریچر پڑھنے کو مسلمانوں کے لئے انتہائی مضر سمجھتا ہے۔

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے ایک سوال کے جواب میں - جو جناب مودودی صاحب کے متعلق تھا - ارشاد فرمایا کہ بظاہر یہ شخص منکر حدیث ہے، دائرہ اسلام سے تو خارج نہیں مگر گمراہ اور مبتدع ہے۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: احقر کے نزدیک مولانا مودودی صاحب کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ عقائد واحکام میں ذاتی اجتہاد کی پیروی کرتے ہیں، خواہ ان کا اجتہاد جمہور علمائے سلف کے خلاف ہو؛ حالانکہ احقر کے نزدیک منصب اجتہاد کے شرائط ان میں موجود نہیں، اسی بنیادی غلطی کی بناء پر ان کے لٹریچر میں بہت سی باتیں جمہور علمائے اہل سنت کے خلاف ہیں۔

حضرت مولانا منظور نعمانی صاحبؒ جن کے نام کا سہارا لے کر مودودیت اپنی حقانیت کا دعوی کرتی تھی جب ان پر حق آشکار ہوا تو انہوں نے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے فرمایا کہ جماعت اسلامی کی دعوت سے متاثرہ جو حلقہ ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ رفتہ رفتہ ان سب کا یہ ذہن بنتا جارہا ہے کہ دین اور دین کے تقاضوں کو اگلوں نے صحیح نہیں سمجھا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ جو ابتداء میں اس کے حامی ودوش بدوش چل رہے تھے، اس کی خطرناکی وتباہ کاری کو محسوس کرتے ہوئے الگ ہوکر فرماتے ہیں کہ انہوں نے ان اصطلاحوں کی جو تعبیر وتشریح کی اور ان کا جو مرکزی نقطہ اصل روح اور مرکزی خیال قرار دے کر اس پر زور دیا؛ اس نے اسلام وقرآن کی ایک نئی تفسیر کا نمونہ پیش کیا جس پر سیاسی رنگ

غالب ہے، اور وہ حاکمیت الٰہ اور سلطانیٔ رب کے گرد گھومتا ہے، اور اس سے نزول قرآن اور دعوت اسلامی کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام رہ جاتا ہے، نیز انہوں نے مقصد و وسائل کے بارے میں جو نیا موقف اختیار کیا اور عبادات وذکر کے بارے میں جن خیالات اور نئی تحقیقات کا اظہار کیا ہے اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ جو نسل خالص ان تحقیقات وخیالات کے سایہ میں پروان چڑھے گی اس کا ایک نیا دینی مزاج بن جائے گا جو اس مزاج سے مختلف ہوگا جس کو تربیت وصحبت نبوی، اسوۂ رسول اکرم ﷺ اور صحابہؓ کی اقتداء نے تیار کیا۔

عرصۂ دراز تک مودودی صاحب کے ہمسفر رہنے والے اور جماعت اسلامی کے صف اول میں شمار ہونے والے مولانا وحید الدین خاں اس تحریک کا تجزیہ یوں پیش کرتے ہیں: تعبیر کی غلطی کا پہلا کھلا ہوا نقصان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ذہنوں میں دین کا تصور بدل گیا، یہی وجہ ہے کہ اس نے جن ذہنوں میں جگہ بنائی وہ پورے مجموعۂ دین کو ایک مختلف نظر سے دیکھنے لگے، اور جب مجموعہ کے بارے میں نقطۂ نظر بدل جائے تو پھر اسی نسبت سے سارے متعلق اجزاء کی حیثیت میں فرق آجاتا ہے۔ اس فکر نے دین کی جو تصویر بنائی ہے اس میں بظاہر سارے اجزائے دین موجود ہیں مگر سب کے سب اپنے اصل مقام سے ہٹے ہوئے ہیں، اس میں اجزائے دین کی ترتیب کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھتا ہے تو اس میں اسلام بحیثیت ''نظام'' تو بہت ابھرا ہوا نظر آتا ہے مگر اس کا تعبدی پہلو کمزور پڑ جاتا ہے، اس تصویر میں ایمان، اسلام، تقویٰ، احسان، سب کچھ موجود ہے؛ مگر یہ الفاظ اصلاً تعلق باللہ کے مراحل کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ وہ ''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' ہیں، وہ تعلق باللہ کے ان مخصوص مظاہر کے پیمانے ہیں جو امامت صالحہ اور ''نظام قیام'' کی

شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو اس تعبیر کے نزدیک ''دین کا حقیقی مقصود'' اور دنیا میں ''مسلمان کی سعی منتہیٰ'' ہے۔ یہ حقیقت ایمانی کے ظہور کے وہ مراتب ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ آدمی مذکورہ بالا انقلابی جدوجہد کے اعتبار سے کس مقام پر ہے۔

جب دین کا تصور یہ ہو جائے تو پھر آپ کو تعجب نہ کرنا چاہئے، اگر ایسے افراد کا دینی تعلق ایک مخصوص سیاسی ڈھانچہ کے نفاذ کے بارے میں تو خوب ظاہر ہوتا ہو مگر ذکر و شکر اور اخبات و انابت کی حقیقتیں ان کے یہاں غائب ہوگئی ہوں۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہوں گے مگر مسائل عالم کے موضوع پر گفتگو کرنے سے ان کی زبان کبھی نہیں تھکے گی، نماز کی ''اقامت'' سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہوگی مگر وہ حکومت الہیہ قائم کرنے کا نعرہ بلند کریں گے، ان کی اپنی زندگی میں زبردست خلا ہوں گے، مگر وہ عالمی نظام کے خلا کو پر کرنے کی باتیں کریں گے، ان کا گھر جہاں وہ آج بھی قوام کی حیثیت رکھتے ہیں، اس میں اپنی بساط بھر عام دنیا پرستوں کے گھر کی تقلید ہو رہی ہوگی، مگر ملک کے اندر وہ قوام کی حیثیت حاصل کرنے کی تحریک چلائیں گے، تاکہ ملک کو دنیا پرست لیڈروں کے اثرات سے پاک کرسکیں، ان کا سینہ خدا کی یاد سے خالی ہوگا، مگر وہ اقتدار حاصل کرکے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن پر قبضہ کرنے کی تجویز پیش کریں گے، تاکہ دنیا بھر میں خدا پرستی کا چرچا کیا جاسکے، اپنی ذاتی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے جن اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے ان پر عمل کرنے میں وہ ناکام رہیں گے، مگر ملکی نظام سے لیکر اقوام متحدہ کی تنظیم تک کی اصلاح کے لئے ان کے پاس درجنوں اصول موجود ہوں

گے، ان کے کاغذی نقشے اوراخباری بیانات دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ملت اسلام کا انہیں کس قدر درد ہے کہ کسی مسئلے کا دور قریب کا رشتہ بھی اگرملت کے ساتھ ثابت ہوجائے تو وہ اس کو حل کرنے کے لئے بے قرار ہوجاتے ہیں، لیکن ان کے قریب جاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اس اظہار غم کی حیثیت رسمی تعزیت سے زیادہ نہیں ہے جو مرنے والے کے غم میں نہیں بلکہ صرف اس اندیشے سے کی جاتی ہے کہ زندہ رہنے والوں کو شکایت ہوگی، اپنے آج کے حاصل شدہ دائرے میں وہ نہایت سطحی اور غیر ذمہ دارانہ زندگی گزار رہے ہوں گے، مگر اپنی انقلابی تحریک کی کامیابی کے بعد انہیں کام کا جو وسیع تر دائرہ حاصل ہوگا اس کا نقشہ اس طرح پیش کریں گے گویا خلافت راشدہ از سرنو دنیا میں لوٹ آئے گی۔

نیز تحریر فرماتے ہیں: آج کل جماعت اسلامی کے رہنما بظاہر ملی معاملات میں کافی پیش پیش نظر آرہے ہیں، تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت، مسلم کنونشن کی تجاویز، فسادات کے موقع پر ریلف کا کام، مسلمانوں کا انگریزی اخبار نکالنے کی کوشش، ملکی وعالمی مسائل پر بیانات اور''انٹرویو'' مگر یہ حقیقۃً کسی فکری سرچشمہ سے نکلی ہوئی چیز نہیں ہے، اس کے اسباب کچھ اور ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان سرگرمیوں میں وہ حقیقی روح نہیں پائی جاتی جو خدمت دین کے کاموں میں فی الواقع ہونی چاہئے۔

جماعت اسلامی کی تاریخ میں یہ نیا رجحان پیدا ہونے کی پہلی اور خاص وجہ یہ ہے کہ جماعت کا جو فکر ہے اس کے مطابق اس کا ذہن قدرتی طور پر''سیاسی'' قسم کے کام تلاش کرتا ہے، تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے مخصوص حالات کی بناپر وہاں کی جماعت کو ایسے کام

مل گئے اور وہ اس کے سہارے کھڑی ہوگئی مگر ہندوستان کے حالات مختلف تھے، اس لئے یہاں ایسا کوئی کام نکل نہ سکا، یہ چیز ہندوستان میں تحریک کے افراد کو جمود اور سرد مہری میں مبتلا کررہی تھی، پہلے اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے ''تعمیر ذہن اور تزکیۂ قلب'' کی مہم شروع کی گئی۔

اس دوران میں جماعت کے اندر بہت سے لوگ شدت سے یہ بات پیش کررہے تھے کہ جماعت نے تربیت کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ خانقاہی تربیت کا طریقہ ہے، اس سے جماعت کے اندر کوئی زندگی پیدا ہونے والی نہیں ہے، یہ شیر کو گھاس کھلا کر موٹا کرنے کی کوشش ہے، جو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، جماعت کے اندر زندگی پیدا کرنے کی صحیح صورت یہ ہے کہ انقلابی انداز میں کوئی عملی پروگرام بنایا جائے، یہ ایک انقلابی جماعت ہے اس لئے انقلابی پروگرام ہی سے اسے غذا مل سکتی ہے، پہلے فکر کی ناکامی کے اندر سے یہ دوسرا فکر دھیرے دھیرے ابھر رہا تھا، جماعت کے بعض رہنما جو اس فکر سے کچھ زیادہ متفق نہیں ہیں، مگر حالات نے انہیں جس رعیت کا راعی بنایا ہے اس کے مخصوص ذہن کے پیش نظر انہیں بھی کوئی دوسری تدبیر نظر نہیں آتی؛ بالآخر اس چیز نے جماعت کو عملی اور ہنگامی کاموں کی طرف موڑ دیا، ملک کی عمومی سیاست میں تو اس کے لئے اس طرح کے کام کا موقع نہیں تھا، البتہ مسلم سیاست کے میدان میں جماعت نے کچھ ایسے ''عملی کام'' ڈھونڈ لئے ہیں جن کے سہارے تحریک کے افراد کو زندہ رکھا جاسکے۔

چنانچہ جو کام سابق تربیتی پروگراموں سے نہ ہوسکا تھا وہ اب کچھ ہوتا ہوا نظر آنے لگا ہے، جب سے اس قسم کے مخصوص ''عملی کام'' شروع ہوئے ہیں جماعت کے اندر زندگی کی

ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔

اسی آزادئ فکر اور اسلاف سے بداعتمادی کی بدولت وجود میں آنے والا دوسرا تخریبی گروہ غیر مقلدین کا ہے، ہندوستان میں اس فرقہ کا ظہور انگریز کی نظر کرم وچشم التفات کا رہین منت ہے ،اس نے اپنے شاطرانہ اصول کے تحت یہاں کے باشندوں کو مذہبی آزادی دی؛ کیونکہ وہ ابلیس سیاست بخوبی جانتا تھا کہ مذہبی آزاد خیالی ہی تمام فتنوں کا منبع ،مصدر اور سر چشمہ ہے، اسی مذہبی آزادی کے نتیجہ میں فرقۂ غیر مقلدیت ظہور پذیر ہوا؛ پھر اس فرقہ کے بطن سے فتنہ پرویزیت ،فتنہ نیچریت ،فتنہ انکار حدیث ،فتنہ مرزائیت اور فتنہ اباحیت وتجدید پسندی نے جنم لیا۔

اس فرقہ کا وجود ہی چونکہ احسانِ انگریز اور آزاد خیالی پر مبنی ہے؛ لہذا نواب صدیق حسن خاں اس بارے میں انگریز کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ کتب تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے جو امن وآسائش وآزادگی اس حکومت انگریز میں تمام خلق کو نصیب ہے کسی بھی حکومت میں نہ تھی اور وجہ اس کی سوائے اس کے کچھ نہیں سمجھی گئی کہ گورنمنٹ نے آزادئ کامل ہر مذہب والے کو دے رکھی ہے۔ (ترجمان وہابیہ:ص:۱۶)

فرقہ کی پیدائش کا زمانہ دور انگریز ہے، اس سے پہلے اس فرقہ کا کہیں نام ونشان نہ تھا؛ چنانچہ نواب صاحب لکھتے ہیں ’’خلاصۂ حال ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ ہے کہ جب سے یہاں اسلام آیا ہے چونکہ اکثر لوگ بادشاہوں کے طریقہ اور مذہب کو پسند کرتے ہیں، اس وقت سے آج (انگریزی دور) تک یہ لوگ مذہب حنفی پر قائم رہے۔ نیز لکھتے ہیں:

ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ سے مذہب حنفی یا شیعی رکھتے ہیں۔(ترجمان وہابیہ:ص:۸۶)

مشہور غیر مقلد عالم مولوی محمد شاہ جہانپوری اس فرقہ کے نومولود و نوخیز ہونے پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں ''کچھ عرصہ سے ہندوستان میں ایک ایسے غیر مانوسی مذہب کے لوگ دیکھنے میں آرہے ہیں جس سے لوگ بالکل ناآشنا ہیں، پچھلے زمانہ میں شاذ و نادر اس خیال کے لوگ کہیں ہوں تو ہوں مگر اس کثرت سے دیکھنے میں نہیں آئے، اپنے آپ کو تو وہ اہل حدیث یا محمدی یا موحد کہتے ہیں؛ مگر مخالف فریق میں ان کا نام غیر مقلد، وہابی یا لامذہبی لیا جاتا ہے''۔(الارشاد الی سبیل الرشاد:ص:۱۳)

تنبیہ الضالین میں موصوف رقمطراز ہیں ''سو بانی مبانی اسی فرقہ نواحداث کا عبد الحق بنارسی ہے''۔

یہ عبدالحق بنارسی کون ہے؟ اسے پہچاننے کے لئے قاری عبدالرحمٰن پانی پتیؒ کا یہ مضمون ملاحظہ فرمائیں: لکھتے ہیں کہ عبدالحق بنارسی نے ہزار ہا آدمیوں کو عمل بالحدیث کے پردہ میں قید مذہب سے نکال دیا اور مولوی صاحب نے ہمارے سامنے کہا کہ حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ سے لڑ کر مرتد ہوگئی اور بے توبہ مری تو کافر مری (معاذ اللہ)۔ صحابہؓ کو پانچ پانچ حدیثیں یاد تھیں، پھر وہ تھوڑے عرصہ کے بعد شیعہ عالم مولوی گلشن علی کے پاس گیا اور کہا کہ میں شیعہ ہوں، اب ظہرا شیعہ ہوتا ہوں، کہتا ہے کہ عمل بالحدیث کے پردہ میں وہ کام کیا جو عبداللہ بن سبا نے بھی نہیں کیا۔(کشف الحجاب)

ان لامذہبوں کا ابتداء میں کوئی نام نہ تھا، اس کے علم برداروں نے پہلے اپنے آپ کو موحد کہنا شروع کیا، پھر محمدی نام رکھا، پھر غیر مقلد نام رکھا، ان کے بعض عقائد کی بنا پر عوام

نے ان کو وہابی کہنا شروع کیا؛ چونکہ یہ لفظ اس وقت ایک گالی سمجھا جاتا تھا اس لئے ان کو اس کی فکر دامنگیر ہوئی کہ نام بدلوانا چاہئے؛ لہذا انہوں نے اپنے آقا ولی نعمت انگریز کا دروازہ کھٹکھٹایا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے محمد حسین بٹالوی نے نسخ جہاد پر ایک کتاب ''الاقتصاد'' لکھی، جس میں ثابت کیا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا حرام ہے، اسی طرح نواب صدیق خان نے ترجمانِ وہابیہ لکھی جس میں انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں کو خوب برا بھلا کہا گیا، انگریز کی خوشنودی کے تمام ذرائع مکمل کرنے کے بعد محمد حسین بٹالوی نے اپنی جماعت کے مقتدر علماء کی رائے اور دستخط سے اپنی جماعت کے لئے اہل حدیث کا لقب الاٹ کرانے کے لئے سرکار کی خدمت میں ۱۸۸۶ء میں ایک درخواست پیش کی، چنانچہ انگریز نے ان کے سابقہ جلیل القدر کارناموں کے پیش نظر وہابی نام کو منسوخ کر کے اہل حدیث نام کا الاٹ کیا۔

غیر مقلدیت ہے کیا؟ اسے سمجھنے کے لئے غیر مقلد عالم محمد ابراہیم سیالکوٹی کی شہادت ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں: جماعت اہل حدیث اپنے ناقص العلم غیر محتاط نام نہاد علماء کی تحریروں سے دھوکہ نہ کھائے کیوں کہ ان میں بعض تو پرانے خارجی ہیں اور بعض پرانے کانگریسی۔ (احیاء المیت: ص:۳۶)

علامہ وحید الزماں شہادت دیتے ہیں کہ غیر مقلدوں کا گروہ جو اپنے تئیں اہل حدیث کہلاتا ہے انہوں نے ایسی آزادی اختیار کی ہے کہ مسائل اجماعی کی بھی پرواہ نہیں کرتے؛ نہ سلف صالحین صحابہ اور تابعین کی۔ قرآن کی تفسیر صرف لغت سے کر کے اپنی من مانی کرتے ہیں، حدیث شریف میں جو تفسیر آ چکی ہے اس کو بھی نہیں سنتے۔ (حیات وحید الزمان: ص:۱۰۲، بحوالہ لغات الحدیث: ص:۱۶۹)

اس فرقہ کے بڑے بڑے علماء میں سے مولانا عبدالجبار غزنوی - جن کو یہ امام صاحب کہتے ہیں، یہ سید ابوبکر غزنوی بانی جامع ابی بکر گلشن اقبال کراچی کے دادا ہیں - اور مولانا عبدالتواب (ملتانی جو اس فرقہ کے بہت مایۂ ناز مناظر ہوئے ہیں) ان دونوں کی شہادت یہ ہے: ''اور ہمارے اس زمانہ میں ایک فرقہ نیا کھڑا ہوا ہے جو اتباع حدیث کا دعوی رکھتا ہے؛ مگر یہ لوگ اتباع حدیث سے کنارہ (بہت دور) ہیں، جو حدیثیں سلف اور خلف کے ہاں معمول بہا ہیں ان کو ادنی سی قدح اور کمزور سی جرح پر مردود کہہ دیتے ہیں اور صحابہ کے اقوال اور افعال کو ایک بے طاقت سے قانون اور ایک بے نور سے قول کے سبب پھینک دیتے ہیں اور ان احادیث نبویہ اور فرمودات صحابہ پر اپنے بے ہودہ خیالوں اور بیمار فکروں کو مقدم کرتے ہیں اور اپنا نام محقق رکھتے ہیں - حاشا و کلا - اللہ کی قسم یہی لوگ ہیں جو شریعت محمدی کی حد بندی کے نشان گراتے ہیں اور ملت حنفیہ (اسلام) کی بنیادوں کو کہنہ کرتے ہیں اور سنت مصطفویہ کے نشانوں کو مٹاتے ہیں اور احادیث مرفوعہ (نبویہ) کو چھوڑ رکھا ہے اور متصل الاسانید آثار صحابہ کو پھینک دیا ہے اور ان فرمودات رسول اللہ ﷺ اور ارشادات صحابہؓ کو دفع کرنے کیلئے وہ حیلے بناتے ہیں کہ جن کیلئے کسی یقین کرنے والے کا شرح صدر نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی مؤمن کا سر اٹھتا ہے''۔ (فتاوی علماء حدیث: ج:۷، ص:۷۹، ۸۰)

مولانا محمد حسین بٹالوی مزید فرماتے ہیں: ہمارے بھائیوں میں اب ترک تقلید اور عمل بالحدیث میں غلو ہو گیا ہے اور افراط شدید نے ان پر ایسا غلبہ اور تسلط پایا کہ وہ تقلید کا نام سن کر ایسے چونک پڑتے ہیں جیسے آگ کا ڈرا ہوا کرمکِ شبِ تاب کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے اور ترک تقلید کے نشہ میں ایسے سرشار ہیں کہ محلِ ضرورتِ تقلید میں بھی کسی کی تقلید جائز نہیں سمجھتے

اور اپنی فکر نارسا اور اجتہاد ناروا سے کام لیتے ہیں، تقلید کو بلا استثناء صلوٰتیں سناتے ہیں اور مقلدین کو برملا برائی سے یاد کرتے ہیں۔ (اشاعۃ السنہ: ج:۱۱، ص:۳۰۳)

نیز لکھتے ہیں ''ایک صاحب فرماتے ہیں: اب لوگ اللہ کے فضل سے اس پیرزال فحبہ کو طلاق دے چکے ہیں، اس سے نکاح کا دوبارہ کوئی طالب نہیں''۔ (ایضا: ص:۳۰۴) نیز فرماتے ہیں کہ ''ہمارے خواص کا ترک تقلید میں غلو ثابت ہے تو اس سے عوام کے غلو کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے؛ لہذا اس غلو کا تدارک بھی ایک بڑا بھاری فرض ہے''۔ (ایضا: ص:۳۰۶)

ترک تقلید کے نقصانات بتاتے ہوئے مولانا محمد حسین بٹالوی شہادت دیتے ہیں کہ پچیس برس کے تجربے سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ بالآخر اسلام ہی کو سلام کر بیٹھتے ہیں، ان میں سے بعض عیسائی ہو جاتے ہیں، بعض لا مذہب ہو جاتے ہیں جو کسی دین و مذہب کے پابند نہیں رہتے، اور احکام شریعت میں فسق وخروج تو آزادی کا ایک ادنی کرشمہ ہے۔ (اشاعۃ السنہ)

مولوی محبوب علی خاں فرماتے ہیں: جہاں تک مجھے علم ہے وہ یہ ہے کہ امرتسر کے گردونواح میں جس قدر مرتد عیسائی ہیں یہ پہلے غیر مقلد ہی تھے۔ (الکتاب المجید: ص:۸)

قاضی عبدالاحد صاحب فرماتے ہیں: ''اس زمانے کے جھوٹے اہل حدیث مبتدعین، مخالفینِ سلف صالحین۔ جو حقیقت میں ما جاء به الرسول سے جاہل ہیں۔ شیعہ اور روافض کے خلیفہ اور وارث ہوئے، جس طرح پہلے زمانوں میں شیعہ کفر ونفاق کے باب تھے اور ملاحدہ اور زنادقہ کا مدخل تھے اسی طرح یہ جاہل بدعتی اہل حدیث اس زمانے میں ملاحدہ اور زنادقہ کا مدخل ہیں۔

وارثان علوم نبوت ! اجلاس میں زیر بحث آنے والے موضوعات پر اختصار کے ساتھ چند معروضات پیش کرنے کا مقصد سلسلۂ گفتگو کا آغاز اور مسئلے کو قدرِ روشنی میں لے آنا ہے، اب آپ حضرات عالمانہ بصیرت کے ساتھ گفتگو آگے بڑھائیں اور مقاصد کو تقویت دینے کیلئے خاکے مرتب کریں، تجاویز پیش کریں اور لائحۂ عمل ترتیب دیں، اللہ ہم سب کو اپنے فضل وکرم سے بہتر سے بہتر کام کی توفیق دے، مشکلات کو دور فرمائے اور ہماری جدوجہد کو مؤثر بنائے۔ آمین..

میں آخر میں پھر صمیم قلب سے آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور واجبات کی ادائیگی میں ہونے والی تقصیرات پر چشم پوشی اور عفوودرگذر کا خواست گار ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.

نصاب تعلیم

دار العلوم مرکز اسلامی انکلیشر کی طرف سے ۲۰۰۷ء میں ''مجلس مشاورت برائے تسہیل نصاب'' منعقد ہوئی تھی، اس موقع پر مدارس گجرات کے مہتممین و ناظم تعلیمات حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ تقاضۂ وقت کے مطابق نصاب میں تبدیلی کب، کیسے اور کیوں کی جائے؟ ان کا حل تحریری شکل میں پیش فرمائیں، اس مناسبت سے یہ مقالہ تحریر کیا گیا تھا، بعدہ حضرت مولانا عتیق الرحمان سنبھلی صاحب اور حضرت مولانا یحییٰ نعمانی صاحب سے دار العلوم ماٹلی والا میں اسی موضوع پر تبادلۂ خیالات کا موقع ملا تو ان کی طرف سے یہ مقالہ ماہنامہ ''الفرقان'' میں پیش کرنے کی دعوت دی گئی، لہذا مذکور ماہنامہ میں بھی یہ مقالہ شائع کیا گیا۔

نصاب تعلیم

بخدمت گرامی قدر جناب حضرت مولانا یحییٰ نعمانی صاحب ۔۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

احوال لائق صد شکر ہیں۔آپ بھی خیروعافیت سے ہی ہوں گے،ان شاءاللہ

ماہ نامہ الفرقان کے جولائی کے شمارے میں حضرت مولانا نورالحسن راشد صاحب کا مضمون پڑھا،اس سے پہلے شمارے میں حضرت مولانا مرغوب صاحب دامت برکاتہم کا خطبۂ استقبالیہ بھی پڑھا تھا۔

رمضان المبارک کے بعد گجرات میں بھی ''مجلس مشاورت برائے تسہیل نصاب'' کا انعقاد ہوا تھا، جس میں مہمان خصوصی حضرت مولانا مفتی سعیداحمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم اور صدر جلسہ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی صاحب دامت برکاتہم تھے، بندہ نے اس وقت نصاب تعلیم کے سلسلے کی سفارشات پیش کی تھی،آپ محترم اور حضرت مولانا عتیق الرحمان صاحب کے دورۂ گجرات (ماٹلی والا) کے موقع پر اس کا تذکرہ ہوا تھا،تو حضرت مولانا عتیق الرحمان صاحب نے ارشادفرمایا تھا کہ آپ کا مضمون بھیج دیجئے،تعلیمی وانتظامی مشغولی کے پیش نظر اس وقت نہ بھیج سکا۔

اب پھر۱۲/ جولائی کو گجرات کے مدارس کا اجتماع منعقد ہونے جارہاہے،اور

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم تشریف لارہے ہیں ،تو اس مناسبت سے اور مولانا راشد صاحب کے مضمون کی ابتداء میں آپ محترم کا یہ ارشاد کہ ''ادارہ اہل بصیرت کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دیتا ہے'' بندہ یہ مضمون پیش کررہا ہے، یہ چند طالب علمانہ معروضات ہیں جو درس وتدریس اور انتظامی امور کی مشغولیت کے دوران ذہن میں آتی رہی (بندہ اہل بصیرت میں سے تو نہیں ہے) گر قبول افتد زہے عزوشرف..

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين .

اعوذ بالله من الشيطن الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فى الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون.

محترم سامعین کرام، تفقہ فی الدین کے لئے عربی بولنے لکھنے کی نہیں بلکہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔اور لینذروا سے قوم کی زبان،عقائد، روایات اور استعداد سے واقف ہونا ضروری ہے۔

(۱) نصاب تعلیم کا مسئلہ محض نظری نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہماری رواں دواں عملی زندگی سے ہے۔

(۲) نصاب تعلیم پر غور کرتے وقت ہمیں ہندوستان کے حالات وضرورت کا

جائزہ لینا ہے، ہمارا مسئلہ آزاد اسلامی ملکوں جیسا نہیں ہے، اس میں مقصد اور ضرورت دیکھنا ہے کہ پڑھنے والے کی عملی زندگی کے مستقبل کا میدان کیا ہوگا۔

(۳) آزادی کے بعد ہمارا بڑا مسئلہ دین اور علم دین کا تحفظ رہا ہے، ہمیں ہندوستان میں ہر سطح کی ضرورت کے آدمی ان درس گاہوں سے ملنے چاہیئے، مدرّس، مفتی، محدث اور فنون پڑھانے والے، عربی اردو میں تقریر وتحریر کی صلاحیت والے خطباء، صحافی، امام ومؤذن اور مکتب کی چٹائی پر بیٹھ کر پڑھانے والے کی بھی ضرورت ہے۔

ان ضرورتوں کیلئے ہمیں درس نظامی کے مطابق چلنے والے مدارس ہی زیادہ کامیاب نظر آئے۔ملت کی زیادہ تر ضرورت (انہی مدارس کی بہت سی خرابیوں کے باوجود) ابتک پوری ہورہی ہے۔

(۴) قدیم وجدید دونوں کے حاملین پیدا کرنے کی کوشش اب تک ناکام ثابت ہوئی ہیں، حضرت مولانا یوسف صاحب بنوریؒ نے اس کی بہت ساری مثالیں پیش کی ہے، اور حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندویؒ نے بھی اس قسم کی کوششوں کو سطحی فرما کر لکھا ہے کہ اس سے دینی علوم کی ٹھوس صلاحیت پیدا کرنے سے طلبہ کی توجہ قدرے ہٹ جاتی ہے۔

(۵) فن میں کمال پیدا کرنے والی کتابیں رکھنی چاہیئے۔

(٦) تربیت یافتہ مدرس رکھنے چاہیئے، معلمین کی تدریب وتربیت ہونی چاہیئے۔

(۷) کثرت مضامین سے پرہیز کیا جاوے۔

(۸) افسوس یہ ہے کہ ہمارے مدارس کے علماء کرام انہی کتابوں کا درس پسند

کرتے ہیں جن کی اردو شروحات موجود ہوتی ہیں۔اور اس میں بھی وہی مباحث زیر درس ہوں گے جو شروحات میں ہیں،اس فن کی امہات کتب کو بھول سے بھی ہاتھ نہیں لگائیں گے، انہیں اس فن کی اہم کتب یا جدید عربی شروحات کا پتہ بھی نہیں چلتا یا اس سے دل چسپی ہی نہیں ہوتی، رسما کتاب پڑھا دی، فن سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔

(۹) علامہ یوسف قرضاوی صاحب فرماتے ہیں کہ مدارس اور جامعات میں آپ بہتر نصاب تو ضرور پائیں گے لیکن اچھا استاذ آپ کو نہیں ملے گا، اگر کوئی علمی نقطۂ نظر سے بہتر بھی ہو، تاہم ایمانی قوت و رہنمائی کے لحاظ سے مردہ دل ہوگا، یہاں قطر میں ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ ہم نے اسلامی علوم میں موضوع کے لحاظ سے بڑی عمدہ کتابیں لکھی؛ تاہم ان کتابوں کو ایسا استاذ میسر نہیں آیا جو انہیں تر وتازگی کے ساتھ زندہ جاوید طلبہ تک منتقل کر سکے بلکہ زندہ موضوع کو مردہ بنادیا اور ان کے اپنے جمود سے نصاب کی حرارت کو بھی خاکستر کر دیا۔

(دینی مدارس:ص:۱۱۲)

(۱۰) نصاب پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اصل طریقۂ تعلیم بدل گیا ہے، قدیم زمانہ کے حضرات اساتذہ ایجاز واختصار کے ساتھ نفس مطلب عبارت پر منطبق کر کے ذہن نشین کر دیتے تھے، لمبی لمبی تقریروں سے استعداد خراب ہوتی ہے۔ (دینی مدارس:ص:۱۱۱)

نصاب کی تبدیلی کے ساتھ جب تک طلبہ، اساتذہ اور منتظمین میں اپنے مقصد کی ڈھن نہیں ہوگی یہ تبدیلی کوئی مسئلہ حل نہیں کرے گی ،سادگی اور دین کا کام کرنے کی طلب کی وجہ سے ہی ہمارے بزرگوں نے چھوٹے چھوٹے دیہات میں قلت وسائل کے باوجود

زندگیاں وقف کردی، وہ چیز اب مفقود نظر آتی ہے بلکہ ہر سال فارغین کی اتنی کثیر مقدار کے باوجود مکاتب کو ائمہ اور صدر مدرس نہیں مل رہے ہیں، لہذا نصاب کے ساتھ ہم اپنے کو بھی بدلنے کی کوشش کریں، اگر ہمارے اندر اسوۂ نبوی ﷺ اور اصحاب صفہؓ کی زندگی کا ہلکا سا اثر بھی آجائے تو مدرسوں کی دنیا بدل جائے، مطالعہ وتحقیق کا ذوق پیدا ہو، خدمت دین کا جذبہ ہو۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد اصل مقصود یعنی نصاب تعلیم کے سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

﴿ ۱ ﴾ اردو فارسی کے نصاب کی سفارشات:

(۱) اردو کے پیچھے محنت کی جائے، مکاتب سے بچے کچے آتے ہیں، اردو کو لازمی قرار دیا جائے، اردو املاء اور تحریر کی طرف بھی توجہ دی جائے۔

(۲) فارسی اول-دوم میں مسائل کی آسان کتابیں تعلیم الاسلام، بہشتی ثمر، بہشتی زیور وغیرہ بھی رکھی جاوے تاکہ طلبۂ عزیز کی نماز وغیرہ صحیح ہو، خاص کر کے تراویح کے موقع پر اس کی ضرورت ہوتی ہے یا جبکہ طالب علم فارسی پڑھکر تعلیم منقطع کردے۔ اسی طرح بنیادی عقائد اور سیرت وغیرہ کے مضامین بھی آجائیں۔

(۳) اردو اچھی طرح پڑھے بغیر حفظ کے فورا بعد عربی اول کا درجہ نہ دیا جائے۔

(۴) فارسی قواعد میں حضرت مولانا مفتی سعید صاحب دامت برکاتہم کی آسان قواعد فارسی اول-دوم رکھی جائے۔

(۵) گلستاں، بوستاں کے اخلاقیات والے چند ابواب پڑھائے جائیں، اس

میں تکرار کے بجائے تدارک کا لحاظ کیا جائے۔

(۶) فارسی اول دوم میں فارسی کتابوں کا نصاب کم کر کے اردو اور عربی کی آسان کتابیں رکھی جائیں، جناب افضل حسین صاحب کی کتاب اردو زبان کی تعلیم، اسلام کیا ہے؟ اور حیات المسلمین، اردو زبان کی پہلی، دوسری، تیسری ڈابھیل کی مطبوعہ کتابیں زیادہ مناسب ہے۔

﴿۲﴾عربی نصاب کی سفارشات :

نحو وصرف اور ادب وانشاء:

(۱) ہر فن کی ابتدائی کتاب اردو زبان میں ہو تا کہ بیک وقت حل زبان، حل عبارت اور حل موضوع کا بوجھ سر پر نہ پڑے۔

(۲) عربی کی ابتدائی کتابوں کی زبان فارسی کے بجائے اردو ہو، اس کے بعد عربی میں ہو۔

(۳) عربی نحو کی کتابوں کے انتخاب میں ان کتابوں کو ترجیح دی جاوے جن میں قواعد آسان انداز میں ہوں اور مثالیں زیادہ ہوں، دنیا کی تمام زبانوں کے قواعد (صرف و نحو) مشق اور مثالوں سے پڑھائے جاتے ہیں، تحریر وتقریر کی مشق، عربی میں ترجمانی اور اظہار مافی الضمیر میں جو چیز مفید ہے اس کا لحاظ کیا جاوے۔ نحو قاسمی، آسان نحو، تسہیل النحو، تدریب النحو، مذکرات فی النحو والصرف، تمرین النحو، معجم القواعد العربیہ، النحو الواضح ابتدائی، قرآن کریم کی مثالیں بھی دی جاوے، اس کے لئے مفتاح القرآن، محفوظات اور ارشاد الطالبین، النحو القرآنی وغیرہ کتب معاون ثابت ہوں گی۔

(۴) ابتدائی کتب پڑھانے والے اساتذہ کا ذی استعداد ہونا۔

(۵) نحو وصرف اور ادب کی ابتدائی کتب میں لسانیات کو ترجیح دی جاوے اور علوم وفنون کو ثانوی درجہ دیا جائے۔

(٦) عربی زبان وادب کی تدریس میں عرب ممالک کے ماہرین تعلیم کی جدید تیار کردہ کتابوں سے مدد لی جائے۔

(۷) انشاء کی مشق کاپی میں لکھوانے کے بجائے درسگاہ میں ہی تختۂ سیاہ پر لکھوائی جائے یا زبانی یاد کروائی جاوے، اس میں سبق کم ہوگا لیکن مقصد حاصل ہوگا، ورنہ طلبہ دوسرے کی کاپی سے نقل کریں گے۔

(۸) سوال وجواب، تمرینات اور محاورے کے انداز کی کتابوں کو ادب وانشاء میں ترجیح دی جاوے۔

(۹) انشاء اور تمرینات کی کتابیں زمانے کے ذوق اور اسلوب کے مطابق ہوں، تا کہ عرب ممالک کی زبان، محاورات اور اسلوب وطرز تکلم وتحریر سے ربط باقی رہے، خلا پیدا نہ ہو۔

(۱۰) بقول حضرت مولانا رابع صاحب دامت برکاتہم ''ادب کی درس وتدریس میں کوئی جچے تلے طریقہ کی پابندی کرنا مشکل ہے، اس میں اصل پڑھانے والے کی کڑھن اور فکر کو بڑا دخل ہے''۔

(۱۱) طلبۂ عزیز کو عربی کے بہترین اسلوب والے اصلاحی وادبی مجلّات اور رسائل حل کروانے کی مشق بھی کروائی جائے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ فرماتے ہیں کہ

بقول امیر شکیب ارسلان کے عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا وہ عصر حاضر کا ادیب وصحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے، بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ، تعبیر اور اظہار خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی ادب و زبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔

بلاغت ومعانی:

علم بیان میں دروس البلاغۃ کو تلخیص کے بجائے رکھا جائے، مختصر المعانی سے عملی فائدہ کم ہوتا ہے، اس کے بجائے اسرار البلاغۃ علم بیان میں اور دلائل الاعجاز علم معانی میں جو مختصر المعانی سے بھی قدیم کتابیں ہیں، ان میں فن بلاغت مستقلا مدوّن کیا گیا ہے اور قواعد کلیہ بیان کئے ہیں، یہ پڑھائی جائیں، بطور مشق کے البلاغة الواضحة اور المنهاج الواضح للبلاغة اور اردو میں تسهيل البلاغة بھی مفید ہے، ابن قیمؒ کی المشوق الى علوم القرآن اور علامہ باقلانی کی اعجاز القرآن بھی بہت اچھی کتابیں ہیں، جن میں قرآنی آیات کو بطور مثالوں کے پیش کیا گیا ہے۔

منطق:

منطق میں آسان منطق، مرقات اور شرح تہذیب کافی ہے، اس میں بھی طلبہ کو کتاب کی مثالوں کے علاوہ خارجی مثالوں سے فن کو زندہ رواں دواں شکل میں رائج بتایا جاوے۔

حکمت:

قدیم فلسفہ میں معین الفلسفہ اور ھدایت الحکمت کافی ہے، اس کے ساتھ فلکیات

جدیدہ فہم الفلکیات، علم جدید کا چیلنج، عقلیات اسلام، مذہب اور سائنس اور جنرل نالج کے عنوان سے چھپی ہوئی کتابیں مفید ہوگی۔

عقائد:

عقائد میں عقیدۃ الطحاوی، شرح عقائد کے علاوہ دار العلوم دیوبند سے چھپے ہوئے محاضرات جس میں یہودیت، عیسائیت، ہندوازم، قادیانیت، شیعیت، رضاخانیت، مودودیت اور غیر مقلدیت کا تعارف کرایا گیا ہے وہ بھی بہت مفید ہے، اسی طرح عرب ممالک سے الادیان والفرق اور الغزو الفکری کے عنوان پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور الانتباھات المفیدۃ اور عقلیات اسلام کے نام سے اس کی تشریح کی گئی ہے وہ بھی مفید ہوگی۔ مولانا یوسف خان جامعہ اشرفیہ لاہور کی کتاب تقابل ادیان جو دہلی سے شائع ہوئی ہے اس میں اسلام کے علاوہ تیرہ ۱۳/ مذاہب کا تقابل مطالعہ جدید اسلوب میں کیا گیا ہے۔

حضرات اساتذہ کرام کو جدید مغربی فلسفہ، معاشیات، سیاسیات، اصول قانون وغیرہ سے خود بھی واقفیت رکھنی چاہیے اور طلبہ کو بھی اس سلسلہ کے مضامین پڑھاتے وقت جدید نظریات، ان کے اسلام مخالف ہونے کی صورت میں ان کی تردید، کمزوری، نقصانات وغیرہ بتا کر اسلام کی ہمہ گیری و ہمہ جہتی فوقیت، احکام اسلام کی پختگی وغیرہ سے طلبہ کے ایمان اور علم میں رسوخ پیدا کیا جاوے۔

اب اردو عربی میں بہت سی کتابیں ان مضامین کی آچکی ہیں، جن میں مغربی مفکرین، مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات وغیرہ مذکور ہیں، مدارس کے کتب خانہ نیز طلبہ کے دار المطالعہ میں یہ کتابیں رکھی جائیں۔

فقہ:

فقہ کی کتابوں میں نورالایضاح ،قدوری اور ھدایہ میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے،علم الفرائض میں مواریث کے عنوان سے شائع ہونے والی کتابوں کے انداز اور مثالوں کوبھی دیکھنا چاہئے ،فقہ کی کتابوں کے نصاب کوترتیب دینے کی بہت ضرورت ہے، ہر کتاب کتاب الطہارت سے شروع ہوتی ہے اور ابتدائی کتابوں میں بھی وہ اختلافات بیان کئے جاتے ہیں جو ھدایہ وغیرہ میں پڑھانے ہوتے ہیں، تکرار سے بچ کر تمام مباحث کے احاطہ کی کوشش کرنی چاہئے ،غیر ضروری مباحث سے پرہیز کیا جاوے ،اس میں مقدار خواندگی کی تکمیل نہیں ہوتی ہے ،حضرت نانوتویؒ کی خصوصی وصیات میں مقدار خواندگی کی تکمیل پر خاص توجہ دی گئی اور حضرت نے تکمیل پر ظاہری ومعنوی برکات کی اطلاع دی ہے۔

عربی دوم میں نورالایضاح کے بعد قدوری کے ابواب النکاح والطلاق پڑھائے جاوے؛ تاکہ عربی سوم میں اصول الشاشی میں خاص وعام کی بحث کی تفریعات ومثالیں آسانی سے سمجھ میں آسکے۔

قدوری میں باب البیوع سے لیکر اخیر تک کے تمام مضامین نفس مسئلہ بیان کرتے ہوئے طلبہ کو پڑھائے جاوے۔ اور مشق کے لئے حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ کی کتاب التسهيل الضروری لحل مسائل القدوری رکھی جاوے جس میں عربی میں ہی سوال وجواب بہت اچھے انداز میں پیش کئے ہیں۔

ھدایہ کا حق کما حقہ ادا نہیں ہوتا ہے،لہذا عربی چہارم میں شرح وقایہ پڑھانے

کے بجائے ھدایہ کو ہی ٦ حصوں میں تقسیم کیا جاوے اور دو حصے عربی چہارم میں، دو عربی پنجم میں اور دو عربی ششم میں رکھے جاوے۔ یہ کتاب کسی ایسے مفتی کو ہی پڑھانے کے لئے دی جاوے جن کو افتاء کی اچھی مشق ہو۔ساتھ میں ان کو مکلّف کیا جاوے کہ نصاب کا اختصار اس لئے کیا گیا ہے کہ آپ کتاب کا حق صحیح ادا کرتے ہوئے طلبہ عزیز کو جدید مسائل سے واقف کرائیں۔اس کے لئے جواہر الفقہ ،فقہی مقالات اور فقہ اکیڈمیوں کے تمام مجلّات وفیصلے اور ھیئۃ کبار العلماء (سعودی عربیہ) کے فیصلے اور دیگر کتب فتاوی کی مراجعت کرتے ہوئے ھدایہ کے ابواب کے متعلق جدید مسائل سے طلبۂ عزیز کو واقف کریں۔حوالے اور امہات الکتب نیز جدید فقہ واصول فقہ سے بھی طلبہ کو روشناس کرائیں۔

عبادات کے مسائل کے علاوہ معاملات ،معاشرات ،معیشت ،بینکنگ ،وقف ، حظر واباحت وغیرہ مسائل جن کی کثرت سے ضرورت پڑتی ہے وہ ابواب پڑھائے ہی نہیں جاتے ہیں یا سرسری طور پر ان سے گزر جاتے ہیں، جبکہ دار الافتاء میں اور روزمرہ کی ضرورت میں مفتی حضرات کو ان سے ہی زیادہ سابقہ پڑتا ہے،اسی طرح ھدایہ اول سے پہلے رسم المفتی کو درس میں رکھا جاوے تاکہ طالب علم حنفی مذہب کے طبقات کتب اور فتوی کے مدارج کو بھی سمجھ سکے۔ھدایہ کے درس میں جدید فقہی مباحث پر بھی گفتگو ہو،جس باب کے مناسب جدید مسائل ہوں ان کو وہاں ذکر کیا جاوے، اس کے لئے جواہر الفقہ ،فقہی مقالات اور مختلف فقہی اکیڈمیوں کے فیصلے اساتذہ کے پیش نظر ہوں۔

اصول فقہ:

اصول فقہ میں اصول شاشی سے پہلے آسان اصول فقہ یا تسہیل اصول الفقہ

پڑھائی جاوے اور بعد میں اصول شاشی، نورالانوار اور حسامی رکھی جاوے۔ اصول فقہ میں ان کتابوں کے علاوہ قیاس، استحسان، اجتہاد، مصالح مرسلہ، عرف وعادات، استصلاح، استصحاب، سدذرائع، تقلید، تلفیق وغیرہ موضوعات کو شامل کرنے کی ضرورت ہے؛ جو فقہ کی تشکیل جدید اور نئے مسائل کے حل کیلئے بنیاد اور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے لئے حضرت مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب کی الموجز اور شیخ ابوزہرہ، شیخ خلاف اور شیخ خضری بکؒ کی اصول فقہ اور دیگر بہت سے رسائل مستقل عناوین کے ساتھ عرب ممالک سے شائع ہوئے ہیں۔

فقہ میں اختلافیات کی کتابیں:

اصول المسائل الخلافية، تأسيس النظر (ابوزید دبوسی کی) رفع الملام عن الائمة الاعلام، علامہ ابن تیمیہ کی یا حضرت شیخ زکریاؒ کی اختلاف ائمہ ہفتہ میں ایک دن مناسب ہوگی۔

اصول فقہ میں حضرت مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب کی الموجز عربی سوم میں اصول الشاشی کی جگہ بہت مناسب ہے، اس میں آسان انداز اور صحیح اسلوب سے اصول فقہ کو ترتیب دیا گیا ہے گویا کتب احناف کا خلاصہ ذکر کیا ہے، تب ہی تو محدث وقت فقیہ زماں وکیل احناف حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: فقد نظرت فی کتاب ”الموجز فی أصول الفقه“ تأليف الأخ الفاضل العالم الثَّبُت المتقن فضيلة الشيخ مولانا محمد عبيد الله الأسعدی، أحد نابغی إخواننا علماء الديار الهندية، زان الله بهم البلاد، وهدی بهم العباد، فوجدته مختصرًا نافعاً، وميسَّرًا

جـامعًـا ، قد استَخلَص من كتب أصول الحنفية لُبابها ، وقرَّبه إلى المستـفيدين بـأوجـز عبـارة وأوضحها ، مع التوثيق لكل نص و التحقيق لكل بحث ومسألة ، بما يفى بالمرام ويتسع له المقام .

فـحـمِـدتُ لـه هـذا الـجهد العلمى المشكور ، وهذا السعى المبرور، والـلـه المسئول أن ينـفع به وبآثاره ، ويتـقبل منه صالح القول والعمل ، ويقيم به الدين ، وينفع به المسلمين. (الموجز فى اصل الفقه مقدمة الشيخ عبد الفتاح أبوغدة)

عربی چہارم وپنجم میں نور الانوار اور حسامی کے بجائے اصول بزدوی یا اصول سرخسی (جو دارالکتب العلمیہ بیروت سے تخریج احادیث وتعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی ہے) رکھی جاوے تو نہایت ہی مناسب ہے، کیوں کہ اس میں بہترین اسلوب میں کتاب وسنت کے دلائل کے ساتھ اصول فقہ کو واضح کیا گیا ہے اور شمس الائمہ سرخسی نے اپنی کتاب المحرر فی اصول الفقہ کو مبسوط (جو پندرہ جلدوں میں ہے اس کے تحریر کرنے) کے بعد لکھی ہے، چنانچہ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں "فـذلك الـذى دعــانـى إلـى إملاء شـرح فـى الـكتـب التى صنـفها محمد بن الحسن رحمه الله ، بآكد إشارة وأسهل عبارة .

ولـمـا انتهـى المقصود من ذلك رأيت من الصواب أن أبين للمقتبسين أصول ما بـنـيـت عـليها شرح الكتب، ليكون الوقوف على الأصول معيناً لهم على فهم ما هـو الـحـقـيـقة فـى الـفـروع، ومـرشـداً لهـم إلـى مـا وقع الإخلال بـه فى بيـان الفروع". (المحرر فى أصول الفقه:ص:٥)

اسی طرح فقہ اور افتاء میں جزئیات کے ساتھ ساتھ قواعد شرعیہ اور مقاصد شریعت

کی بھی کتابیں رکھی جاوے، ہر عالم تو مفتی نہیں ہوگا لیکن وہ کچھ قواعد شرعیہ ومقاصد شریعت سے واقف ہوگا تو اس کی روشنی میں قانون واحکام شرعیہ پر ہونے والے اعتراضات کا تشفی بخش جواب دے سکتا ہے۔

قواعد کے لئے شرح القواعد الفقہیہ ،قواعد الفقہ ،اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ اور شیخ مصطفیٰ زرقاءؒ کی المدخل الفقهی العام اور مقاصد شریعت کے لئے المقاصد العامہ، نظرية المقاصد عند الامام الشاطبی وعند الامام ابن عاشور اور مقاصد شریعت وغیرہ کتابیں ہیں۔اور اسرار شریعت کے لئے حضرت مولانا مفتی سعید صاحب دامت برکاتہم کی کتاب رحمۃ اللہ الواسعۃ کا پہلا حصہ خاص مفید ہوگا۔

افتاء :

افتاء میں اسلام اور جدید معیشت ،اسلامی معاشیات (مولانا سید مناظر حسن گیلانی)،اسلام کا اقتصادی نظام (مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی) اور بینکنگ کے نظام وغیرہ کی بینادی معلوماتی کتابیں پڑھانی چاہیے ،ہندوستانی قانون سے بھی افتاء کے طلبہ کو واقف کرایا جاوے اوراس کے کچھ اسباق پڑھائے جاوے۔اسی طرح افتاء میں شیخ ابوزہرہ مصریؒ کی اصول الفقہ یا الشیخ مصطفیٰ الزرقاء کی المدخل الفقهی العام کے منتخبات اور اگر دوسالہ نصاب ہوتو اصول قانون میں مصادر الحق کے منتخبات (جو یورپی اور اسلامی اصول قانون کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں اصول سے طلبہ کو واقف کراتی ہے)اس کو بھی داخل نصاب کیا جاوے۔معاشیات کے لئے حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی اسلام اور جدید معیشت وتجارت اور علی گڑھ سے معاشیات ،سیاست اور اصول قانون وغیرہ موضوعات پر لکھی ہوئی اردو کی کتابیں بھی بہت مفید ہوگی۔افتاء کے طلبہ واساتذہ اس کو مطالعہ میں رکھیں تو

بہت فائدہ ہوگا اور جدید مسائل کی تفہیم میں بہت معین ثابت ہوں گے۔

حدیث:

حدیث کی کتابوں میں تبدیلی کا سوال ہی نہیں ہے، لیکن ان کے ابواب کی ترتیب قائم کرنا ضروری ہے؛ تاکہ طالب علم کو تمام اہم ابواب کی روایات کا علم ہو، دورۂ حدیث کی کتابوں کے ابواب کی تقسیم کی باتیں کئی سالوں سے چل رہی ہے لیکن اس پر اب تک عمل نہیں ہوا ہے، اکابرین سے گزارش ہے کہ وہ کتاب کے انداز کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان کی تقسیم فرمائیں تاکہ ہر استاذ اتنے حصے کو درایۃً پڑھاوے، باقی حصہ روایۃً ہو؛ تاکہ کتاب بھی مکمل ہو اور طلبہ تکرار مباحث سے اکتا نہ جاوے۔ احادیث میں فقہی مباحث کی رفتار کم کر کے اخلاقیات، عقائد، معاملات، معاشرت اور رقاق کے مباحث کی طرف توجہ دی جائے۔ حدیث شریف کے طریقۂ درس کے سلسلہ میں اعتدال سے کام لیا جاوے، فقہیات کی مقدار اور طریقۂ استدلال کے متعلق بھی سوچا جاوے۔

مہاجر مدنی حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ نے اس سلسلہ میں جو بصیرت افروز کلام ترجمان السنۃ کے مقدمہ میں لکھا ہے وہ ہم لوگوں کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے حضرت فرماتے ہیں ''بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک طبقہ جو فقہاء و محدثین کے ساتھ مرتبط تھا اپنے ضیق ماحول، قصور فہم اور کوتاہیٔ نظر کی وجہ سے ان تصانیف میں وہی کچھ دیکھتا رہا جو اس کے آئینۂ قلب میں نظر آ رہا تھا، اس لئے جب عبادات کا باب شروع ہوتا اس میں بھی خصوصیت سے وہ حصہ جو مختلف فیہ مسائل سے متعلق ہے تو اس طبقے کے علوم و معارف اور تدقیق و تحقیق کے سمندر میں تلاطم برپا ہو جاتا، تقریروں میں طول، طبیعت میں روانی اور مزاج میں جولانی پیدا ہو جاتی لیکن جب ان ہی کتب میں اجتماعیات و اخلاقیات، سیاستِ مدنیہ اور تدبیر منزل وغیرہ

کے باب آتے تو اس بحرِ متلاطم میں یک قلم جمود طاری ہو جاتا، لبوں پر مہر سکوت لگ جاتی، زبان پر خاموشی کے قفل چڑھ جاتے اور طبیعت کا وہ تمام جوش وخروش ایسا ٹھنڈا پڑ جاتا گویا اس میں حرارت کا نام ونشان ہی نہیں تھا۔

ادھر مسلمانوں کا دوسرا طبقہ جو مذہب کو روزِ ازل ہی سے سامان دردسری یا زیادہ سے زیادہ ایک آئین تہذیب خیال کیے ہوئے تھا اس کو خود تو مطالعہ کی توفیق نہ ہوئی، ہماری اس غلط روش سے وہ ایک اور غلط فہمی میں مبتلاء ہو گیا یعنی ان کتابوں میں عبادات ورسوم یا چند مسائل کلامیہ وفقہیہ کے علاوہ اجتماعیات ومعاشیات کا کوئی باب ہی نہیں ہے اور ہے تو بہت سطحی بلکہ غیر ضروری اور ان چند در چند وجوہ کی بناء پر وہ اپنی معاشیات واقتصادیات کے لئے کوئی دوسری راہ تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ان کتب میں جو ابواب وتراجم ایک خاص فضا اور خاص ماحول میں اہم سمجھ لئے گئے تھے آج بھی ان کو اسی نظر سے دیکھے چلے جانا، وہی جہمیت کی تردید، معتزلہ وخوارج کے ساتھ وہی جھگڑے، صفات کے عین وغیر ہونے کے متعلق وہی فلسفیانہ کاوشیں، پھر قرآن کریم کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کی وہی قدیم بحثیں زیر تحقیق لائے چلے جانا اور ایک ایسی زمین پر مالکیت وشافعیت کے لئے صف آرائی کرنا جہاں نہ کوئی شافعی ہے نہ مالکی، علم وفکر کے ان مظاہروں کو ہرگز اقتضاء علم نہیں کہا جا سکتا، نہ تو اس کا نام احساس ضرورت ہے اور نہ اس کو صحیح معنی میں اتباع سلف کا نام دیا جا سکتا ہے، اتباع سلف یہ ہے کہ جس طرح امام بخاریؒ نے اپنے وقت کے فنون کے مقابلہ کے لئے کتاب الرد علی الجهمية، حجیت اخبار آحاد، صفات باری اور شئون باری پر مناسب مناسب عنوانات قائم کئے تھے، ان کے قدم بقدم چل کر ہم بھی وقتی مسائل کے لئے مناسب عنوانات قائم کریں، ہمیں اس میں ایک لمحہ کے لئے بھی شبہ نہیں ہے کہ اگر امام بخاریؒ اس

زمانے میں موجود ہوتے تو اپنی مجتہدانہ شان، دقّت رسی، دقیقہ سنجی اور امت کی ضرورتوں کے متعلق صحیح نبض شناسی اور دردمندی کی وجہ سے اپنے بابوں، ترجموں اور عنوانوں کا رخ جہمیت واعتزال کی تردید کے بجائے یقیناً ان ہی مسائل کی طرف پھیر دیتے جو ہمارے وقت کے الجھے ہوئے مسائل کہلاتے ہیں''۔ (ترجمان السنۃ: ص: ۱۰، ۱۱)

حدیث شریف کے درس میں رجال کی جرح وتعدیل، احادیث کی اقسام، ان کے احکام، علوم الحدیث، علل حدیث، قواعد الحدیث اور احادیث پر مستشرقین کی طرف سے ہونے والے اعتراضات کے جوابات، تاریخ حدیث ومحدثین کے مختلف ادوار اور حدیثی خدمات کا تنوع وغیرہ مباحث سے طلبہ کو واقف کرایا جاوے۔

اصول حدیث:

اصول حدیث کے سلسلہ میں عرب ممالک میں سب سے زیادہ کام ہوا ہے، اس سے فائدہ اٹھا کر نخبۃ الفکر کے علاوہ اور کوئی کتاب بھی رکھی جاوے تاکہ مصطلحات، تخریج حدیث، قواعد حدیث اور رجال کے سلسلہ کی بنیادی معلومات یا کم از کم ان کے مراجع کا بھی علم ہو سکے۔

اصول حدیث میں شیخ الطحان کی تیسیر مصطلح الحدیث اور مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب کی قواعد فی علوم الحدیث علمائے احناف پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جواب کے لئے بہت مفید ہے۔

تفسیر:

تفسیر میں جلالین کے علاوہ مختصر تفسیر ابن کثیر یا احناف کی تفاسیر میں سے مدارک التنزیل رکھی جاوے۔

اصول تفسیر میں صرف الفوز الکبیر کافی نہیں ہے ،قواعد التفسیر ،علوم القرآن اور دراسۃ القرآن کے عنوان سے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے، یا کم ازکم حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی علوم القرآن اور جزیرۃ العرب کے منتخبات یا خلاصہ ہی پڑھایا جاوے،تفسیر میں صرف جلالین کافی نہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں ترجمۂ کلام پاک کے گھنٹوں میں لغوی،نحوی،صرفی و بلاغتی تحقیقات کے بجائے صرف تفسیری کلام ہوتا ہے،جبکہ اس موضوع پر بھی مستقل کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن کی روشنی میں طلبۂ عزیز کو یہ فنی معلومات فراہم کی جاسکتی ہے، ہمارے ترجمہ وتفسیر کے اسباق میں کوئی فرق نہیں ہوتا اورعوامی درس قرآن کی مجلس کی طرح سادہ مضامین بیان کیۓ جاتے ہیں،اس کے بجائے ترجمہ کے اسباق میں فنی بحث اورصحیح ترجمہ وشان نزول بتادیا جاوے اورتفسیر میں سلف کے اقوال تفسیر ماثور سے نقل کئے جاوے،اورجدیداعتراضات کے جوابات دیئے جاوے یہ بہتر ہوگا،معقولات اورفنون آلیہ کوتو معقولات کی روشنی میں سمجھایا جاوے لیکن منقولات کوتو منقولات سے ہی سمجھانا مناسب ہوگا،اس میں منطقی وفلسفی انداز کی تفسیریں مناسب نہیں ہوگی۔

نصاب کے علاوہ خارج میں کچھ کتابیں اساتذہ کی نگرانی میں رکھی جاوے یا ابتدائی درجات میں ان کو رکھا جاوے، اس میں جغرافیہ کی مختصر کتابیں، ہندوستان اورمسلمان ہمسلم ممالک ،اور جزیرۃ العرب وغیرہ شامل ہیں۔اسی طرح سیرت وتاریخ کی کتابیں بھی خارج میں رکھی جاوے۔

انگلش کے گھنٹے میں ایک دودن جنرل نالج سرمایۂ معلومات (رفیق محترم

مولانا احمد ٹنکاروی صاحب کی کتاب بڑی جامع اور پر مغز ہے) کو رکھا جاوے ۔انگلش کا دارالعلوم ندوۃ العلماء والا کورس رکھا جاوے یا اقراء پبلی کیشنس شکاگو والا کورس جو ممبئی میں ملتا ہے وہ بہت شاندار اور مناسب ہے۔

ہمیں تاریخ ،جغرافیہ، معاشیات ،اصول قانون ،سیاست ،انگلش اور معلومات عامہ وغیرہ کی بنیادی کتابیں ہمارے طلبۂ عزیز کو پڑھانی ہیں ،لیکن اس کو ہمارے درس نظامی کے تابع رکھکر پڑھائی جاوے ،کسی بورڈ سے منسلک ہونا یا تعلیم کی وحدت کے عنوان سے ہمارے طلبۂ عزیز کو سرکاری بورڈ کے امتحانات میں شریک کرنا یہ مناسب نہیں ہے ،اس کو طلبۂ عزیز اپنی دینی ضرورت محسوس کریں ، دنیوی ترقی کا زینہ نہ قرار دیں۔

اس کے لئے دعوت وتبلیغ سے منسلک انگلش کے اساتذہ ہمیں میسر آسکتے ہیں ، جو یہ کام دینی ماحول میں حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں اور رفتہ رفتہ پھر حضرات اساتذۂ کرام کی جماعت بھی اس کام کو انجام دے سکتی ہے۔

محدث کبیر، حافظ بخاری

شیخ عبدالملک عباسی بمبانی رحمۃ اللہ علیہ

عالمی رابطۂ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر کی گجرات شاخ کی طرف سے ''دسویں صدی ہجری کے علمائے گجرات اور ان کی علمی وادبی خدمات'' کے موضوع پر سمینار منعقد ہوا تھا، اس مناسبت سے یہ مقالہ پیش کیا گیا تھا۔

محدث کبیر، حافظ بخاری شیخ عبدالملک عباسی بمبانی رحمۃ اللہ علیہ

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاة والسلام علی سید المرسلین، وعلی آله واصحابه اجمعین.

امابعد!

گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز، ارباب ہنر کا گہوارہ، ارشاد وتلقین کا سرچشمہ، اقتصادی زندگی کی شہ رگ، اردو ادبی شہ پارہ کی اول روایت گاہ، حرمین شریفین کے مصارف کے لئے وقف گاہ، علماء ومشائخ کی گذرگاہ، دینی ثقافتی زندگی کا مرکز ثقل، تہذیب وتمدن کی جلوہ گاہ، اسلام کے اولین قافلہ کی منزلِ اول اور عرب وہند کے درمیان تعلقات کیلئے سلسلة الذہب اور قنطرة الوصل تھا۔

دہلی کا مرکز حدیث گجرات کے بہت بعد میں منصۂ شہود پر آیا، فخر ہند، محدث کبیر حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ابھی عالم وجود میں نہیں آئے تھے کہ گجرات علم حدیث کا مرکز بن چکا تھا؛ بلکہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے گجرات سے وابستہ شیخ عبدالوہاب متقی اور شیخ عبداللہ بھروچی سے حدیث کا علم حاصل کیا اور شیخ محدث دہلویؒ پر گجرات کی علمی رونق واہمیت کا جو اثر تھا؛ اس کا اندازہ آپ کے اس شعر سے ہوسکتا ہے ؂

حقی کہ از گوشۂ دہلی نہ نہم پا بیروں　　　خود گر فتیم کہ ملک گجرات دادند

ہندوستان میں علم حدیث کے فروغ کا اصل زمانہ نویں صدی ہجری کے آخر یا

دسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے، جب مصر، شام اور حجاز میں امام حدیث حافظ محمد عبدالرحمٰن سخاویؒ (المتوفی ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۶ء) کے فضل وکمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور ان کے علمی فیض کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشے میں پڑ رہی تھیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ رقم طراز ہیں:

''ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سب سے پہلے گجرات نے اپنا طبعی حق پایا، یعنی بحر عرب کے اس پار کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں آکر پڑیں اور یہاں سے وہ آگرہ کی مسجدوں اور مدرسوں کے مناروں پر جاکر عکس انداز ہوئیں۔''

علامہ سخاویؒ (جو محدث جلیل، حافظ حدیث علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں) حافظ ابن حجر مکیؒ اور شیخ الاسلام زکریاؒ کے تلامذہ کافی تعداد میں یہاں بس گئے تھے، جنہوں نے علم حدیث کی ترویج واشاعت میں اپنی زندگیاں گذاردی، یہاں کی درس گاہیں اور خانقاہیں ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ بیرونِ ہند سے تشنگانِ علم ومعرفت کو کھینچتی تھیں، مولانا سید عبدالحی لکھنویؒ نے بہت صحیح لکھا ہے کہ علوم وفنون میں اگر گجرات شیراز تھا تو حدیث شریف کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا۔

صحیح بخاری کی دو شرحیں جو غالبا ہندوستان میں بخاری شریف کی سب سے قدیم شرحیں ہیں، یعنی علامہ بدرالدین محمد بن ابوبکر الدمامینی کی ''المصابیح الجامع'' جو آپ نے احمد شاہ بادشاہ کے نام معنون کی، اور دوسری شرح سید عبدالاول حسینی رحمۃ اللہ علیہ کی ''فیض الباری فی شرح بخاری'' اسی سرزمین پر لکھی گئی، ۸۵۱ھ کا گجراتی عالم کا لکھا ہوا بخاری شریف کا نسخہ بھی پٹن میں موجود تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث شریف (بخاری

شریف) کا درس نویں صدی ہجری میں بھی جاری تھا، فتح الباری شرح بخاری کا نسخہ ابوالقاسم مکی دسویں صدی میں گجرات لے کر داخل ہوتے ہیں ۹۷۴؁ھ میں امیر الغ خان کی موجودگی میں علامہ جمال الدین مہائمی کی قرأت سے بخاری شریف کا ختم ہوتا ہے، اور امیر کی طرف سے اختتام اجلاس پر پُر تکلف دعوت کا اہتمام ہوتا ہے، اسی صدی کا بخاری شریف کے ختم کا دوسرا واقعہ بھی ذکر کیا جاتا ہے، شیخ عبدالحق المعطی کی ایک کتاب حدیث کے اسماء الرجال پر اسی صدی میں لکھی گئی تھی، صحیح مسلم کا سب سے قدیم نسخہ سلطان محمود گجراتی کے کتب خانہ میں تھا، جس پر عبدالرحیم خاں کی مہر لگی ہوئی تھی، جس میں اس کتاب کے ۹۹۲؁ھ میں احمد آباد کے کتب خانہ میں آنے کی تاریخ درج ہے، اس کے حواشی پر اختلاف نسخ بھی پایا جاتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مصحح نے پانچ الگ الگ نسخوں سے اس متن کی تصحیح کی ہے، رامپور کے کتب خانہ میں یہ نسخہ محفوظ ہے، کتابت کی تاریخ جمادی الاخری ۷۸۷؁ھ/ ۱۳۸۵؁ء ہے، دو جگہ سلطان محمود بیگڑہ کی مہر بھی ہے، الفاظ کی تحقیق اور مطالب کی توضیح میں حافظ ابن حجر عسقلانی کی دو کتابیں 'التقریب' اور 'التقریب التھذیب' کے حوالے بھی ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ حواشی ۸۲۷؁ھ کے بعد لکھے گئے ہیں۔

حافظ سخاویؒ کے تلامذہ میں سب سے پہلے غالباً مولانا راجح بن داود گجراتی ہیں، ۸۹۴؁ھ/ ۱۴۸۹؁ء میں وہ حافظ موصوف کے حلقہ میں داخل ہوئے اور حدیث کی سند حاصل کی، اس کے بعد وہ گجرات وارد ہوئے، لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، ۹۰۴؁ھ/ ۹۹، ۱۴۹۸؁ء میں احمد آباد میں وفات پائی، اس کے بعد مولانا وجیہ الدین محمد مالکیؒ آئے، ان کی بڑی قدر ہوئی، سلطانِ گجرات نے ان کو 'ملک الحدیث' کا خطاب دیا، وہ یہیں کے ہو رہے، ۹۲۹؁ھ/

۱۵۲۳ء میں وفات پائی، ان ہی کے ہم عصر مولانا علاء الدین احمد نہروالیؒ ہیں، عرب جاکر حافظ ابن فہد اور نور الدین شیرازی سے حدیث کی سند حاصل کی، آخر عمر مکہ معظّمہ میں گذاری اور وہیں اپنا سلسلۂ درس جاری رکھا، ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء میں وفات پائی۔

علامہ قطب الدین بمبانیؒ نے بھی حرمین شریفین جاکر علامہ سخاویؒ سے حدیث شریف کا درس پڑھا اور وہاں سے علم حدیث کی تحصیل کرکے ہندوستان واپس آئے، انہیں سے ان کے بھائی شیخ عبدالملک نے حدیث شریف کا علم حاصل کیا۔

''بمبانی'' خاندان کی سیاسی، علمی اور روحانی خدمات:

گجرات کے بعض شہروں اور خاندانوں نے حدیث شریف کی جو خدمات اور کارنامے انجام دیئے ہیں؛ وہ لازوال اور جریدۂ عالم پر ثبت ہوگئے ہیں، ان میں خاندان عیدروس، سادات بخاری اور بمبانی خاندان بہت مشہور ہیں، ان علماء وفضلاء کی بدولت علم حدیث کی بڑی نشر واشاعت ہوئی اور اس کا فیض نہایت عام ہوا، ان میں بھی بمبانی خاندان کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے، اس میں متعدد علماء نے مسند درس کو بھی زینت بخشی اور ارشاد وہدایت کا چراغ بھی روشن کیا، قضا وافتاء کے منصب پر بھی فائز ہوئے، حکومت کا نظم ونسق سنبھالنے اور امور مملکت سرانجام دینے والے وزراء واعیان دولت بھی اس خاندان میں گزرے؛ جنھوں نے علوم وفنون کی سرپرستی کی، ادب وثقافت کی آب یاری کی، اہل علم وفن کی قدردانی کی، صوفیہ ومشائخ کے دامن سے وابستہ رہے اور بعض نے خود اپنے ذاتی فضل وکمال اور علم وادب میں امتیاز کے یادگار نقوش بھی چھوڑے۔

''معارف'' میں لکھا ہے کہ علم حدیث کی خدمت میں بعض خاندانوں نے نمایاں

حصہ لیا، ان میں سے گجرات کے ایک بمبانیوں کا خاندان ہے،اس خاندان نے بہت سے علماء پیدا کیے، جو آسمان علم کے درخشاں ستارے ثابت ہوئے اور افتاء وقضاء کے جلیل القدر مناصب پشتوں تک ان کے خاندان میں رہے،اور اس خاندان کے باکمال وزراء نے نہ صرف ملکی انتظام میں نام پیدا کیا؛ بلکہ علوم وفنون کی سرپرستی،علماء کی قدردانی،صلحاء واتقیاء سے عقیدت ونیاز مندی نیز اپنے ذاتی علمی کمالات کا نقش تاریخ کے صفحات میں چھوڑا۔
(مشائخ احمد آباد:ص:۱۱)

حضرت مولانا ابوالظفر ندویؒ فرماتے ہیں:

گجرات میں بمبانی ایک مشہور خاندان گزرا ہے،جس کے زیادہ تر افراد اہل علم اور مصنف ہوئے ہیں اور ان کی تصانیف گجرات کے تمام مدارس میں زیر درس رہی ہیں،اس خاندان کے گل سرسبد قاضی صدر الدین کے لڑکے ملک القضاۃ صدر جہاں حسام الدین بمبانی تھے، جو بڑے جید عالم اور فاضل تھے،ان کا ایک مدرسہ تھا، جو سلطان محمود اعظم کے عہد تک قائم تھا،اس خاندان کے لوگوں کی کتابیں زیادہ تر فن تفسیر،نحو،ادب،حدیث اور تصوف میں ہیں،اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں انہیں علوم کی تعلیم ہوتی تھی،معقولات سے اس خاندان کو کم دلچسپی تھی،اس خاندان میں مولانا فیض اللہ،مولانا زین العابدین، مولانا حسام الدین، قاضی صدر الدین اور مولانا منہاج الدین بن صدر الدین بڑے پایہ کے عالم اور مصنف گزرے ہیں، اس مدرسہ میں بڑے اچھے اچھے لوگ تعلیم پاتے تھے اور بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے ،صدر جہاں قاضی صدرالدین کا اصل وطن ’چانپانیر‘ تھا؛ لیکن بود وباش احمد آباد میں تھی،اور مدرسہ بھی یہیں تھا، میاں مخدوم جو حضرت شاہ عالم کے متوسلین میں تھے،اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے،صدر جہاں کی موت احمد آباد میں ہوئی، اور نورگنج

میں علم وفن کا خزانہ دفن کیا گیا۔

مولانا منہاج الدین بمبانی شیخ احمد کھٹو (المتوفی: ۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء) کے ہم عصر تھے، جو سلطان احمد شاہ کے عہد میں تھے۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ،ص:۲۰۱،۲۰۲)

اس خاندان کے شیخ صدرالدین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے گجرات تشریف لائے اور کئی کتابیں تصنیف کر کے شاہان گجرات کے نام معنون کی تھیں، ان کو خاص دلچسپی عربی ادب اور نحو وصرف سے تھی، نحو کی مشہور کتاب ''الوافی'' کی شرح ''الکافی'' انہی کی لکھی ہوئی ہے، جس کو ہندوستان میں ''الکافی'' کی پہلی شرح سمجھا جاتا ہے، شیخ صدرالدین نے قصیدۂ بردہ، قصیدۂ کعب بن زہیر اور قاضی عبدالمقتدر کے قصیدۂ لامیہ کے حواشی اور فن تفسیر میں ایک کتاب ''بحر المعانی'' بھی لکھی تھی، وہ آٹھویں صدی کے آخر یا نویں صدی کے ابتدائی زمانے میں بقید حیات تھے۔

غالباً شیخ منہاج الدین بمبانیؒ ان ہی کے فرزند تھے، جن کو علم حدیث، تصوف اور صرف ونحو سے زیادہ اشتغال تھا، گجرات میں علم حدیث کو مقبول بنانے میں آپ کا بڑا حصہ ہے، چند نحوی مسائل کے بارے میں ایک مصری عالم شیخ بدرالدین دمامینی سے احمد آباد میں ان کا مباحثہ ہوا، تو مصری عالم نے ان کے رد میں ''ألفتح الربانی فی الرد علی البمبانی'' لکھی، شیخ منہاج کثیر التصانیف (۸۰؍کتابوں کے مصنف) تھے، لیکن شروح حدیث میں صرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی شرحوں کے نام ملتے ہیں، مسلم شریف کی شرح اور شیخ ابن العربی کی ''فصوص الحکم'' کی اولین شرح لکھنے کا شرف بھی ہندوستان میں آپ کو ہی حاصل ہے۔

شیخ فیض اللہ بن زین العابدین بمبانی، سلطان محمود بیگڑہ (۸۶۳تا۹۱۷/ ۱۴۵۹ تا۱۵۱۱) کے خزانچی تھے، جس کے نام سے اپنی فن تفسیر کی کتاب دستور الحفاظ معنون کی تھی، شیخ کی تاریخ صدر جہاں اور مجمع النوادر بھی مشہور اور مفید کتابیں تھیں۔

شیخ عبدالملک بمبانی محدث بھی اسی خاندان کے ایک مایۂ ناز اور ممتاز شخص تھے۔

گجرات کی ایک اہم تاریخ جو کہ سلطان محمود بیگڑہ ہی کے دور میں مکمل ہوئی وہ مولانا فیض اللہ بمبانی کی ہی لکھی ہوئی تاریخ صدر جہاں ہے، اگر چہ یہ تالیف طبقات کی شکل میں مرتب کی گئی ہے؛ لیکن مؤلف کے عہدۂ صدر جہاں کی رعایت سے تاریخ صدر جہاں کے نام سے پہچانی جاتی ہے، مؤلف کے بیان کے مطابق ان کے اجداد سلطنت گجرات کے آغاز ہی سے سلطان کے دربار سے وابستہ رہے اور علوم اسلامی میں شغف رہا اور دسترس حاصل ہونے کی وجہ سے صدر جہاں اور قاضی القضاۃ کے عہدوں پر سرفراز رہے، مولانا فیض اللہ بمبانیؒ صدر جہاں تھے اور اپنے علمی تبحر اور شائستگی کی بناء پر ہندوستان کے دوسرے سلاطین کے درباروں میں سفیر کی حیثیت سے بھی بھیجے جاتے تھے۔

۱۵۰۱ء میں جب وہ صلح کے معاہدہ کی تکمیل کے لئے بیدر گئے تو وہاں آپ نے کئی ماہ کے قیام میں طبقات محمود شاہی یعنی تاریخ صدر جہاں کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا، اس تاریخ کی تکمیل کے پیچھے ان کا خاص مقصد اپنے ہم عصروں کو اسلامی ممالک کے بادشاہوں اور فضلاء کے متعلق علم بہم پہونچانا تھا، چوں کہ اس سے پہلے عبدالحسین تونی کی مآثر محمود شاہی اور عطاء اللہ کی ضمیمہ مآثر محمود شاہی میں گجرات کے سلاطین کی تاریخ تفصیل کے ساتھ شامل تھی، اور تفاصیل میں اضافہ کی بظاہر گنجائش نہیں تھی، لہذا فیض اللہ بمبانی نے اپنی تالیف کو چار

قسموں میں ترتیب دیا، ہر قسم میں متعدد مقالات ہیں، کتاب کا آغاز کائنات کے وجود میں آنے سے ہوتا ہے، پھر اسلامی ممالک کے سلاطین کے علاوہ ایک قسم مسلم علماء وفضلاء سے متعلق ہے، یہ پہلی تالیف ہے جس میں مصر کے مملوک سلاطین کا تذکرہ ۱۳۱۹ء تک ملتا ہے، اس سے پہلے ہندوستان کے کسی مؤرخ نے شمالی افریقہ کے مسلم ممالک کے متعلق تاریخی معلومات حاصل کرنے میں دل چسپی نہیں لی تھی، حالانکہ مصر سے تجارتی اور سفارتی تعلقات تھے، علاوہ بریں گجرات میں لکھی گئی تاریخوں میں یہ پہلی تاریخ ہے؛ جس میں ایک علاحدہ مقالہ سلاطین دہلی سے متعلق ہے؛ اگرچہ یہ مقالہ زیادہ تر یحییٰ سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی (مؤلفہ ۱۴۳۶ء) پر مبنی ہے، تاہم مؤلف نے بہت سی جگہوں پر اختصار کے ساتھ دوسرے ماخذ سے وہ تفاصیل لے کر شامل کی ہیں، جو کہ تاریخ مبارک شاہی میں موجود نہیں ہے، اس سے تاریخ صدر جہاں کی علاحدہ اپنی اہمیت ہوجاتی ہے۔

''بمبان'' لفظ کی تحقیق:

ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی سابق استاذ شعبۂ عربی اسماعیل کالج بمبئی نے ''جمعات شاہیہ'' جلد چہارم کے قلمی نسخے کے حوالے سے بمبانی کی اصل یہ بتائی ہے :

''بمبان ولایتے است مابین خراسان وملتان وایں جماعت کہ بہ ملک گجرات بہ بمبانیان مشہور اند، ازآں جا آمدہ اند وایشاں از حضرت عبداللہ بن عباس اند۔''

یعنی خراسان وملتان کے درمیان 'بمبان' ایک جگہ کا نام ہے اور یہ جماعت جو صوبہ گجرات میں بمبانیان کے نام سے مشہور ہے، وہیں سے یہاں آئی ہے اور اس کا نسلی تعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ہے۔

پروفیسر محبوب حسین عباسی صاحب کی تحقیق کے مطابق گجرات کے عہد وسطی کے عباسی خاندان کے علماء و وزراء کے وطن بمبان کے املاء، تلفظ اور جائے وقوع کے بارے میں مختلف روایتوں کا اظہار ہوتا رہا ہے، کتب خانہ درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہ، احمد آباد میں مخزون کتاب جواہر الاسرار انتخاب مفاتیح اسرار کے قلمی نسخے (نمبر: ۱۳۴۵) کے آخری صفحہ پر ترقیمہ کی عبارت کی دونوں جانب احمد آباد کے بخاری سادات کے سلسلہ کے حضرت جعفر بدر عالمؒ (متوفی: ۱۰۷۵/۱۶۷۵) کی ایک فارسی تحریر خود ان کے خط میں حسب ذیل پائی گئی ہے

''۱۶/ جمادی الثانیہ ۱۰۵۶ھ دروقت سفر .....درمقام بمبان مطالعہ آمد [دستخط] مملوک اہل بیت النبوی جعفر جلال الشاہی الرضوی۔

اس کے علاوہ گجرات کے ملک القضاۃ فیض اللہ بن زین العابدین بمبانی (متوفی: ۹۶۱/۱۵۵۴) کی تصنیف کردہ فارسی کتاب 'تاریخ صدر جہاں' (مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۸۸ء) کے ص: ۹/ پر دو جگہ اس مقام کو بمبان لکھا ہے، مصنف نے یہ اطلاع دی ہے کہ (۱) دہلی کے سلطان شمس الدین التمش ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۵ء میں 'عزم بمبان کرد' (۲) چوں سلطان شمس الدین در آخرین مہم جانب سند و بمبان رفت، سلطان رکن الدین فیروز شاہ (بن سلطان شمس الدین) اقطاع لاہور داشت، او را با خود بدہلی باز آورد، ان سب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ بمبان لاہور ہی کے اضلاع میں واقع ہوسکتا ہے، اور اس کا صحیح املاء و تلفظ بنبان یا بینبان ہے، جب کہ معجم البلدان: ۴۹۷ پر اس کو یمامہ کا حصہ لکھا ہے:

بَنُبان :بالفتح ، ثم السكون ، وباء اخرى ، قال الحفصي: بنبان منهل باليمامة من الدهناء به نخل لبني سعيد ، و انشد ـ

قدعلمت سعد باعلی بنبان — یوم الفریق ، والفتی رغمان

(معجم البلدان:ص:۴۹۷)

اورمولانا ابوالظفر ندوی صاحب بھی عبدالصمد بمبانی کے حالات میں اس کو یمامہ کا حصہ ہی لکھتے ہیں:

عبدالصمد بمبانی:

عبدالصمد نام ،افضل خاں خطاب ، والد کا نام محمود، محمود بیگڑہ کے عہد ۸۹۱ھ/ ۱۴۸۶ء میں پیدا ہوئے ،ان کا خاندان بمبان سے آیا تھا، جو یمامہ (عمان) کے پاس میں ہے، ان کے خاندان میں بڑے بڑے علماء ،صلحاء اور قاضی ومفتی پیدا ہوئے ، علمی خاندان تھا،اس لئے بہترین تربیت پائی اوراچھی قابلیت پیدا کی ،سرکاری ملازمت میں داخل ہوکر آہستہ آہستہ ترقی کے مدارج طے کرتے رہے، بہادرشاہ کے آخری وقت میں وزارت میں شامل کرلئے گئے، مرأۃ احمدی کے مصنف کا بیان ہے کہ بڑے متقی اورخداترس تھے، جب مسندِ وزارت پر بیٹھے تو ایک شخص کفن لئے کھڑا رہتا؛ تاکہ انصاف کرتے وقت قبر کا معاملہ پیش نظر رہے، علم وفضل میں بھی ممتاز تھے، عباسی خاندان سے تھے،اس لئے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے، سلطان محمود کے ابتدائی زمانہ میں عمادالملک کا رویہ دیکھ کر مستعفی ہوگئے ، جب عمادالملک چلا گیا اوراختیار خاں بھی شہید ہوگیا تو یہ پھر مسند وزارت پرآ گئے ،اس سے قبل برہان الملک نورالدین محمد عباسی بھی وزیر رہ چکے تھے، جوان کے چچا تھے،اوران کے والد محمود کے سگے بھائی تھے۔

ان کے سیاسی تدبر اورعلمی فضیلت کی بناء پر سلطان ہمیشہ امور سلطنت میں ان سے مشورہ لیتا رہتا اور بغیر ان کے مشورہ کے کام نہ کرتا، ۹۶۱ھ میں برہان نامی غلام نے

ستر (۷۰) برس کی عمر میں سلطان محمود کے ساتھ ان کو بھی شہید کر ڈالا، محمود آباد سے ان کی لاش احمد آباد لائی گئی، اور یہیں دفن کئے گئے، شہر پناہ سے باہر رائے پور اور سارنگ پور دروازے کے درمیان ان کی قبر ہے، انہی کے پہلو میں مشرقی جانب ان کے بھائی ملک زین العابدین کی قبر ہے، افضل پور کا محلّہ انہی کا آباد کیا ہوا ہے، اور قبر سے متصل ایک سرائے بھی انہی کی تعمیر کردہ ہے، جو "افضل خاں کی سرائے" سے مشہور ہے، مقبرہ کے ساتھ پتھر کی ایک مسجد بھی تھی، جو بہت خوش نماں تھی، لیکن مؤمن خان کے عہد میں مرہٹوں کے محاصرہ میں تباہ ہوگئی، حال میں ۱۹۴۶ھ مطابق ۱۳۶۶ء وقف کمیٹی نے اس کو درست کرا کے پھر آباد کیا ہے، بمبانیوں کا صرف ایک خاندان احمد آباد میں آج آباد ہے، اور وہ لوگ سلطان احمد اول کے مقبرہ کے سامنے رہتے ہیں، بمبانیوں کا دوسرا خاندان بڑودہ میں ہے، ان کو بڑودہ جاگیر میں ملا تھا، مگر آج صرف قضائت ان کے ہاتھ میں ہے۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ: ص: ۶۸، ۷۰)

محدث کبیر شیخ عبدالملک کا نام ونسب اور خاندان:

نام عبدالملک اور والد کا نام شیخ محمود تھا، ان کا خاندان بمبان سے احمد آباد آیا تھا، جس کے بارے میں اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وہ خراسان اور ملتان کے درمیان واقع تھا، یہ خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے جن افراد کا ذکر ملتا ہے، وہ سب دینی علوم تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور علوم آلیہ ادب وعربیت اور نحو وصرف میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے، اور ان میں تصانیف بھی یادگار چھوڑی تھیں، بعض اہل خاندان کو تاریخ سے بھی شغف تھا۔

بمبان کی نسبت سے شیخ عبدالملک 'بمبان' کہلائے اور چوں کہ ان کا نسبی تعلق

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے تھا، اس لئے عباسی کی نسبت سے بھی مشہور ہوئے، ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی نے ان کے شجرۂ نسب کی چند کڑیاں اس طرح تحریر فرمائی ہیں:

’’شیخ عبدالملک بن شیخ محمود بن شیخ خضر بن شیخ نصیرالدین بن شیخ برہان الدین بن شیخ خصر بن شیخ عیسی بن شیخ حسن بن شیخ الیاس۔‘‘

ولادت:

شیخ عبدالملک کی ولادت کا سن معلوم نہیں ہوسکا، قیاس وقرینہ سے کہا جاسکتا ہے کہ نویں صدی کے اختتام یا دسویں صدی کے آغاز میں ان کی پیدائش ہوئی ہوگی۔

مولد:

مولانا حکیم سید عبدالحی نے شیخ عبدالملک کو احمد آبادی لکھا ہے، (نزہۃ الخواطر: ج:۴، ص:۲۱۸) اور ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی لکھتے ہیں: شیخ عبدالملک زین البلاد احمد آباد میں پیدا ہوئے، (ماہنامہ: معارف، ج:۶۶، عدد:۴، اکتوبر ۱۹۵۰ء ص:۲۸۳) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کو گجرات کے باشندے لکھا ہے، (مقالات: ج:۲، ص:۱۳) اس میں اور اول الذکر دونوں میں کوئی تضاد نہیں، شیخ کا مولد ووطن احمد آباد ہی تھا۔

حفظ وذہانت:

ذہانت وجودت طبع میں یکتائے روزگار تھے، مولانا حکیم سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا بیان ہے: ’’وکان عبد الملک مفرط الذکاء وجید القریحۃ.‘‘ (نزہۃ الخواطر: ج:۴، ص:۲۱۸)

عبدالملک غیر معمولی ذہین اور طباع تھے، حافظہ غضب کا تھا، قرآن مجید کی طرح

صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث کے حافظ تھے۔

حدیث شریف میں کمال وامتیاز:

مولانا عبدالملک کی خاص شہرت اسی فن میں کمال وامتیاز کی بناء پر ہے، ان کے حالات زندگی تو ناپید ہیں، مگر ایک مشہور گجراتی محدث کی حیثیت سے اب تک لوح جہاں میں محفوظ ہے۔ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی فرماتے ہیں: ''حدیث میں بڑا کمال کیا اور استاذ زمانہ کے رتبہ اعلی پر فائز ہوئے۔'' حدیث کے درس وتدریس میں اپنی عمر گزاری، انہیں قرآن مجید کی طرح صحیح بخاری شریف پوری زبانی یاد تھی اور اس کے معانی ومطالب کے بھی پورے حافظ تھے، زبانی بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔ مولانا عبدالحی صاحب نے لکھا ہے:

''وكان حافظا للقرآن الحكيم وصحيح البخاری لفظاً ومعناً وكان يدرس عن ظهر قلبه ''یعنی وہ قرآن مجید اور صحیح بخاری کے الفاظ ومعانی کے حافظ تھے اور زبانی ہی درس بھی دیتے تھے۔(نزهة الخواطر:ج:۴،ص:۲۱۸)

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اور صحیح بخاری کے علاوہ دوسرے علوم اور درسیات کی کتابیں بھی زبانی یاد تھیں، ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی لکھتے ہیں:

''صحیح بخاری ازبر تھی، تمام علوم کا درس زبانی دیا کرتے تھے۔'' (معارف: اکتوبر، ۱۹۵۰ء ص:۲۸۴)

مولانا عبدالملک کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہوسکا، لیکن مولانا حکیم عبدالحی صاحب کے ایک بیان سے خیال ہوتا ہے کہ درس وتدریس سے لوگوں کو مستفید اور فیض یاب کرنے کے علاوہ ان کو تصنیف وتالیف سے بھی اشتغال رہا ہوگا، فرماتے ہیں:

''مولانا عبدالملک عباسی کا شمار محدثین کرام میں سے ہے، جنہوں نے ساری عمر اسی فن شریف کی خدمت میں صرف کی۔'' (یادایام:ص:۵۵)

لیکن اگر قرطاس وقلم کا مشغلہ نہ بھی رہا ہوتو کیا یہ کم ہے کہ وہ درس حدیث میں بڑے ممتاز اور فائق تھے اوران کے درس وتدریس کی وجہ سے احادیث کی بڑی نشرواشاعت ہوئی۔

دوسرے علوم سے شغف:

حدیث میں جس طرح استاذ زمانہ اورعالی رتبہ تھے، تفسیر میں بھی کمال حاصل تھا اورفقہ وعربیت میں بھی یکتا تھے، مولانا سید عبدالحی رائے بریلوی لکھتے ہیں:

"له مشاركة جيدة فى الفقه والحديث والتفسير والعربية." (نزهة الخواطر: ج:۴،ص:۲۱۸)

تصوف وسلوک:

گجرات خصوصاً احمدآباد ہر زمانے میں صوفیہ ومشائخ کا گہوارہ رہا ہے، یہاں تصوف کے لئے کئی سلسلے رائج ومقبول ہوئے، سہروردیہ سلسلہ کی زیادہ اشاعت ہوئی، (یادایام) حضرت بخاری برہان الدین مشہور بہ 'قطب عالم' (متوفی: ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء) نبیرۂ مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری وہ معروف سہروردی عارف ہیں، جوسب سے پہلے اپنے وطن سے گجرات تشریف لائے اوریہیں کے ہوکر رہے، ان کی اوران کے اہل خاندان اورخلفاء کی مساعی جمیلہ سے گجرات سہروردی سلسلہ تصوف کا ایک عظیم مرکز بن گیا، شیخ عبدالملک کا خانوادہ بھی اسی سلسلہ سے منسلک رہا تھا، شیخ کا تعلق بھی سہروردی سلسلے سے تھا۔ ڈاکٹر سید باقر

علی ترمذی لکھتے ہیں:

’’خاندان کے اور بزرگوں کی طرح شیخ عبدالملک بھی خانوادۂ سہروردیہ سے منسلک تھے، غالباانہی کی خانقاہ میں تعلیم پائی ہوگی‘‘۔(معارف:اکتوبر:۱۹۵۰ء،ص:۲۸۳)

شیخ عبدالملک توکل اور تجرید میں بے مثال تھے، اوراد و وظائف میں برابر مشغول رہتے تھے، مولانا سید عبدالحی رقم طراز ہیں:

’’لم یکن مثله فی زمانه فی التوکل والتجرید‘‘. (نزهة الخواطر:ج:۴،ص:۲۱۸)

وفات:

شیخ عبدالملک کی وفات کا سن متعین طور پر معلوم نہیں ہوسکا، لیکن کہا جاتا ہے کہ ۹۷۰ھ/ مطابق ۶۲-۱۵۶۳ء کے قریب وفات پائی، اسی لحاظ سے ان کا سن ولادت دسویں صدی ہجری کے آغاز یا نویں صدی کا آخر قرار دیا ہے۔

آپ کی اسنادحدیث:

حضرت مولانا یوسف متالا صاحب دامت برکاتہم ’مشائخ احمد آباد‘ میں تحریر فرماتے ہیں:

ذیل میں میں عبدالملک بمبانی محدث گجراتیؒ کی اسناد حدیث پیش کرتا ہوں، یہ اسناد شیخ رشیدالدین چشتی کی کتاب مخبرالاولیاء سے لی گئی ہیں، اس کتاب کا ایک نسخہ ایشاٹک سوسائٹی بمبئی کے کتب خانہ میں موجود ہے، چوں کہ سلسلۂ اسناد میں زیادہ تر نام ہی ہیں، اس لئے میں عربی متن نقل کرنے پر ہی اکتفاء کرتا ہوں۔

صحیح بخاری:

انه یروی من الشیخ محمد المدعو بجار اللّٰہ عن والده عز الدین

عبدالعزیز عن شهاب الدین ابی الفضل احمد بن علی بن حجر عن محمد بن محمد الهاشمی عن قاضی القضاة محب الدین محمد بن محمد بن محمد الطبری عن الشیخ ابی الفتح المراغی عن شهاب الدین ابی العباس احمد بن ابی طالب بن ابی نعیم نعبه بن حسن بن علی بن بیان بن شحمة الحجازی الدمشقی الصالحی عن سراج الدین ابی عبداللّٰہ الحسین بن المبارك بن محمد بن یحیی الزبیدی عن ابی الوقت عبد الاول بن عیسی بن شعیب بن اسحاق بن ابراهیم الصوفی السنجری ثم البردی عن جمال الاسلام ابی الحسن عبد الرحمن بن محمد بن المظفر بن محمد بن داود بن احمد بن معاذ بن اسهل بن الحکم الداودی عن ابی محمد عبد اللّٰہ بن احمد بن حمویة بن احمد بن یوسف بن اعین الحموی السرخسی عن ابی عبداللّٰہ محمد بن یوسف بن مطر ابن صالح ابن بشر بن ابراهیم البخاری العزیزی عن محمد بن اسماعیل البخاری رحمه اللّٰہ تعالیٰ.

صحیح مسلم :

انه یروی عن محمد المدعو بجاراللّٰہ عن ابی العباس احمد بن ابی طالب الصالحی المذکور فی سند صحیح البخاری وانه یروی عن محمد بن ابی السعادة الحامی قال اخبرنا الحافظ ابو القاسم عبد الرحمن بن محمد بن اسحاق بن مندة الاصفهانی عن الحافظ ابی بکر محمد بن عبداللّٰہ الجوزقی قال ابو حاتم المکی بن عبد اللّٰہ التمیمی قال اخبر الامام ابو الحسین مسلم رحمة اللّٰہ علیه.

سنن ابی داود :

قد یروی من محمد المدعو بجاراللّٰہ ، قال: اخبرنی والدی عز الدین عبدالعزیز سماعا قال:اخبرنا ابو العباس بن ابی بکر الواسطی وابو عبداللّٰہ محمد ابن احمد بن کامل الترمذی عن الخطیب ابی الفتح محمد بن محمد المنذری ، قال:اخبرنا ابوالفضل عبد الرحمن بن یوسف بن یحیی الموصلی سماعا، قال: اخبرنا ابوالفتح مفلح الدین بن أحمد الدومی وابوالنصر ابراهیم بن محمد الکرخی سماعا عن المسند ابی طاهر محمد بن محمد بن عبد اللطیف، قال: انبأتنا ام عبد زینب ابنة احمد بن عبدالرحیم المقدسی عن ابی القاسم بن الحاسب، قال: حدثنی الحافظ ابوالطاهر احمد بن محمد السلفی اذنا، قال :کتب ابو جعفر العبادانی من البصرة ، قال : اخبرنی القاضی ابو عمر القاسم بن جعفر بن عبدالواحد الهاشمی، قال: اخبرنا ابو علی محمد بن احمد بن عمر اللؤلؤی، قال : اخبرنا الامام ابو داود السجستانی رحمهم اللّٰہ تعالیٰ.

سنن الترمذی:

انه یروی من الشیخ محمد المدعوبجاراللّٰہ عن والده عز الدین عبدالعزیز، قال : أخبرنی شیخ الحنفیة امین الدین یحیی بن محمد القاهری ، قال: أخبرتنا الاصلیة ام محمد سارة ابنة عمر الحموی ، قال : انبأنا الصلاح عمر بن الحسین المراغی، قال: اخبرنا الفخر ابوالحسن علی ابن أحمد البخاری المقدسی أخبرنا ابوالفتح عبدالملک بن عبد اللّٰہ الکرخی سماعا ، أخبرنا

ابـوعـامـر مـحمد بن قاسم الازری ، قال: اخبرنا ابو العباس احمد بن محمد بن احـمـد بـن مـحبـوب الـمحبوبی، قال: أخبرنا الامام ابوعیسی محمد بن عیسی الترمذی رحمهم اللّٰه.

سنن نسائی:

انه یروی من محمد المدعو بجاراللّٰه عن والده عز الدین عبد العزیز ، قـال: أخبـرنـا الـحـافـظ تـقی الدین محمد بن علوی المالکی اذنًا ، قال: اخبرنا قاضی القضاۃ ، ابن زین الدین ابی بکر بن الحیسن المراغی المدنی ، قال : أخرنا ..... بـرهـان الـدیـن ابـراهیم بن محمد الدمشقی المؤذن سماعًا ، قال : أخبرنا مسـنـد الدنیا شهاب ابو العباس أحمد بن ابی طالب ، قال: اخبرنا ابوطالب عبد الـلـطیف بـن مـحمد ، قال: أخبرنی ابوذرعة طاهر بن محمد بن طاهر المقدسی سـمـاعا، قال : أخبرنا محمد عبد الرحمن سماعًا ، قال : أخبرنا ابو النصر احمد ابـن الـحسیـن بـن مـحـمـد الدینوی قال: حدثنی ابوبکر احمد بن محمد بن السحیق السنی، قال : حدثنی ابوعبدالرحمن أحمد بن شعیب علی النسائی.

سنن ابن ماجہ :

انـه یـروی مـحمد المدعو بجاراللّٰه عن والده عز الدین عبدالعزیز ، قال : أخبرنا الشیخان الحافظان تقی الدین محمد علوی المکی وقاضی القضاۃ شهـاب الدین أحمد بن علی بن حجر اِذنًا ، قال : برهان الدین ابراهیم بن صدیق الـدمشـقی سماعا ، قال اخبرنا ابو محمد عبداللطیف بن محمد علی قال اخبرنا ابـو مـنـصور محمد بن الحسین القزوینی سماعًا، قال : أخبرنا ابو طلحة القاسم

بـن الـمـنـذر الخطيب ، قال : أخبرنا أبو الحسن على بن ابراهيم بن العطار، قال: أخبرنا الامام ابو عبد اللّٰه محمد يزيد القزوينى المعروف بابن ماجه.

موطاامام مالک :

يـرويه عن محمد المدعو بجاراللّٰه عن والده عزالدين عبد العزيز عن شهـاب الـديـن ابـى الفضل احمد بن على بن حجر ، قال : أخبرنا العلامة برهان ابـراهيـم بـن احمد بن الواحد ، قال : أخبرنا المسند ابو عبد اللّٰه محمد بن جابر ابـن مـحـمـد بـن قـاسـم وادى اشى تونسى ، قال : أخبرنا ابومحمد عبد اللّٰه بن هارون القرطبى الطائى سماعًا، قال : أخبرنا القاضى ابو القاسم احمد بن زيد بن عبـد الـرحـمـن بن تقى ، قال : أخبرنا ابو عبد اللّٰه بن فرخ الفقيه مولى محمد بن الـطلاع، قال : أخبرنا ابو وليد يونس بن عبداللّٰه بن مغيث عن أبى عيسى يحيى ابـن عبـد اللّٰه عن ابيه عبيد اللّٰه بن يحيىٰ عن ابيه الامام يحيى بن يحيى الليثى عن الامام مالك. (معارف:ج:۴،ص:۲٦)

مؤرخ شیخ عبدالملک کے متعلق لکھتے ہیں: كـان حـافـظـا لـلقرآن وصحيح البـخـارى لـفـظـا ومـعـنـا وكان يدرس عن ظهر قلبه ولم يكن مثله فى زمانه فى التوكل والتجريد. (تاریخ گجرات)

شیخ محمد الفارسی نے ”عيـون مورد السلسلة فى الاحاديث المسلسلة“ **میں آپ کا ذکر** ”رواية مسلسل بالمشارقة “ **کے اندر کیا ہے اور وہ روایت یہ ہے:**

مـروى عـنـه بسـنـده عـن الشيـخ عبدالملك وبه الى داود الطائى عن

نعمان بن ثابت الکوفی عن عطا ء ابن ابی رباح عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ :اذا اتضع النجم رفعت العاھۃ عن کل بلد.

ہمیشہ حجرہ اور مسجد میں درود اور نماز میں مشغول رہتے تھے، کبرسنی کے سبب سے آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی، تمام علوم کا درس حفظ دیا کرتے تھے، توکل اور تجرید میں آپ کا مثل اس زمانہ میں کوئی نہیں تھا، مولانا کمال عباسی حدیث میں آپ کے شاگرد ہیں، ۹۷۰ھ میں آپ راہی آخرت ہوئے۔

نزہۃ الخواطر میں حضرت مولانا عبدالحی فرماتے ہیں:

ألشیخ العالم المحدث عبد الملک بن عبد اللطیف بن عبد الملک، العباسی الأحمدآبادی الگجراتی، احد العلماء البارعین فی الحدیث ، أخذ عن المفتی قطب الدین بن علاء الدین النھروالی المکی، وأخذ عنه ابراھیم بن الحسن الکورانی المدنی ، أجازہ مکاتبةً وذکرہ فی ایقاظ الھمم، وأخذ عنه ابو الاسرار حسن بن علی العجیمی المکی، وقد ذکرہ الشیخ محمد بن الطیب الفاسی فی عیون موارد السلسلة فی الاحادیث المسلسلة فی روایته المسلسل بالمشارقة ، وروی عنه بسندہ عن الشیخ عبد الملک وبه الی داود الطائی عن نعمان بن ثابت الکوفی عن عطاء بن ابی رباح عن ابی ھریرۃؓ عن النبی ﷺ : اذا اتضع النجم رفعت العاھۃ عن کل بلد.

محدث عبدالملک بمبانی عباسی احمد آبادی، اکابر میں سے تھے، مولد ومنشاء احمد آباد ہے، اپنے بھائی قطب الدین عباسی سے درسیات وحدیث پڑھی، جو حدیث میں شیخ شمس

الدین بن محمد سخاویؒ مصری (مؤلف:الضوء اللامع) کے شاگرد تھے۔

شیخ فضل احمد جیوری اذکار ابرار ترجمہ:گلزار ابرار (محمد غوثی شطاری مانڈوی) میں فرماتے ہیں:

’’آپ کی زاد بوم اور خواب گاہ دونوں احمد آباد میں ہیں، اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین کے شاگرد ہیں، جنہوں نے حدیث کی سند شیخ سخاوی مصری شاگرد ابن حجر عسقلانیؒ سے لی تھی، علم حدیث اور تفسیر میں ترقی پا کر عام اہل زمانہ کے استاذ ہو گئے تھے، صحیح بخاری اور قرآن مجید لفظاً ومعناً حفظ تھے، ہمیشہ حجرہ اور مسجد کے اندر ذکر اور نماز میں مشغول رہتے تھے، گھر میں کمتر جایا کرتے تھے، ضعیفی کے سبب سے ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی اور بجائے اس کے دل میں روشنی بڑھ گئی تھی، تمام علوم کا درس حفظ دیا کرتے تھے، توکل اور تجرید میں آپ کی مثل اس زمانہ میں کوئی نہ تھا، مولانا کمال محمد عباسی گجراتی جو اجین اور مالوہ کے مفتی تھے؛ حدیث میں آپ کے شاگرد ہیں، ہجری سن ۹۷۰ تھا کہ ملک تقدس کو کوچ فرمایا۔‘‘ مصرع ؂

مرقدس ش از نور مالا مال باد۔ (اذکار ابرار:ص:۳۱۱)

آپ نہایت طباع ذہین تھے، فقہ وحدیث اور تفسیر وادب میں یکتا تھے، آپ قرآن مجید اور صحیح بخاری کے لفظا ومعنا حافظ تھے، ان کے معاصرین میں توکل وتنہائی میں کوئی دوسرا ان کا ہم پلہ نہیں تھا، مولانا کمال الدین مفتی اجین آپ کے شاگرد تھے، ۹۷۰ھ کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اساتذہ:

شیخ نے جن بزرگوں سے تحصیل فن کی ہوگی، ان کی تعداد کئی ہوگی؛ مگر افسوس کہ ان کے نام بھی معلوم نہیں ہو سکے، صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین سے حدیث شریف پڑھی تھی اور بھائی نے علامہ شمس الدین محمد بن سخاوی مصری صاحب " الضوء اللامع " سے حدیث کا درس لیا تھا، اس طرح وہ صرف ایک واسطہ سے حافظ سخاوی کے شاگرد تھے۔

ڈاکٹر سید باقر ترمذی صاحب نے اپنے مضمون میں شیخ عبدالملک کی صحاح ستہ اور موطا امام مالکؒ کی اسناد نقل کی ہیں، جس کو ہم آگے نقل کر چکے ہیں، جو شیخ رشید الدین چشتی کی کتاب 'مخبر الاولیاء' سے مأخوذ ہیں، جس کا ایک نسخہ انہوں نے ایشیاٹک سوسائٹی ممبئی کے کتب خانے میں موجود بتایا ہے، تمام کتابوں کے سلسلۂ اسناد میں پہلا نام محمد المدعو بجار اللہ درج ہے، ان کے اوپر کی سند کے نام ہر کتاب میں مختلف ہیں، اس طرح انہوں نے اپنے بھائی قطب الدین کے علاوہ محمد جار اللہ سے بھی حدیث کا درس لیا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد جار اللہ کے والد کا نام عبدالعزیز لکھا ہے اور سن وفات ۹۵۴ھ/ ۱۵۴۷ء بتایا ہے ۔ (ماہنامہ معارف : ج:۳۰، عدد:۱، جنوری ۱۹۵۴ء، ص:۶۴)

شیخ قطب الدین بمبانی کے حالات سے طبقات وتراجم کی کتابیں خالی ہیں، نزهة الخواطر جلد نمبر۴، صفحہ نمبر۲۷۱/ پر مولانا عبدالحی صاحب نے جن شیخ قطب الدین گجراتی کا ذکر کیا ہے، وہ یہ نہیں ہیں؛ بلکہ نہر والا کے باشندے اور ذاکر صوفی اور قطب جہاں

تھے،مگر اپنی دوسری کتاب”الثقافة الاسلامية فی الهند“ص:۱۳۷،۱۳۶،طبع دمشق،میں جن قطب الدین عباسی گجراتی کا نام لیا ہے وہ یہی ہیں،ان کا شماران علماء ہند میں کیا ہے؛جو گجرات سے حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں سے علم حدیث کی تحصیل کر کے ہندوستان واپس آئے اور خلق خدا کو فیض یاب کیا۔

چنانچہ ’الثقافة الاسلامية ‘اردو ترجمہ:”اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں“ کتاب کے ص:۱۹۶ر پر لکھا ہے:

ہندوستان کے کچھ علماء کرام نے حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا،اور وہاں سے انہوں نے فن حدیث حاصل کیا،اوراس فن کو لے کر ہندوستان واپس تشریف لائے،ان سے اس علم کی ہندوستان میں اشاعت ہوئی اور بہت لوگوں نے فائدہ اٹھایا،مثلاً:

شیخ عبد اللہ سندھی بن سعد اللہ،شیخ رحمۃ اللہ سندھی بن عبداللہ بن ابراہیم،یہ دونوں بزرگ حجاز سے ہندوستان تشریف لائے اور عرصہ تک گجرات میں درس حدیث دیتے رہے،پھر دوبارہ حجاز ہجرت کر گئے،شیخ یعقوب بن حسن کشمیری،شیخ جوہر کشمیری،شیخ عبدالنبی گنگوہی بن احمد،شیخ عبداللہ سلطان پوری بن شمس الدین،شیخ قطب الدین عباسی گجراتی،شیخ احمد بن اسماعیل مانڈوی،شیخ راجح بن داود گجراتی،شیخ علیم الدین مانڈوی،شیخ معمر بن ابراہیم بن داود مانی پوری مدفون باکبرآباد،شیخ محمد طاہر بن علی پٹنی،مصنف”مجمع بحار الانوار“ سید عبدالاول حسینی بن علی بن علاء الحسینی اور دوسرے علماء کرام۔(اسلامی علوم وفنون،ص:۱۹۷)

تلامذہ:

شیخ عبدالملک جس پایہ کے محدث تھے،اس کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ ان سے

فیض یاب ہونے والے بے شمار لوگ رہے ہوں گے، مگران کے صرف ایک ہی شاگرد کمال (یا کمال الدین) محمد عباسی کا نام ملتا ہے، جن کو بعض لوگوں نے شیخ عبدالملک کا پوتا بھی کہا ہے، ڈاکٹر سید باقر لکھتے ہیں:

’’حدیث میں مولانا عبدالملک کے ممتاز شاگردوں میں مولانا کمال محمد عباسی (مفتی اجین، مالوہ) کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے‘‘۔(معارف: اکتوبر: ۱۹۵۰ء، ص: ۲۸۴)

مولانا کمال محمد عباسی مفتی اجین کے متعلق مولانا عبدالحی صاحب نے لکھا ہے اسے ہم یہاں بعینہ نقل کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ ان کی زندگی کتنی مرتب اور منضبط تھی۔

الشیخ کمال محمد العباسی:

ألشيخ العالم الكبير المفتى كمال محمد العباسى الگجراتى، أحد علماء المبرزين فى الفقه والاصول والعربية ، ولد ونشأ بأحمدآباد من ارض گجرات واشتغَل بالعلم من صباه على العلامة وجيه الدين بن نصر الله العلوى الگجراتى، ولازمه ملازمة طويلة ؛حتى برع وفاق اقرانه ، ثم اخذ عنه الطريقة ، وأسند الحديث عن الشيخ عبد الملك البمبانى ، ثم خرج من أحمدآباد سنة ثمانين وتسع مائة و رحل الى اجين من ارض مالوه فسكن بها، وتزوج بابنة الشيخ اولياء بن سراج الكالپوى، وولى الافتاء فاشتغل بالفتيا ، والتدريس ثلاثين سنة.

ومن عوائده انه كان يستيقظ فى الليل اذا بقى ثلثه ، فيغتسل ويتهجد

ویقرأ سبعة اجزاء من القرآن فی الصلاة ، ثم یدعو بالادعیة المأثورة ، ثم یذکر اللّٰه سبحانه وتعالی بالجهر علی طریق السادة الشطاریة ، ثم یصلی الفجر ، ثم یشتغل بتلاوة القرآن الی صلاة الاشراق، ثم یصلی ویجلس للدرس والافادة فیدرس الی زوال الشمس ، ثم یتغدی ومعه جماعة من المحصلین علیه، ثم یقیل ساعة ثم یصلی الظهر، ثم یجلس للافتاء ، فیشتغل به الی العصر، ثم یصلی ، ثم یشتغل به ، ثم یصلی ویقبل علی اصحابه فیتحدث معهم الی العشاء ، ثم یدخل فی حجرته ، ویشتغل بمطالعة الکتب التی یدرسها الی الثلث الاول من اللیل ، ثم یدخل فی المنزل ، وکان من الخامسة عشرة من سنة الی أربع وخمسین صرف عمره علی هذا الطریق، وتوفی لیلة الاثنین عاشر شعبان سنة ثلاث عشرة والف ، کما فی "گلزار الابرار". (نزھة الخواطر:ج:۵،ص:۳۱۶،۳۱۵)

''شیخ کمال محمد عباسی گجراتی ایک بڑے عالم اور مفتی تھے، جو فقہ اور عربیت کے ممتاز اور ماہر علماء میں تھے، احمد آباد میں ان کی پیدائش ہوئی اور یہیں نشو ونما پائی، بچپن ہی سے علامہ وجیہ الدین بن نصر اللہ علوی گجراتی کی درس گاہ میں حصول علم میں مشغول ہو گئے اور زمانۂ دراز تک ان کی خدمت میں رہ کر کسب کمال کرتے رہے اور اپنے ہم عصروں سے گوئے سبقت لے گئے، علامہ وجیہ الدین ہی سے طریقت وسلوک کی تعلیم حاصل کی اور حدیث کی سند شیخ عبد الملک بمبانی سے لی۔

اس کے بعد وہ احمد آباد سے ۹۸۰ھ/۱۹۷۲ء میں اجین چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی اور شیخ اولیاء بن سراج کالپوی کی صاحب زادی سے عقد کیا اور افتاء کے منصب پر

فائز ہوئے اور تیس سال تک تدریس وافتاء کی خدمت میں مشغول رہے۔‘‘

مولانا عبدالحی صاحب نے گلزار ابرار کے حوالے سے شیخ کمال محمد عباسی کے یہ معمولات نقل کیے ہیں:

’’جب ایک تہائی رات باقی رہتی تو وہ بیدار ہوجاتے، غسل فرماتے اور تہجد کی نماز پڑھتے جس میں سات جز قرآن مجید کی قرأت کرتے، پھر ماثورہ دعائیں پڑھتے، اس کے بعد بزرگان شطاریہ کے طریقے کے مطابق ذکر جلی فرماتے، پھر نماز فجر ادا کرتے، اس کے بعد اشراق کی نماز کے وقت تک تلاوت قرآن مجید میں مشغول رہتے، پھر اشراق کی نماز پڑھتے، اس کے بعد درس وافادہ کا سلسلہ شروع کرتے؛ جو زوال کے وقت تک جاری رہتا، اس کے بعد کھانا تناول فرماتے، جس میں طلبہ کی جماعت بھی شریک رہتی تھی، پھر ایک گھنٹہ تک قیلولہ کرتے، اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے، پھر مجلس افتاء کو رونق بخشتے اور عصر کی نماز تک اس میں مشغول رہتے، عصر کے بعد پھر اسی کام میں مشغول ہوجاتے اور جب مغرب کا وقت ہوتا تو نماز پڑھ کر اپنے رفقاء وتلامذہ کی جانب متوجہ ہوتے اور عشاء تک ان سے بات چیت فرماتے، عشاء بعد اپنے کمرے میں داخل ہوتے اور ایک تہائی رات تک ان کتابوں کا مطالعہ کرتے جن کا درس دینا ہوتا تھا پھر خواب گاہ میں تشریف لے جاتے۔

۱۵ر برس کی عمر سے ۵۴ر برس کی عمر تک ان کی زندگی اسی انداز پر گزری، یکشنبہ، ۱۰ر شعبان المعظم ۱۰۱۳ھ/ ۱۶۰۶ء کو انتقال ہوا۔ (نزھۃ الخواطر: ج:۵،ص:۳۲۷)

یادِ شیخ محمد کمال عباسی:

’اذکار ابرار‘ ترجمہ ’گلزار ابرار‘ میں لکھا ہے کہ کامل تیس سال اس مقام پر شرعی

اور حکمی علوم کا درس دیا، اور مفتی بہ روایات پر فتوے کہنے لگے، بے کاری کبھی آپ کے گرد پھٹک ہی نہیں سکتی تھی، کیوں کہ رات اور دن کی تقسیم آپ نے اس طرح کر رکھی تھی کہ رات کا ایک ثلث حصہ باقی رہتا تھا کہ اٹھ کر غسل کرتے تھے اور نماز تہجد کے اندر کبھی چھ اور کبھی سات پارۂ قرآن پڑھتے تھے، یہاں تک کہ صبح کی سفیدی نمودار ہو جاتی تھی، پھر دعاؤں اور ذکر جہری سے فارغ ہو کر نماز صبح ادا کرتے تھے، پھر وقت اشراق تک تلاوت کرتے رہتے تھے، نفل اشراق پڑھنے کے بعد زوال تک برابر درس دیتے رہتے تھے، پھر اہل سبق کے ساتھ کھانا کھاتے تھے، پھر ایک گھڑی کے انداز سے قیلولہ کر کے نماز ظہر کے واسطے اٹھ جاتے تھے، نماز ظہر کے بعد عصر تک لوگوں کی مشکلات، فتوی نویسی سے حل کیا کرتے تھے، پھر شام کے بعد درویش دوستوں کے ساتھ راز تصوف اور تحقیق کی باتیں کرتے رہتے تھے، نماز عشاء پڑھ کر گھر کے اندر تشریف لے جاتے تھے، شب کے اولین ثلث تک آئندہ روز کے سبقوں کے مطالعہ میں مشغول اور منہمک رہتے تھے، اور شب کے درمیانی ثلث میں سے کچھ حصہ تو خانہ نشینوں کے ساتھ اور کچھ حصہ سونے میں صرف کرتے تھے، گیارہ سال کے آغاز سے چوّن (۵۴) سال تک اسی طریقے پر زمانہ گزرا، ۱۰۱۳ھ میں ایک خط فقیر غوثی حسن کے نام اس مضموم کا بھیجا تھا ''بنیاد عمر نہایت ناپائیدار ہے، اعتماد کے لائق نہیں ہے، شوق اس بات کو چاہتا تھا کہ دوستان منڈو کے دیدار کے واسطے میں وہاں آؤں، لیکن موانع حارج ہوئے، اگر منڈو والوں کو کوئی عذر مانع نہ ہو، تو سیر اجین کرنی چاہیئے، تا کہ باہم ایک دوسرے کا دیدار غنیمت سمجھ کر تھوڑی دیر ملیں۔''

میں حسب التحریر آپ کی ملازمت میں گیا، چندروز حقائق کی عید، اور معارف کا

نوروز رہا، بالآخر اسی سال کی دسویں شعبان کو دوشنبہ کی شب میں ہر شب کے معمول کے موافق جس قدر طاقت میں گنجائش ملی، معینہ معتاد میں مشغول رہے، راقم بھی اس وقت حاضر تھا، دوکلموں پر وصیت تمام کی اور شب کے اخیر حصہ میں ناسوتی مجلس سے منھ پھیر کر ملاء اعلی کی طرف روانہ ہوئے، خوابگاہ اسی ڈالان میں اختیار کی، جس میں درس دیا کرتے تھے ۔

یقین میدان کمال از ملک مارفت ۔ (اذ کار ابرار، ص:۴۶۴)

نوٹ: اس زمانہ کی تقسیم اوقات کے لحاظ سے ایک گھڑی چوبیس منٹ کی ہوتی تھی اور ڈھائی گھڑی کا ایک گھنٹہ، اس لحاظ سے غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ چھتیس منٹ قبل کا وقت ہوا۔ (توزک جہاں گیری، م، ۱۰ رشوال المکرّم ۱۴۳۱ھ/۱۶۶۴ء)

اولاد واحفاد:

مولانا عبدالملک کے ایک فرزند شیخ عبداللطیف کا ذکر قاضی سید نورالدین حسین صاحب نے کیا ہے اور ان ہی سے متاثر ہوکر سید باقر علی ترمذی نے بھی شیخ عبداللطیف کو ان کا بیٹا قرار دیا ہے اور مزید یہ بھی کہ انہوں نے صغانی کی مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار لکھی تھی؛ جس کا ایک مخطوطہ بھروچ کے قاضی نورالدین صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھا، ان حضرات کے بیان کے مطابق شیخ عبداللطیف احمد آباد کے باشندے تھے اور ان کے والد کا نام عبدالملک بمبانی تھا، عبداللطیف کی وفات 915ھ مطابق ۱۵۰۹ء میں ہوئی، ان کے صاحب زادے یعنی عبدالملک کے پوتے بھی عالم تھے اور ان کا نام شیخ خلیل محمد عباسی تھا، انہوں نے اپنے والد سے علم حدیث حاصل کیا، احمد آباد کے بخاریوں کے ایک مشہور عالم

اور صوفی سید مقبول عالم ان سے روایت کرتے ہیں ، چناں چہ علامہ نورالدین (متوفی ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء) نور القاری فی شرح البخاری میں فرماتے ہیں:

وبہ قال مولانا مقبول عالم ؛ حدثنی مولانا خلیل محمد العباسی البمبانی؛ حدثنی والدی عبداللطیف؛ حدثنی والدی عبدالملك ؛ حدثنی محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ .... (معارف: اکتوبر، ۱۹۵۰ء، ص:۲۸۴)

یعنی ''مولانا مقبول عالم نے فرمایا کہ مجھ سے مولانا خلیل محمد عباسی نے حدیث بیان کی ہے، انہوں نے کہا: مجھ سے میرے والد محترم عبداللطیف نے حدیث بیان کی اور انہوں نے کہا کہ مجھ سے میرے والد عبدالملک نے حدیث بیان کی، انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے محمد جاراللہ نے اپنے والد کے حوالے سے حدیث روایت کی۔''

مبارق الازھار:

قاضی نورالدین اور ڈاکٹر باقر علی کا مبارق الازہار کو شیخ عبداللطیف بن عبدالملک کی تصنیف قرار دینا صحیح نہیں ہے، مبارق الازہار کے مصنف عزالدین عبداللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک تھے، ان کی یہ شرح استنبول سے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں چھپ گئی ہے اور وہ احمد آباد کے باشندے نہیں تھے، بلکہ رومی عالم تھے، ان کی تصنیفات میں شرح مجمع البحرین فقہ میں اور شرح منار اصول فقہ میں بہت مستند اور علماء میں متداول رہے ہیں، اس کے متعلق محدث اعظم مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ (المتوفی: ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) کا ایک محققانہ مضمون معارف میں شائع ہوا ہے، جس میں ناقابل تردید دلائل سے ثابت کیا گیا

ہے کہ مبارق الازھار عبدالملک بن عبدالعزیز امین المعروف بابن فرشتہ یا عبداللطیف بن الملک کی تصنیف ہے، مولانا نے تحقیق سے سن وفات ۹۱۵ھ/ ۱۳۰۹ء کو بھی غلط قرار دیا ہے اور استنبول کے نسخہ میں درج سن وفات ۷۹۷ھ/ ۱۵۹۵ء کو بھی صحیح تسلیم نہیں کیا ہے؛ بلکہ علامہ ابن العماد حنبلی (متوفی: ۱۰۸۹ھ/ ۱۶۷۸ء) کے بیان پر اعتماد کرکے لکھا ہے کہ ابن فرشتہ کی وفات قریبا ۸۸۵ھ/ ۱۴۸۰ء میں ہوئی، مولانا کے نزدیک مصنف کا ہندوستانی ہونا محقق نہیں، انہوں نے علامہ محمد بن علی شوکانی (المتوفی: ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) کی 'البدر الطالع' کے حوالے سے لکھا ہے کہ مصنف ایک رومی عالم تھے، جو سلطان مراد کے زمانے میں موجود تھے۔

(معارف: جنوری،۱۹۵۴ء، مضمون بہ عنوان ''مبارق الازھار'' کس کی تصنیف ہے؟)

مطبوعہ نسخہ کے ٹائٹل پر شرح کا نام اسی طرح لکھا ہے؛ مگر دیباچہ میں خود شارح نے اس طرح لکھا ہے، ''وبعد فیقول العبد الضعیف عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملك'' (مبارق الازہار، ج:۱،ص:۲) اور 'الضوء اللامع' میں عبداللطیف بن عبد العزیز بن امین الدین بن فرشتہ دیا ہے، (ج:۴،ص:۳۲۹) اور یہی علامہ شوکانی نے بھی لکھا ہے، (البدر الطالع، ج:۱،ص:۳۷۴) اور ابن عماد نے المولی عزالدین عبداللطیف بن الملک الحنفی الشہیر بابن فرشتہ دیا ہے، (ج:۷،ص:۳۴۲) یہ بھی واضح رہے کہ فرشتہ اور ملک ہم معنی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ مبارق الازھار شرح مشارق الانوار کے مصنف عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک ہیں، جو نہ بمبائی ہیں، نہ احمد آبادی، اور نہ ان کی وفات ۹۱۵ھ میں ہوئی۔

مولانا نے اپنے موقف کے سلسلہ میں مندرجۂ ذیل شواہد پیش کئے ہیں:

(۱) جن مصنفین نے بھی ابن فرشتہ یا مبارق الازہار کا ذکر کیا ہے، سبھی نے عبداللطیف بن الملک کی تصنیف بتلایا ہے، مولانا نے الضوء اللامع، الشقائق النعمانیہ، اعلام الاخیار، شذرات وغیرہ کا حوالہ دیا۔

(۲) مبارق کے مصنف نے خود اپنے نام کی تصریح کی ہے: "وبعد فیقول العبد الضعیف عبداللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملك." (مبارق الازہار: جلد:۱،ص:۲)

(۳) الضوء اللامع، شقائق النعمانیہ، اعلام الاخیار اور شذرات وغیرہ سبھی کتابوں میں مصنف کے والد کا نام عبدالعزیز ہے، یا صرف عبداللطیف ابن الملک لکھا ہوا ہے، ان میں سے کسی میں مصنف کے والد کا نام عبدالملک نہیں ہے، اسی طرح ان کے دادا کا نام کسی نے محمود بھی نہیں بتلایا ہے، جیسا کہ مقالہ نگار سید باقر علی ترمذی صاحب نے لکھا ہے۔

(۴) کسی مصنف نے ان کو ہندی یا بنبانی نہیں لکھا ہے، بلکہ طاش کبری زادہ نے ان کو ترکی کا باشندہ قرار دیا ہے۔ (الشقائق النعمانیہ:ص:۲۳)

ان دلائل کی روشنی میں مولانا اعظمیؒ اس نتیجہ پر پہونچے کہ مقالہ نگاروں کو اشتباہ ہو گیا ہے، انہوں نے جن عبداللطیف کا ذکر کیا ہے؛ وہ ابن فرشتہ اور شارح مشارق کے علاوہ کوئی اور بزرگ ہیں، جن کے والد کا نام عبدالملک بمبانی تھا، وہ نسبا عباسی اور احمد آباد کے باشندے تھے، مگر غلط فہمی سے ان کو شارح مشارق تصور کر لیا گیا۔

مولانا اعظمیؒ نے سن وفات کی بحث بھی کی ہے، مقالہ نگار حضرات نے جن عبداللطیف کا ذکر کیا ہے، ان کا سن وفات ۹۱۵ھ لکھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دسویں صدی کے عالم ہیں؛ حالانکہ وہ نویں صدی کے علماء میں ہیں، دلیل میں مولانا نے سخاوی کی الضوء اللامع میں ان کا تذکرہ کئے جانے کو کافی سمجھا اور پھر سخاوی کے انداز تحریر کے ذریعہ بتایا کہ ان کی وفات نویں صدی میں ہو چکی تھی، اور طاش کبری زادہ نے ان کو سلطان بایزید یلدرم کے عہد حکومت کے علماء میں بتایا ہے اور سلطان بایزید یلدرم کا عہد حکومت ۷۹۱ھ/ ۸۰۵ء تک ہے۔

سید نورالدین حسین صاحب اور ڈاکٹر سید باقر علی صاحب نے عبداللطیف احمد آبادی کا جو سن وفات ذکر کیا ہے، مولانا اعظمی نے اس کو بھی غلط ٹھہرایا اور دلیل سے اپنے دعوے کو ثابت کیا، تاریخ وفات پر کلام کرتے ہوئے مولانا نے سن کی غلطی کی بنیاد یہ بتائی کہ قاضی سید نورالدین حسین نے 'مبارق الازہار' کے مصنف ملک عبداللطیف داورالملک کو سمجھا، اور ان کا سال وفات ۹۱۵ھ لکھا ہوا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے عبداللطیف ابن عبدالملک بمبانی کو مبارق کا مصنف تصور کر کے یہ تخیل قائم کرلیا کہ یہ عبداللطیف وہی ہے؛ جو ملک عبداللطیف داورالملک ہیں، لہذا انہوں نے ان کی سن وفات بھی ۹۱۵ھ لکھ دیا، حالانکہ یہ کسی طرح صحیح نہیں، یہ دونوں دو عبداللطیف ہیں، ان دونوں کے علاوہ عبداللطیف بن ملک تیسرے بزرگ ہیں، جن کی نسبت شوکانی نے لکھا ہے:

"وله تصانيف، منها شرح شرح المشارق، وكان من علماء الروم الموجودين فى ايام السلطان مراد."

ان کی متعدد تصانیف ہیں، ان میں سے ایک شرح مشارق ہے اور وہ ایک رومی تھے، سلطان مراد کے زمانہ میں موجود تھے۔ (البدر الطالع: ج:۱، ص:۴/۳، بحوالہ معارف، ج:۱، ص:۷۳)

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

❖❖❖

کثیر التصانیف، طویل التدریس، عابد وزاہد، نامور عالم نورالدین بن محمد صالح صدیقی احمد آبادیؒ

رابطۂ ادب اسلامی کی گجرات شاخ کے چوتھے سمینار نومبر ۲۰۱۴ء مطابق محرم الحرام ۱۴۳۶ھ جامعۃ العلوم گڈھا تحصیل ہمت نگر میں یہ مقالہ پیش کیا گیا، اس میں حضرت شیخ نورالدین صدیقی احمد آبادیؒ کی علمی، دینی وتالیفی خدمات کو بطور خاص اجاگر کرنے کی سعی وکوشش کی گئی ہے۔

کثیر التصانیف، طویل التدریس، عابد وزاہد، نامور عالم
نور الدین بن محمد صالح صدیقی احمد آبادیؒ

گجرات اپنی (طبعی) جائے وقوع کے اعتبار سے خاصی اہمیت رکھنے والا ایک صوبہ ہے، وہ اپنی مختلف خصوصیات اور شاندار علمی تاریخ کا حامل رہا ہے، اسلامی خصوصیات کے دائرہ میں یہاں کے اہل علم نے ایک شاندار تاریخ بنائی ہے، بڑے جید اور ممتاز علماء پیدا ہوئے اور انہوں نے علمی میدانوں میں درس وتدریس کے کاموں کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے اہم علمی کارنامے انجام دیئے ہیں، ان کارناموں میں متعدد کام اپنے موضوع کے لحاظ سے اعلی مقام رکھتے ہیں، اس طرح گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز، ارباب ہنر کا گہوارہ اور ارشاد وتلقین کا سرچشمہ بنا رہا۔

پھر گجرات پر آٹھویں صدی سے دسویں صدی تک ایک طویل دور ایسا بھی گذرا ہے جس میں علمی زمین بھی خاصی ہموار تھی، اگر چہ اسلامی علوم کی اشاعت کی داغ بیل کافی عرصہ پہلے ڈالی جا چکی تھی، اس روشن ترین دور میں اسلامی حکومت کے قیام اور علم دوست مسلم حکمرانوں کے وجود سے یہاں درس وتدریس کے کاموں کو بے حد ترقی ہوئی۔

اسی گجرات کا ایک شہر احمد آباد ہے، یہ وہ شہر ہے جس میں سینکڑوں فقہاء اور محدثین کی علمی چمک اور روحانی روشنی ایک طویل عرصہ تک رہی، گویا علمی آفتاب وماہتاب کی روشنی سے یہ خطہ منور رہا اور آج بھی مختلف علوم وفنون کی یادگار شخصیتوں کے مقبرے اس بقعہ میں موجود ہیں، جن کے علمی آثار ونقوش آج بھی تابناک علمی تاریخ کی یاد دلاتے ہیں۔

گجرات کی اسی دینی وعلمی تعمیر کے معماروں میں سے ایک کثیر التصانیف، طویل التدریس، عابد وزاہد، ڈاکٹر باقر علی صاحب کے الفاظ میں ''گجرات میں عربی اسلامی علم ودانش کے آخری بڑے علمبردار'' عالم کبیر، علامہ نورالدین بن محمد صالح صدیقی احمد آبادی گجراتی ہیں، جن کی ذات صالح روایات، علم وفضل اور اسلاف کی پرہیزگاری کا نمونہ تھی، جنہوں نے درس وتدریس، ارشاد وتبلیغ اور تحریر وتالیف کے ذریعہ اہل گجرات کو علمی وعملی دونوں طریقوں سے بے انتہاء فیض پہنچایا ہے، جن کا شماران نامور علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی علم کی خدمت میں فنا کردی اور دنیا کے عیش وآرام سے کوئی تمتع حاصل نہیں کیا، سطور ذیل میں اسی برگزیدہ ہستی کی زندگی کے حالات، بالخصوص ان کی علمی زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ افراد سازی یعنی شخصیات بننے میں اولاً توفیق الٰہی اوراس کے بعد گھریلواور پس وپیش کے ماحول کے ساتھ ساتھ اساتذہ کا بھی بڑادخل ہوتا ہے اور شخصیات پہچاننے میں ان دو چیزوں کے ساتھ ساتھ اولاد، شاگرد وتلامذہ، تصنیفات وتألیفات اور تعلیمی خدمات کو دیکھا جاتا ہے، چونکہ شخصیات بننے اور پہچاننے میں مذکورہ امور ضروری ہے اس لئے ان مضامین وموضوعات پر قلم اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ولادت:

آپ کا اسم گرامی نورالدین بن حاجی شیخ محمد صالح، خطاب مخدوم العالم، لقب استاذ الکل، مولد ومنشأ احمد آباد، تاریخ ولادت: ۱۰؍جمادی الاولی (یکم مئی) ہے، البتہ سن ولادت میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہوا ہے، ڈاکٹر باقر علی ترمذی اور مرزا بسم اللہ احمد

بیگ صاحب نے ۱۰۶۳ھ ذکر کیا ہے جبکہ پروفیسر محبوب حسین عباسی اور صاحب مرآۃ احمدی کے بقول ۱۰۶۰ھ ہے، مشہور تذکرہ نگار علامہ عبدالحی ندویؒ نے سن ولادت ۱۰۶۳ھ ہی ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ولد لعشر خلون من جمادی الأولی سنة ثلاث وستین والف .

ماحول:

اس سے پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ بچوں کی شخصیت سازی، صحیح تعمیر اور صحیح تعلیم وتربیت پر جن عوامل کا اہم کردار ہوتا ہے وہ گھر، مدرسہ اور ماحول ہے، مناسب تعلیم وتربیت کے لئے ان عوامل میں مناسب ہم آہنگی ضروری ہوتی ہے، انسان عموما اپنے ماحول ومعاشرے کی پیداوار ہوتا ہے، ماحول میں جن چیزوں کا چلن ہو اسے بچہ اپنالیتا ہے، بچہ پر ماحولیات کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے، ان عوامل اور خصوصا ماحول ہی کی اچھائی – برائی، فرض شناسی – لاپروائی پر تعلیم وتربیت کے اچھے برے نتائج کا انحصار ہے۔

چنانچہ ایک تو خود آپ ذہن رسا کے مالک تھے، فطرت پاک تھی، خدا طلبی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ طلب علم کی صفات بچپن سے والدین نے پیدا کردی تھی، والد بھی عالم تھے اور مرزا بسم اللہ بیگ صاحب کے بقول والدہ بھی عالمہ زاہدہ تھیں، تمام سوانح نگار اس بات کے قائل ہیں کہ والد محترم نے سات دن میں گلستاں پڑھائی تھی، جبکہ مرزا بیگ صاحب اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے بقول والدہ ماجدہ نے انہیں گلستاں پڑھائی تھی، جو بھی ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں بھی علمی ودینی فضا تھی جو حضرت علامہ نورالدین صاحب

کو بچپن ہی سے نصیب ہوئی۔

تعلیم اور اساتذہ:

بچوں کی تعلیم وتربیت پر اثر انداز ہونے والا دوسرا سب سے مؤثر عامل مدرسہ اور اساتذہ ہے، بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہم آہنگی کے ساتھ پروان چڑھانے کی ذمہ داری اسی کے سپرد ہوتی ہے، مدرسہ ایک منظّم ادارہ ہے جہاں باصلاحیت اساتذہ ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ بچوں کو تعلیم دیتے ہیں اور ان کی شخصیت کو سنوارتے ہیں اور فضا ایسی ہموار کرتے ہیں جس سے بچے متأثر ہوتے ہیں اور اساتذہ بچوں کی شخصیت پر جو نقوش ثبت کرتے ہیں وہ زندگی بھر قائم بھی رہتے ہیں، معلوم ہوا کہ افراد سازی میں اساتذہ کی اہمیت غیر معمولی ہے، ذیل میں ہم انہیں اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں جن کا شیخ نورالدین نے حصول علم کے لئے انتخاب کیا۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ گلستاں سات روز میں علی اختلاف الاقوال والدین سے پڑھ لی تھی، اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی تک کی جو بھی رائج ومتداول تعلیم ہوگی، وہ گھر میں مکمل کر لی تھی، دس سال کی عمر میں حفظ قرآن کی سعادت سے مشرف ہوئے، اس کے بعد اکثر علوم ظاہری آپ نے احمد بن سلیمان کردی سے حاصل کئے، قراءت وحدیث آپ نے سید محمد ابوالمجد محبوب عالم سے پڑھی، بعض حضرات نے آپ کے اساتذہ میں احمد بن آخوند اور مولانا سلیمان کا ذکر بھی کیا ہے، بندہ کے خیال میں ان دوناموں کا ذکر تسامح ہے، چونکہ آپ کے اساتذہ میں علامہ کردی کا نام آخوند احمد بن سلیمان کردی لکھا ہے تو کچھ حضرات نے خطاءً اس کے دونام بنادیئے اور احمد بن سلیمان کردی تیسرا نام، اس طرح ایک ہی نام سے تین نام

وجود میں آ گئے۔

آپ نے علوم باطنیہ اور تصوف کس سے حاصل کئے؟اس میں سوانح نگاروں نے دونام ذکر کئے ہیں: (۱)احمد بن سلیمان کردی (۲) سید محمد ابوالمجد محبوب عالم۔لیکن ڈاکٹر باقر علی صاحب ترمذی نے ان دونوں ہی کو علوم باطنیہ میں بھی آپ کے استاذ بتلائے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: آپ نے تصوف کے اسرار آخوند احمد بن سلیمان الکرد سے حاصل کئے تھے، اور سید محمد ابو المجد محبوب عالم کے روحانی خلیفہ بنے تھے جو شاہ عالم ثانی کہلاتے تھے۔

آپ کے اساتذۂ کرام کے مختصر حالات:

معلم کا درجہ بہت بلند ہے، وہ طلبہ کا روحانی باپ اور ملت کا معمار ہے، آئندہ کی پود کی شخصیت سازی اس کے ذمہ ہوتی ہے، مستقبل کے شہریوں کا بننے بگڑنے کا انحصار کافی حد تک اس کی کوششوں اور تربیت پر ہے، اسی لئے وہ طلبہ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو پروان چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی فطری صلاحیتوں کو نشونما دینے کی بے حد سعی کرتے ہیں، ان مجموعی کوششوں کے بعد افراد سازی ہوتی ہے۔

چونکہ علامہ نورالدین صدیقی کی شخصیت سازی میں جن اساتذہ کا اہم کردار رہا؛ ذیل میں ان ماہر اساتذہ کے مختصر حالات، خصوصا علمی شخصیت کو اجاگر کیا جاتا ہے تاکہ علامہ نورالدین کی شخصیت کو پہچاننے میں سہولت رہے۔

عالم کبیر احمد بن سلیمان کردی کے مختصر علمی حالات:

ولادت:

آپ کردی الاصل تھے لیکن آپ کی ولادت احمد آباد میں ہوئی، مولانا نورالدین

احمد آبادی- جن کے حالات قلمبند کئے جارہے ہیں- سے اہل علم حضرات واقف ہیں، یہ ۱۰۶۰ یا ۱۰۶۳ھ میں پیدا ہوئے جیسا کہ اوپر آچکا، اور ۱۱۵۵ھ میں ۹۵ سال یا ۹۲ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے، مولانا سلیمان کرد- جو احمد بن سلیمان کردی کے والد محترم ہیں-تقریبا ۱۰۱۸ھ میں احمد آباد آچکے تھے، اس لئے مولانا احمد کی پیدائش ۱۰۳۰ھ سے پہلے ہوئی ہوگی، اور مولانا نورالدین نے جب ان سے پڑھنا شروع کیا تب مولانا احمد کردی کی عمر ۳۰-۳۵ سال کی ہوگی. واللہ اعلم۔

تصنیفات: آپ کی تصنیفات بہت زیادہ ہے۔

چونکہ آپ کو ریاضی میں گہری دلچسپی تھی جس کا اندازہ آپ کی بیاض سے ہوتا ہے جس میں آپ نے بہت سارے رسالے ریاضی سے متعلق نقل کئے تھے، تقریبا یہ ۹ رسالے ہیں جو پروفیسر محبوب حسین عباسی نے ''عربی زبان وادب کی ترقی میں گجرات کے دانشوروں کا حصہ'' کے ہامش میں ذکر کئے ہیں۔

آپ کی تصنیفات میں سے کچھ درج ذیل ہے:

آپ کی سب سے اہم تالیف ''فیوض القدس'' ہے جس کا موضوع علم کلام ہے اور جو سنہ ۱۰۹۱ھ (سنہ ۱۶۸۰ء) میں لکھی گئی تھی، یہ چودہ ابواب میں منقسم ہے جو مزید مبحث، مقصد اور منہج میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ مصنف نے مشہور دانشور الدوانی کے بیانات کی تصدیق یا تنقید کی ہے، ساتھ ہی ساتھ علم کلام سے متعلق کئی سابقہ کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ یہ کتاب اس وجہ سے بھی قابل توجہ ہے کہ وہ گجرات میں علم کلام کے موضوع پر لکھی گئی، چند طبع زاد تصانیف میں سے ایک ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کلکتہ میں ہے، جبکہ صاف خط میں لکھا گیا ایک اور مخطوطہ

بمبئی (جاملی محلّہ لائبریری، کتاب نمبر:۴۹۷) میں محفوظ ہے۔

شرح الضابطة :

یہ الضابطۃ کے نام سے پہچانی جانے والی تفتازانی کی تالیف تہذیب المنطق کی ایک فصل کی شرح ہے،اس کے مقدمہ میں مصنفؒ لکھتے ہیں کہ ایک دوست ابوالسعادت عبدالعلی کی استدعا پر انہوں نے یہ شرح لکھی تھی،اس کے طویل ترقیمہ میں مصنف کا نام موجود ہے،لندن میں اس کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں۔

حضرت پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں ''شرح ضابطہ تہذیب'' کے نام سے اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے؛ وضاحتی فہرست جلد:۳،مخطوطہ نمبر 999-VII۔

حاشيه على شرح المقاصد:

ایجی کی المواقف پر تفتازانی کی شرح کا یہ حاشیہ ہے۔

اس حاشیہ پر بعد میں شیخ عبدالعزیز نے بھی حاشیہ لکھا تھا،مولانا احمد نے (شیخ عبدالعزیز کی) شرح ضائع نہ ہوجائے اس لئے اسے اپنے حاشیہ میں شامل کرلیا تھا،اور علامات (کے ذریعہ) انہیں الگ کیا تھا۔اس کا قلمی نسخہ احمد آباد میں محفوظ ہے،حضرت پیر محمد شاہ لائبریری،احمد آباد،وضاحتی فہرست،جلد:ا،مخطوطہ نمبر ۵۱۴،مصنف کے خط میں اور مکمل ہے؛ جبکہ مخطوطہ نمبر ۵۱۳ ناقص ہے،مولانا عبدالعزیز کی تالیف: حاشیہ شرح مقاصد کا بھی الگ مخطوطہ محفوظ ہے،نمبر ۵۴۷۔

حاشيه علىٰ باب المحلّٰى :

یہ ابن الحزم کی تالیف المحلّٰی کی ''قانون وراثت'' سے متعلق ایک فصل پر حاشیہ

ہے،اس کا قلمی نسخہ لندن میں محفوظ ہے۔Loth Bk No.1043 XIII

حاشیہ تشریح الافلاک:

علم الافلاک (Astronomy) پر بہاء الدین آملی کی مشہور تالیف ''تشریح الافلاک'' ہے،مولانا احمد بن سلیمان نے اسی رسالہ پر یہ حاشیہ تصنیف کیا ہے،اس حاشیہ کا قلمی نسخہ لنڈن میں محفوظ ہے۔Loth Bk no. 1043 VI

یہاں پر قرآن کریم کی آیت: **یوم یأتی بعض آیات ربك لاینفع نفسا ایمانها** (سورہ انعام:۱۵۸) کی،مولانا احمد کی جزوی تفسیر کا ذکر ضرور کرنا چاہئے،مصنف کا مقصد،معتزلہ فرقے والوں کے اس نظریہ کی تردید کرنا ہے جو انہوں نے اس آیت سے استخراج کیا ہے۔

مولانا احمد نے دو تفسیریں لکھی ہیں اور ان کے قلمی نسخے احمد آباد میں حضرت پیر محمد شاہ لائبریری میں محفوظ ہیں۔

حاشیہ علی شرح العضدی :

مصنف نے (علم الکلام پر ابن الحاجب کی تالیف مختصر الاصول کی شرح العضدی)پر تفتازانی اور سید شریف جرجانی کی شرحیں پڑھتے وقت یہ حاشیہ لکھا تھا،بعد میں اسے ترتیب سے جمع کیا گیا۔اس مفید کتاب کا قلمی نسخہ احمد آباد میں محفوظ ہے۔ (عربی زبان وادب کی ترقی میں:ص:۲۵۹تا۲۶۱)

کتب خانہ پیر محمد شاہ کی کتابوں پر مولانا احمد کے نوٹ اور حواشی:

ڈاکٹر زبیر قریشی صاحب لکھتے ہیں: کتب خانہ پیر محمد شاہ میں خود مولانا احمد کا خط

کئی کتابوں میں محفوظ ہے،ایک نسخہ پر وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"نقلت هذه المطالب مما قابلت بالسماع فی درس الاستاد المشفق الكامل المحقق الشيخ شريف سلمه الله تعالى الى يوم القيامة على رؤوس المستفيدين وقت قراءة الاخ المكرم مولانا عبدالمفتاح ١٠٦٩ھ".

گویا ۱۰۶۹ھ تک محمد شریف صاحب بقید حیات تھے، غالباً یہ وہی عبدالفتاح ہیں جو عبدالفتاح عسکری کے نام سے مشہور ہیں اوران کی مثنوی مولانا روم کی شرح درمکنون کے مخطوطات اکثر جگہ موجود ہیں۔

۱۰۸۴ھ میں انہوں نے فریضہ حج ادا کیا، کتب خانہ پیر محمد شاہ میں ایک مخطوطہ ہے "الکواکب الدراری للقسطلانی" اس پر مولانا احمد نے اپنے خط میں یہ نوٹ لکھا ہے:

" قد استسعد بتملك هذا الكتاب الشريف بالشراء الصحيح الشرعى من محمد الشامى ساكن الصفا مكة المشرفة يوم الجمعة الثالث من شهر الحرام المسلوك فی سنة اربع وثمانين والف اقل خليقة الله المنان احمد بن سليمن كان الله لهما فی كل حين ومكان بمبلغ خمسين فرشًا ريالاً".

ساکن صفا محمد شامی سے انہوں نے مکہ مُشرفہ میں یہ نسخہ بروز جمعہ ۳رشہر حرام ۱۰۸۴ھ میں ۵۰فروش ریال میں خریدا تھا۔

ایک اورمخطوط اسی کتب خانہ میں شرح صحیح مسلم للنووی ہے، یہ بھی انہوں نے اسی سال دوسرے روزعبداللہ نامی کسی شخص سے خریدا تھا،اس پر بھی انہوں نے اپنے خط میں لکھا ہے:

”قـد استسعد بتملك هذا الكتاب الشريف بالشراء الصحيح الشرعی فـی مكة المشرفة من عبد الله العنانی ساكن الصفا يوم السبت رابع شهر المحرم الـحرام المسلوك فی سنة اربع وثمانين والف اضعف عباد الله الملك المنان اقل الـخـليـقة احمد بن سليمان كان الله لهما كل حين ومكان بمبلغ خمسين فرشا ريالا“.

کتب خانہ پیر محمد شاہؒ میں جام جہاں نما کے دو مخطوطات ہیں جن کے حاشیہ میں کاتب نے ملا احمد کے اقتباسات بکثرت نقل کئے ہیں۔

کتب خانہ پیر محمد شاہؒ میں ’’مبحث ما انا قلت‘‘ کا ایک مخطوطہ ہے، جس کے کاتب بارہویں صدی کے ایک بزرگ ولی اللہ ہیں، کاتب نے قوشجی ،شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی ،ملا عبدالغفور ،میر محمد ہاشم اور مولانا احمد سے منسوب اقتباسات حاشیہ میں جگہ جگہ نقل کئے ہیں۔

کتب خانہ پیر محمد شاہ میں دوانی کی اخلاق جلالی کا ایک نسخہ ہے، اس کے حاشیہ میں ملا احمد کی تعلیقات ہیں، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ نے اپنے فرزند عبداللہ کے لئے شرح مواقف پر تعلیقات لکھی ہیں، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ پیر محمد شاہؒ میں ہے، کاتب نے اس کے حاشیہ میں مولانا احمد کے نوٹس بھی شامل کئے ہیں، ملا عبدالحکیم مولانا احمد رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر تھے۔

کتب خانہ پیر محمد شاہ میں ایک مخطوطہ ہے ’’حاشیہ عبدالحکیم علی المقدمات الاربعۃ‘‘ مذکور ولی اللہ نے اس کی کتابت ۱۱۱۷ھ میں کی ہے، یعنی مولانا احمد کے انتقال کے دس پندرہ

سال کا زمانہ ہے، اس میں بھی حاشیہ میں کاتب نے مولانا احمد کی آراء سے استفادہ کیا ہے۔

کتب خانہ پیر محمد شاہ میں شیخ رحمۃ اللہ سندھی کی ''لباب المناسک'' کا ایک نسخہ ہے، جس کی سن کتابت ۱۱۱۴ھ ہے، اس کے آخر میں کاتب نے کعبہ کی تعمیر، تعمیر نو اور مختلف ادوار میں توسیع کی وہ تاریخ لکھی ہے جو اس کو کسی جگہ خود مولانا احمد کے خط میں مل گئی تھی، بہت ممکن ہے ۱۰۸۴ھ میں فریضۂ حج کے ساتھ ایسا کوئی رسالہ لکھا ہو، واللہ اعلم۔

اس رسالہ کی کتابت کے وقت مولانا احمد کی وفات کو صرف چھ سال گذرے تھے، کتب خانہ پیر محمد شاہ میں شرح مقاصد للمولی تفتازانی کا ایک نسخہ ہے، کاتب نے جگہ جگہ اس کے حاشیہ میں مولانا احمد سے منسوب حواشی کا اضافہ کیا ہے۔

کتب خانہ پیر محمد شاہ میں ''شرح حکمۃ العین'' کا ایک نسخہ ہے، یہ نسخہ مولانا احمد کی ملکیت میں رہ چکا ہے، ان کے پوتے، محمد رضا نے اس نسخہ کو ۱۱۴۹ھ میں خریدا تھا، اس کے حاشیہ میں مولانا احمد اور ان کے موصوف پوتے کے حواشی ہیں۔

مدرسہ کنز المرغوب پٹن میں شاہ وجیہ الدین علوی کی "الحقیقة المحمدية" کا ایک نسخہ ہے، جس کے حاشیہ میں مولانا احمد سے منسوب اقتباسات درج ہیں۔

کتب خانہ پیر محمد شاہؒ میں حاشیہ کشاف کا ایک نسخہ ہے، اس کے حاشیہ میں بعض جگہ مولانا احمد سے منسوب اقتباسات واقوال درج ہیں، اسی کتب خانہ میں ایک کتاب ہے، جس میں چار مخطوطات ایک ساتھ مجلد ہیں، اس میں مولانا خیالی کے حاشیہ کے خطبہ پر کاتب نے فضلائے عصر کے خیالات بھی درج کئے ہیں، اس میں کاتب صاحب لکھتے ہیں:

" قمت خطبة هذه الحاشية وتحقيق خطبة حاشية مولانا خيالى۔

اعلم ان المحشی المدقق فی هذه الحاشية عبارة عن مولانا قل احمد ،والفاضل عن مولانا قرة كمال، وبعض الافاضل عن مولانا عصام وبعض الفضلاء عن مولانا احمد بن سُليمان سلمه الله تعالی .

یعنی اس حاشیہ میں جہاں محشی مدقق لکھا ہے اس سے مراد مولانا قل احمد ہیں اور فاضل سے مراد مولانا قرۃ کمال ہیں، بعض الافاضل سے مراد مولانا عصام ہیں، اور بعض الفضلاء سے مراد مولانا احمد بن سلیمان ہیں، سلمہ اللہ تعالی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نسخہ کی کتابت مولانا احمد کی زندگی میں ہوئی ہے، افسوس کہ سن کتابت درج نہیں، لیکن اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ معاصرین انہیں نامور علماء اور فضلاء کا ہم پایہ سمجھتے تھے۔

اسی کتب خانہ میں "كشف الغين عن الحكمة العين " شرح ہدایۃ الحکمۃ اور خلاصۂ سیرۃ سید البشر ایسے نسخہ ہیں جن کے حاشیہ میں مولانا احمد سے منسوب اقتباسات درج ہیں۔

ابو محمد علی بن حزم الاندلسی نے فقہ میں المحلی نام کی ایک کتاب ۳۰ رجلدوں میں لکھی ،مصنف کا سن وفات ۴۵۶ھ بتایا جاتا ہے، بعض دوستوں کے اصرار پر مولانا احمد نے اس کے ایک باب: ''باب العول'' پر شرح لکھی ہے، کتب خانہ پیر محمد شاہ میں نسخہ خود مولانا احمد کے خط میں ہے اور اس پر محمد ابوبکر کی مہر ہے، صحابہ اور فقہاء میں اس مسئلہ پر اختلاف ہے، بعض اس کے قائل ہیں، بعض حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرح اس کی نفی کرتے ہیں ،مصنفؒ نے ابن عباسؓ کے مسلک کو اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

" فيقول العبد الضعيف احمد بن سليمان كان الله لهما فی كل حال

ومکان: ھذہ مقالة من الکتاب المسمیٰ المحلی للفاضل الفقیه البارع المحدث ابی محمد علی ابن حزم الاندلسی اوردھا التحقیق ....فی اختلاف فی الامة من مسئلة العول ثم شرحتھا لاستدعاء بعض الخلان وسمیته.... نہیں پڑھا گیا فذھب جمھور الصحابة والفقھاء رضوان الله تعالی علیھم اجمعین الی ان العول فی السھام ثابت. وذھب ابن عباس رضی الله تعالی عنھما الی نفیه، واختار المصنف ھذہ المذھب.

کتب خانہ پیر محمد شاہ میں علم کلام پر ایک نسخہ ہے، اس میں مولانا احمد کی یہ تحریر ہے جو اہم ہے:

" فیقول العبد الضعیف احقر الخلیقة احمد بن سلیمان کان الله لھما فی کل حین ومکان ان اشرح المختصر الاُصول للقاضی المحقق عضد الملة والدین قد انفجر منه ینابیع التحقیق وعیون التدقیق استحق ان یقال فی حقه لایدرك الواصف خصائصه دون شرح الشرح للعلامة التفتازانی والحاشیة السید السند قد بلغا فی بیان مشکلاته واظھار اسرارہ غایة الامد .

وکنت علقت علیھما فی سالف الزمان حواشی متفرقات لم یخطر یبالی ھذہ الآوان ان اجمعھا لتصون الثقات واجتھدت فی جمعھا."

یعنی عضدالدین قاضی کی مختصر اصول دراصل تحقیق وتدقیق کا سرچشمہ ہے، اگر یہ کہا جائے کہ کوئی تعریف کرنے والا ان کے خصائص کا ادراک کما حقہٗ نہیں رکھتا تو حق بجانب ہوگا، ہاں تفتازانی اور سید شریف اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

کتب خانہ پیر محمد شاہ میں تفتازانی کی شرح مقاصد کا ایک نسخہ ہے، اس پر مولانا احمد کی یہ تحریر موجود ہے۔

"فیقول العبد الضعیف احمد بن سلیمان کان الله لهما فی کل حین ومکان: هذه حواشی متعلقة بالالهیات والسمعیات من شرح المقاصد للمُحقق العالم الربانی مولانا سعد الدین تفتازانی اجزل الله ثوابه واحسن مآبه کانت متفرقة فاردت جمعها تهذیبا بقدر الامکان تبصرة للناظرین وتذکرة للاخوان . ثم استاذ اساتذنا وشیخ شیوخنا قدوة العلماء واسوة العرفاء مَولانا عبدالعزیز اعز الله تعالی بلقائه یوم الجزاء علق علیها حواشی موضحة لمطالبها و کاشفة لمغلقاتها الاانه لم یبق تدوینها اجمعها باسرها فبقیت مکتوبة علی اطراف الکتاب ولهذا السبب ضاع بعضها وقد نقلت فی بعض المواضع عنها واشرت الی ما سنح فیها"۔

یعنی میرے یہ حواشی مقاصد تفتازانی کے الٰہیات وسمعیات سے متعلق ہیں جو متفرق ومنتشر تھے، میں نے انہیں حتی الامکان جمع کرنا چاہا، اس کے علاوہ استاذ الاساتذہ مولانا عبدالعزیز صاحب نے بھی ان پر حواشی لکھے یا تعلیقات تحریر فرمائے تھے، جو شرح مقاصد کے مطالب کی وضاحت اور اس کے مشکلات کے حل میں ہیں، ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں؛ لیکن ان سارے کے سارے حواشی وتعلیقات کی تدوین کا اتفاق نہ ہوا، مختلف کتابوں کے اوراق اور کناروں پر منتشر حالات میں لکھے ہوئے رہے، لہذا بعض تو ضائع ہوگئے ہیں، میں نے اپنے ان تعلیقات میں ان میں سے بعض نقل کئے ہیں اور ساتھ ہی مجھے جو سوجھا وہ درج کردیا۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مولانا احمد کی زندگی کا مقصد تھا کثرت مُطالعہ، مسلسل تفکر وتفحص، علماء پر نقد وتبصرہ، ان سے اختلاف یا اتفاق یا پھر ان کی تحقیقات پر اضافہ، ندرت مفاہیم وابتکار مطالب جو ان کے دل میں القاء ہوئے ہیں انہیں وہ فیوض ربانی گردانتے ہیں، حقیقی ملہم صواب کی اس نعمت کبریٰ پر وہ متشکر ہیں، نکات نادرہ کے متواتر انکشاف کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو محقق سمجھتے ہیں، اور تقلید سے حتی الامکان اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں، مختلف علوم وفنون میں علمائے کبار کی متداولہ کتب پر انہوں نے اس کثرت سے حواشی وتعلیقات لکھے ہیں کہ بعد کے لوگوں نے انہیں مروج علوم عقلیہ سمجھا، فارسی میں ان کی کوئی تصنیف اب تک نہیں ملی۔ علم کلام، عقائد، فقہ، منطق والٰہیات ان کے دلچسپی کے موضوع رہے، ان موضوعات پر عام طور پر مدارس میں عربی میں درس وتدریس ہوتی تھی؛ لہذا انہوں نے عربی کو اپنے اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا، حدیث میں اسماء رجال پر دو ضخیم جلدیں مرتب کیں۔ اور مکہ معظّمہ سے بھی حدیث شریف ہی کی کتابیں خریدیں، لہذا حدیث کی طرف بھی انہیں رغبت تھی، تفسیر میں ان کا ایک چھوٹا رسالہ عربی میں ملتا ہے۔ اور کشاف پر حاشیہ بھی انہوں نے لکھا مگر ایسی آیات پر جن کا تعلق کلام سے تھا، اخیر میں انہوں نے اپنے منتشر اور متفرق حواشی جمع کرنے کی کوشش کی مگر وہ سب ہم تک نہیں پہنچے، کاتبوں نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں میں ان سے منسوب تعلیقات کثرت سے نقل کئے ہیں، ان میں ولی اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو اخیر عمر کے ان کے معاصر تھے، متضاد فرقوں کے عقائد کا مطالعہ اور ان کی تردید پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا ہے، حالانکہ وہ ملک احمد بن پیر محمد فاروقی کے ہم عصر تھے، حج بھی انہوں نے ان کی طرح ۱۰۸۴ھ میں کیا، مگر کہیں انہوں نے روافض کے غلبہ کا

ذکرنہیں کیا۔ مولانا عبدالعزیز کے متفرق اوراق پر لکھے ہوئے حواشی وتعلیقات ضائع ہونے لگے تھے، یہ شکایت ملک احمد بن پیر محمد فاروقی کی طرح انہوں نے بھی کی، یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی کتاب کا مطالعہ کریں اوراس پر اپنے حواشی وتعلیقات نہ لکھیں، خود اپنی تالیف کا دوبارہ مطالعہ کرنے کا موقع ملتا تو وہ اس پر نظر ثانی کرتے تھے اوراپنے غور وخوض کی روشنی میں مزید اضافہ کرتے تھے جیسا کہ انہوں نے مختارالاختیار میں کیا، پیہم علمی تفکران کی فطرت ثانی بن گئی تھی۔

''مختارالاختیار'' ان کی ایک اہم تصنیف ہے، یہ عام طور پر ملتی نہیں، مگر حسن اتفاق سے مولانا احمد نے اپنی مشہور کتاب فیوض القدس کا ایک حصہ بنا کر اسے بیچ میں مکمل نقل کردیا ہے۔

اس فہرست کتب اور خلاصہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا احمد بن سلیمان وحید عصر تھے، تمام علوم مروجہ میں یدطولی رکھتے تھے، حاویٔ فروع واصول اور جامع منقول ومعقول تھے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اکثر علوم وفنون میں قلمی شاہکار چھوڑے ہیں، میرا مقصد بھی آپ کی علمی لیاقت کو واضح کرنا تھا، اس لئے اس پر تفصیلی کلام کیا ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں پر کیسا علمی رنگ چڑھایا ہوگا اور کیسے نقوش ثبت کئے ہوں گے؟

وفات:

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ صاحب نے مولانا احمد کا ذکر اپنی یاد ایام میں بھی کیا ہے اوراپنی عربی تصنیف ''نزہۃ الخواطر'' میں بھی، مگر دونوں جگہ موصوف سے مولانا احمد کی سن

وفات درج کرنے میں تسامح ہوئی ہے، یادایام میں لکھا ہے کہ مولانا احمد کی وفات ۱۰۸۷ھ میں ہوئی جو صریحاً غلط ہے، کیونکہ ۱۰۹۱ھ میں تو انہوں نے فیوض القدس تالیف کی، یادایام کے نئے ایڈیشن میں بھی یہی تاریخ درج ہے، نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے کہ مولانا احمد کی وفات ۱۰۹۲ھ میں ہوئی، لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ مولانا احمد کے شاگرد جلیل مولانا نورالدین گجراتی نے اپنے استاذ کی تاریخ یوں کہی ہیں: "شمعی کہ بود از انجمن علم گل شیدہ"

لہذا مولانا احمد کی وفات کا سن وہی تسلیم کیا جائے گا جو مندرجۂ بالا مصرع سے حاصل ہوتا ہے یعنی ۱۰۸۱ھ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سید محمد ابوالمجد محبوب عالم کے مختصر علمی حالات:

ولادت:

حضرت شاہیہ کے خاندان کے سید محمد ملقب بہ محبوب عالم کی ولادت ۲/ربیع الاول ۱۰۴۷ھ مطابق ۱۶۳۷ء کو احمد آباد میں ہوئی، آپ کا نسب نامہ حسب ذیل ہے:۔

محبوب عالم بن بدر عالم بن جلال مقصود عالم بن محمد مقبول عالم بن جلال ماہ عالم بن حسن بن عبدالغفور بن احمد بن راجو بن شاہ عالم۔

تعلیم اور ماحول:

آپ کے اساتذہ ،حصول علم اور گھریلو ماحول کے باب میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہ ہوسکی، سوانح نگاروں نے اس پر جو روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہے:

والد کی نگرانی میں تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے بعد آپ اعلی درجہ کے دانشور اور عارف بنے تھے، آپ کے خانوادے کے تمام حضرات کی طرح آپ کا تقوی بھی مشہور تھا،

حضرت شاہ عالم کے احفاد میں آپ بھی بڑے عالم حدیث وتفسیر ہوئے ہیں۔

تصنیفات:

سید محبوب عالم نے قرآن کریم کی عربی تفسیر لکھی تھی جو تفسیر جلالین کے طرز پر تھی؛ وہ اتنی مجمل تھی کہ جیسا کہ کہا گیا ہے، اس میں قرآن کریم جتنے ہی الفاظ تھے۔

آپ نے فارسی میں بھی تفسیر شاہی نامی تفسیر لکھی تھی، ان تفسیروں کے قلمی نسخے مفقود ہیں۔

سید محبوب عالم کی ان دونوں تفسیروں کا ذکر، ڈاکٹر سالم قدوائی نے اپنی اردو تالیف: ''ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں'' میں ص:۳۲۳ پر کیا ہے۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی ۱۹۷۳ء۔

نیز زبید احمد نے (ص:۲۴۳) پر رحمٰن علی کے تذکرۂ علماء ہند: ص۲۱۴ کے حوالے سے آپ کی عربی تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

آپ نے حدیث کے موضوع پر مشہور تالیف مشکاۃ المصابیح کی شرح "زینة النکات فی شرح المشکاة" بھی لکھی تھی۔ اس کا بھی قلمی نسخہ مفقود ہے۔ زبید احمد نے (ص:۲۵۷) پر رحمٰن علی کی تذکرہ علماء ہند: ص:۲۱۴ کے حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے۔

آپ کی دستیاب شدہ کتابوں میں سے ایک تهنية الاسلام بخير الكلام والاتمام (عربی میں) ہے۔ اس کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی تاریخ ہائے ولادت ووفات ہے، یہ حسب ذیل پانچ ابواب پر منقسم ہے:

(۱) فی بیان تاریخ مكة .

(۲) فی بیان تاریخ مولوده وبعض احواله .

(۳) فی بیان مکان ولادته.

(٤) فی بیان وفاته.

(٥) فی بیان عمل المولود .

تیسرے باب میں مولد النبی ﷺ کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی ازواج واولاد کا بھی ذکر ہے۔اس کے علاوہ آپ کے غزوات اور سرایا کا بھی ذکر ہے۔اس کا قلمی نسخہ بھروچ کے قاضی سید نورالدین کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے؛لیکن اب یہ علم دوست افراد نہ رہے اور کتابیں منتشر یا مفقود ہوگئی۔

آپ کی تالیف:" حکایات الاربعین الشاهیه " عربی میں ترجمہ ہے،آپ کے دادا سید محمد مقبول عالم کی فارسی تصنیف چہل حکایات شاہیہ کا۔آپ نے اپنے والد سید محمد جعفر بدر عالم کے ایماء پر یہ ترجمہ کیا تھا،حضرت شاہ عالم کی کرامات پر مبنی یہ کتاب اپنے وقت کے سماجی حالات پر روشنی ڈالتی ہے،اس طرح اس کی تاریخی اہمیت بھی ہے،اس میں چند غیر معروف علماء کے نام بھی ملتے ہیں،اور زبان ریختہ کے نمونے بھی شامل ہیں،اس عربی ترجمہ کا قلمی نسخہ بمبئی میں (جامع مسجد،نمبر ۱۳۱۷) محفوظ ہے۔(عربی زبان وادب کی ترقی میں گجرات کے دانشوروں کا حصہ:ص:۲۶۴)

وفات:

آپ کی وفات جمادی الثانی ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء میں ہوئی۔

چونکہ سابق الذکر دونوں بزرگوں کے شاگردوں میں شیخ نورالدین زیادہ مشہور

ہوئے ،جنہوں نے اپنے روشن کاموں سے قوم وملت کی دست گیری کی اور تصنیف وتالیف میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ،حتی کہ گجرات کے علمی افق کے ایک تابندہ ستارے بن گئے ،ان کی علمی وروحانی پرواز میں ان دونوں بزرگوں کی رہنمائی وتربیت کارفرما رہی ،اس لئے ان کے حالات زندگی اجمالاً اور علمی زندگی پر تفصیلا روشنی ڈالی گئی ،تاکہ شیخ نورالدین کی شخصیت پہچاننے میں آسانی رہے۔

شیخ نورالدین احمد آبادی کا بیعت وتزکیۂ نفس:

اوپر شیخ احمد کردی وسید محبوب عالم کے حالات میں اس کی بھی وضاحت آچکی ہے۔

تدریسی وانتظامی خدمات:

برصغیر ہی نہیں، عالم عرب اور عالم اسلام کی تاریخ علمائے دین ، طالبان علوم نبوت اور مدارس اسلامیہ کی تابناک خدمات اور عظیم الشان عطیات سے منور ہے،فکر اسلامی کی توسیع ، الحادی نظریات کے مقابلہ میں دین کا دفاع ،تہذیب اسلامی کی تشکیل واستحکام، معاشرہ کی ترقی وتعمیر اور منحرف رجحانات ورسوم کی اصلاح کے مختلف میدانوں میں مدارس اور علمائے اسلام کے کارنامے اظہر من الشّمس ہے۔

مدارس اسلامیہ تعلیمات کی نشر واشاعت کے مراکز ہیں، دین کے قلعے ہیں، یہ وہ ادارے ہیں جو طالبان علوم کی تعلیم وتربیت کے لئے قائم ہوتے ہیں، بلکہ ان پر معاشرہ کی اصلاح کا بھی بارگراں ہوتا ہے۔

مسلمانوں نے اپنے عہد میں مختلف قسم کے مدارس قائم کئے اور ہرفن کی تعلیم

وتدریس کی طرف انہوں نے توجہ کی ، ان میں سے ایک مدرسہ ہدایت بخش کا ذکر عنوان کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔

آپ کی علمی لیاقت کی وجہ سے ممکن ہے کہ آپ کی شہرت قلیل عرصہ میں ہوگئی ہو، اور پھر آپ کے شاگردوں کے سامنے آپ کی ٹھوس علمی لیاقت اور طلبہ کے دیگر حالات سلجھانے میں آپ کی انتظامی صلاحیت بھی نکھر کر آئی ہو، اس لئے آپ کی معاملہ فہمی اور انتظامی وانصرامی صلاحیتوں نیز اقران واعیان میں امتیازی مقام اور تبحر علمی وجامعیت کو بھانپ کر آپ کے ایک شاگرد-حضرت محمد بن طاہر پٹنی کے پر پوتے ، شیخ الاسلام ابن قاضی القضاۃ عبدالوہاب بھورا کے فرزند اور احمد آباد کے صدر صوبہ-محمد اکرم الدین شیخ الاسلام خان نے مدرسہ ہدایت بخش نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی ، دور دور آپ کی شہرت پھیل جانے کی وجہ سے اس ادارہ میں لوگوں کی آمد بھی شروع ہوگئی ، اور آپ ان آنے والوں کو درس دینے میں بیشتر وقت صرف کر دیتے تھے۔

علامہ عبدالحی صاحبؒ فرماتے ہیں: بـنـى له أكرم الدين الگجراتي مدرسة عـظيـمة بـأحـمدآباد وأنفق على بنائها مائة ألف وأربعاً وعشرين ألفاً من النقود، شـرع فـي بـنـائهـا سنة تسع ومائة وألف، فأرخ لها بعض العلماء من قوله تعالى بزيادة لفظ منه"هو لمسجد أسس على التقوى من أول يوم"، فرغ من بنائها سنة إحـدى عشـرة ومـائة وألف، فـأرخ لهـا بـعضهم من قوله: "مدرسة فيها الهدى للعالمين "، وأرصد لرواتب الطلبة قرى عديدة من الأرض الخراجية. (نزهة الخواطر :رقم الترجمة: ٧٤٣،ص:٤٠٤،ج:٦)

اس مدرسہ کی تعمیر ۱۱۰۹ھ میں شروع ہوئی، تکمیل ۱۱۱۱ھ میں ہوئی اور دیگر عمارات متعلقہ کی تعمیر بھی مکمل ہوئی، یہ تعمیر قاضی کا دھابا، محلّہ آسٹوڈیا احمد آباد میں ہوئی تھی، جس کی عمارت چند سال قبل تک اپنی اصل حالت میں موجود تھی، اس کی تعمیر میں ایک لاکھ ۲۴/ ہزار روپئے صرف ہوئے تھے، اسی مدرسہ میں شیخ نورالدین نے علمی شمع روشن کی تھی، جہاں دور دراز ممالک اور علاقوں سے طالبان علم استفادہ کے لئے آئے تھے، ان طلبہ کے وظائف اور اخراجات کے لئے پرگنہ سانولی اور موضع پھٹہ عطا کیا گیا تھا، اس کے علاوہ موضع میٹھ ضلع کڑی اور ناسن ضلع پٹن اور دو- دو روپیہ یومیہ لنگر کا خرچ طلبہ کے مصارف کے لئے مقرر ہوا۔

لیکن آج سے کئی سال پہلے سے اس عظیم الشان مدرسہ کی صورت حال یہ ہوئی کہ اوقاف سے متعلق تو کچھ معلومات ہی نہیں ہے، اور مدرسہ کو قاضیٔ احمد آباد نے کرایہ پر دیکر عمارت کی ایسی حالت بدل دی کہ بہ مشکل پتہ چلے کہ کسی زمانہ میں یہ عالیشان مدرسہ تھا، اس مدرسہ کے قیام اور اعلی انتظام نے شاہ وجیہ الدین صاحب علوی کے مدرسہ کو زوال پہنچایا تھا اور آج اسی مدرسہ کا زوال کر دیا گیا ہے۔

۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء تک شیخ الاسلام خود ان کے ناظم رہے، آپ کے بعد آپ کے لڑکوں اور پوتوں کی زیر نگرانی یہ مدرسہ چلتا رہا۔

اس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ منطق، فلسفہ اور ریاضی جیسے علوم کی بھی اعلی پیمانے پر تعلیم ہوتی تھی، اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا، ۱۱۷۴ھ تک یہ ادارہ برابر قائم رہا، پھر تباہی کی زد میں آ گیا جو کمرے بنا کر لوگوں کو کرایہ پر دیئے گئے، وہاں دیگر تعمیرات میں ایک مسجد کی تعمیر بھی ہوئی تھی، یہ مسجد تو اہل محلّہ کے قبضہ میں ہے، البتہ بورڈنگ

اور مدرسہ اب رہائشی کمرے بن گئے۔ (مشائخ احمد آباد:۱/۱۸۸)

مولانا ابوظفر ندوی مرحوم اس پر تفصیلی گفتگو فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اس مدرسہ کے سالانہ اخراجات کا کوئی بندوبست نہیں تھا، مدرسین اور طلبہ بے حد پریشان رہتے تھے، ۱۱۱۲ھ میں طلبہ نے شیخ غلام محمد منصب دار شاہی کے توسط سے ایک درخواست بادشاہ کی خدمت میں ارسال کی، اس درخواست کی نقل میرے عزیز اور لائق دوست حکیم بہاء الدین صدیقی (ہردوئی) کے پاس موجود ہے، شیخ غلام محمد ان ہی کے جدامجد تھے، جو عالمگیری منصب دار تھے، اور شاہزادہ اعظم شاہ صوبہ دار احمد آباد (۱۱۱۳ھ) کی ملازمت میں رہتے تھے، یہ صاف طور پر پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس عہدہ پر تھے اور ان کا کیا کام تھا ؛لیکن ان کے وارثوں کے پاس جو کتب اور فرامین وغیرہ حوادث زمانہ سے بچ گئے ہیں ان میں زیادہ تر ایسی درخواستیں ہیں جن کو بادشاہ تک پہنچانے کی ان سے التجا کی گئی ہے، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ درباری پیش کار تھے، ۱۱۱۶ھ میں احمد آباد میں ان کا انتقال ہوا اور جنازہ احمد آباد سے ان کے وطن گوپامئو (ضلع ہردوئی) میں لایا گیا اور وہیں دفن کئے گئے، پھر ان کے لڑکے غلام حسن کے پوتے غلام نبی سرکاری ملازمت میں آئے۔

ان ہی فرامین اور خطوط میں ایک نقل مدرسہ ہدایت بخش کے طلبہ کی بھی ہے، جو اس وقت میرے پیش نظر ہے اور اسی کی مدد سے مندرجہ ذیل سطور کا اضافہ کرتا ہوں، جس کے لئے میں شیخ غلام محمد کے پوتے محمد بہاء الدین گوپامئوی کا شکر گزار ہوں۔

اس وقت اس مدرسہ میں سات ماہر فن اساتذہ تعلیم دیتے تھے، جن کے نام یہ ہیں: (۱) ملا محمد حسین (۲) ملا شیخ محمد (۳) سید ہاشم (۴) سید احمد (۵) ملا عبدالنبی (۶) شیخ

اللہ بخش اور (۷) شیخ نورالدین استاذ کل کے شاگرد رشید مولانا شیخ فرید گجراتی، لیکن بدقسمتی سے درخواست دینے سے پہلے ہی ان کی وفات ہوگئی، خود شیخ نورالدین استاذ کل اس کے افسراعلی تھے، ان معلموں نے طلبہ کی درخواست پر اپنی اپنی سفارشیں بھی لکھیں ہیں۔

ان میں سے ایک نے لکھا ہے: هذه المدرسة الشامخة البناء مشهونة بالمتحصلين والعلماء وهم مفتقرون الى كرم السلطان المزنى، للفضلاء. دوسرے نے لکھا ہے: هذه المدرسة الراسخة الاساس معمورة بتكميل الناس واهلها محتاجون الى تفضل الخليفة الخارج اوصافه عن القياس. ایک صاحب نے لکھا ہے: هذه المدرسة الرفيعة الشان معمورة من الطلبة واهل العرفان، وهم محتاجون الى تفضل خليفة الرحمان. ایک مدرس نے تحریر کیا ہے: هذه المدرسة العلية موطن لاهل العلوم الدينية والمعارف اليقينية وهم فرقة ضعيفة الاحوال، شاغلين عن المعاش لشغلهم بامور المعاد، احوجين تفضل خليفة الله. ملا عبدالنبی صاحب تحریر فرماتے ہیں: هذه المدرسة رفيعة القدر مسكونة لمساكين الفضلاء وطلاب العصر المفتقرة الى اعانة الخليفة الساعى فى اعلاء كلمة الله الشريعة. شیخ احمد لکھتے ہیں: هذه مدرسة منيفة مشحونة، لطلبة حفيفة وهم محتاجون الى التفضل من باب الخليفة الذى لايعنى البيان باوصاف الجليلة.

ان میں سے ہر شخص نے اپنے آپ کو علامہ نورالدین کا شاگرد اور مرید بتایا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، اور استاذ نے ان سب کو اسی مدرسہ میں معلم رکھ لیا اور یقیناً یہ اپنے تمام معاصرین میں درس و تدریس کے لحاظ سے ممتاز رہے ہوں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس عہد میں علمائے حق سفارش کرنے میں کس طرح اپنے

وقار کو قائم رکھتے تھے اور سوال سے پرہیز کرتے تھے، تیسری بات یہ دیکھنے کی ہے کہ ہر استاذ نے اپنی سفارش میں تین باتوں کا اظہار کیا ہے: (۱) مدرسہ بڑا ہے، (۲) طلبہ سے بھرا ہوا ہے (۳) بادشاہ کی توجہ اور عطیہ کے محتاج ہیں، چوتھی بات یہ ہے کہ ایک ہی مضمون کو مختلف اساتذہ نے مختلف عبارتوں میں ادا کیا ہے جوان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

درخواست چار غیر ملکی ممتاز طلبہ کی طرف سے لکھی گئی ہے، جن کے نام یہ ہیں: عبدالکریم قطبی رضوی بخاری، زین العابدین شیرازی، رحمت اللہ مغربی، محمد عوض تورانی، تاکہ بادشاہ پر ان پردیسیوں کے سبب سے خاص اثر پڑے اور اس کے اندر ان پر رحم کا جذبہ جلد سے جلد پیدا ہو، باقی طلبہ کے دستخط اصل درخواست کے مضمون اور اساتذہ کی سفارش کے بعد ہیں۔

ان لوگوں نے درخواست میں لکھا ہے کہ احمد آباد کے مدرسہ ہدایت بخش کے ہم طلبہ عرض پرداز ہیں کہ بادشاہ کے مبارک عہد میں صدر صوبہ شیخ محمد اکرام الدین کی سعی وکوشش سے مدرسہ، مسجد اور دارالاقامہ وغیرہ بڑے وسیع پیمانہ پر تعمیر ہوئے، جہاں طلبہ دینی علوم حاصل کرتے ہیں اور علماء روحانی مسائل حل کرتے ہیں، بڑے بڑے علماء مدرسہ سے فارغ ہوکر اسی مدرسہ میں تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، مدرسہ احمد آباد اور دوسرے مقامات کے طلبہ سے بھر گیا ہے، جن کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے، صدر مذکور ان تمام طلبہ کے اخراجات پورے نہیں کرسکتے، اس لئے ہم لوگ بڑی تنگی اور عسرت کے ساتھ گزارا کررہے ہیں، ہم لوگ امیدوار ہیں کہ کچھ بقدر کفاف طلبہ اور کچھ مدرسہ کے اخراجات کے لئے مرحمت ہو، تاکہ فراغ مالی کے ساتھ ہم لوگ کسب کمال میں مشغول رہیں اور دعائے

خیر کرتے رہیں، تاکہ ابدالآباد تک یہ مدرسہ جاری اور دین داری قائم رہے۔

کسی کتاب سے اس کا پتہ نہیں چل سکا کہ عرضداشت کا کیا نتیجہ نکلا، لیکن علی محمد خان نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس مدرسہ پر چند گاؤں وقف تھے، اسی کے ساتھ طرز بیان سے اس کا بھی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ صدر صوبہ شیخ الاسلام محمد اکرام الدین ہی کے وقف کئے ہوئے تھے، لیکن طلبہ کی درخواست دستیاب ہونے سے یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔

مرأۃ احمدی: جلد اول، صفحہ ۳۴۴ کلکتہ میں ہے کہ: ''بموجب التماس او بنابر اخراجات مدرسین وطلباء موضع سوندرہ معمولہ پرگنا ساولی وموضع میٹھ عملہ پرگنہ کڑی و دو روپیہ یومیہ جہت لنگر از جناب اقدس مرحمت شد''۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر صوبۂ شیخ الاسلام اکرام الدین خاں کی درخواست پر بادشاہ نے یہ گاؤں دیئے، حالاں کہ مرأۃ احمدی کے مصنف کی دونوں باتیں غلط ہیں، بلکہ طلبہ کی درخواست پر یہ مواضع دیئے گئے تھے، یہ ہوسکتا ہے کہ صدر صوبہ نے بھی اس کے لئے سفارش کی ہو۔

مرأۃ احمدی میں ہے کہ ''موضع للسوندری عملہ پرگنہ سانولی متعلقہ پرگنہ سرکار چانپانیر درخرچ مولود شریف حضرت رسالت پناہ ﷺ وموضع میٹھ عملہ پرگنہ کڑی درناس عملہ پرگنہ پٹن و دو روپیہ یومیہ لنگر برائے صرف مایحتاج طالب علمان مدرسہ مقرر وموظف شد''۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کل تین گاؤں وقف تھے، ایک میلاد مبارک کے اخراجات کے لئے اور دوسرا اور تیسرا طلبہ و مدرسہ کے اخراجات کے لئے اور دو روپیہ روزانہ

اس خانقاہ کے لنگر خانہ کے لئے جہاں مسافر روزانہ آتے جاتے تھے۔

طلبہ کی تعداد تقریباً ستر تھی، جو سب کے سب بورڈرس تھے، ڈے اسکالرس کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے، شہر سے آنے والے لڑکوں کی تعداد کس قدر تھی، اس کا علم نہیں، اگر پچاس بھی فرض کرلیں تو احمد آباد جیسے شہر کے لئے جہاں کئی بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے عربی مدارس موجود تھے، یہ تعداد کم نہیں ہے، ان طلبہ میں سب سے زیادہ سادات تھے، ان کے بعد شیوخ، غیر ملکیوں میں توران، ایران، شام اور عرب کے تھے، باقی سب گجراتی اور ہندوستانی تھے۔

افسوس ہے کہ مرہٹوی گردی میں یہ مدرسہ تباہ ہوگیا، مرأۃ احمدی کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس وقت (۱۱۷۰ھ) نہ مدرسہ ہے نہ طلبہ اور گاؤں پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ (مرأۃ احمدی: ۳۴۴/۱)

مولانا نورالدین اور مولانا ولی اللہ اپنے اپنے وقت میں اس مدرسہ کے مدرس اعلی اور نگراں رہے، اس کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، افسوس ہے کہ مرہٹوں کی لوٹ مار میں یہ مدرسہ تباہ ہوگیا، پھر معمولی طور پر اندرون شہر میں کالوپور کی اس مسجد میں جس کو آج کل ولی اللہ کی مسجد کہتے ہیں؛ ایک مدرسہ قائم کیا گیا، یہ بھی بند ہوگیا۔

کتب خانہ:

اس مدرسہ کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر فن کی کتابیں موجود تھیں، خواص کے ساتھ عوام بھی اس کتب خانہ سے فیض یاب ہوتے تھے، مرہٹہ گردی میں

مدرسہ وکتب خانہ دونوں برباد ہوگئے،اس کتب خانہ کی کچھ کتابیں، کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ میں منتقل کردی گئی تھیں،اور کچھ قاضی نورالدین وقاضی بھروچ، کے کتب خانہ میں۔

(مشائخ احمد آباد ص:۱۹۱)

پرفیسر زبیر قریشی صاحب لکھتے ہیں: مولانا نورالدین گجراتی (۱۱۵۵-۱۱۵۶ھ) گجرات کے متاخرین علماء میں صف اول کے عالم وفاضل گذرے ہیں، انہوں نے مدرسہ ہدایت بخش قائم کیا تھا، ان کا ایک بیش بہا کتب خانہ تھا،جس کا پیشتر حصہ مرور ایام کے ساتھ ضائع ہوگیا،تاہم چند مخطوطات زمانے کی دست برد سے بچ گئے ہیں۔ان کے صاحب زادے نظام الدین کو مغل شہنشاہ نے ۱۱۵۲ھ میں قاضی شہر کا عہدہ دیا تھا،تب سے یہ صدیقی الاصل خاندان قاضی کے نام سے مشہور ہے،اب انہیں کے خاندان کے محمد شعیب صاحب قاضی مقرر ہوئے ہیں۔(ماہنامہ ندائے حرم،Oct- 2014:ص:۳۴)

تلامذہ:

چونکہ گجرات میں طویل المدت تدریسی مشغلہ رکھنے والے چند گنے چنے افراد میں سے ایک آپ کی شخصیت ہے،اس لئے ممکن ہے کہ آپ سے کسب فیض کرنے والے طلبہ کی تعداد تو کئی سو کی ہوگی؛ لیکن آپ کے حالات میں صرف دو ہی شاگردوں کا نام مل سکا:(۱) سید سعد اللہ بلگرامی (۲) محمد اکرم الدین جن کا ذکر اوپر مدرسہ کی بناء میں آچکا (۳) ان کے علاوہ مدرسہ ہدایت بخش کے ضمن میں سفارشی خط کے تذکرہ میں مولانا ابوظفر ندوی مرحوم نے قیاس کرکے سات اساتذہ کو حضرت شیخ نورالدین صاحبؒ کے شاگرد شمار کئے ہیں۔

سوانح نگاروں کی طرف سے آپ کے شاگردوں کے بارے میں زیادہ روشنی نہ

ڈالے جانے کی وجہ سے اس سلسلہ کی زیادہ تفصیلات فراہم نہ کرسکا، اور اب کئی صدیوں کا عرصۂ دراز بھی گزر چکا ہے، اس لئے اس کی تفصیل دستیاب ہونا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

آپ کی گرانقدر علمی تصنیفات وتالیفات:

اس امت نے انسانوں کو کتنے علوم مدون کر کے فراہم کئے، اور پھر ہر فن میں تصنیفی، تالیفی، علمی کارنامے اور حیرت انگیز شاہکار چھوڑے، یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ جس نے زبردست علمی انقلاب پیدا کیا؛ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلامی چودہ سوسالہ تاریخ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ محنت علوم شرعیہ پر کی؛ کیوں کہ وہی اس کی زندگی کے لئے بہ منزلۂ رُوح کے ہے، اس لئے ہر زمانہ میں اس کو پڑھا، پڑھایا جاتا رہا اور اس پر تصنیف وتالیف کی جاتی رہی، چونکہ اس شرعی ودینی علم کے افادہ واستفادہ کی دو ہی صورتیں رائج رہی: نطق (تکلم) اور کتابت، ان دوصورتوں سے علم متعدی ہوتا رہا اور لوگ فائدہ اٹھاتے رہے۔

اس میں پہلی صورت نطق وتکلم کی تو اوپر گزر چکی، آپ نے مدرسہ ہدایت بخش قائم ہونے کے بعد اس میں طویل مدت تک درس وتدریس میں انہماک رکھا، اور اس سے پہلے بھی درس کی مجلس رہتی تھی، کیونکہ مدرسہ تعمیر کرنے والے شاگرد ہیں، توانہوں نے یقیناً مدرسہ کی بناء سے پہلے ہی پڑھا، اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے مدرسہ کی بناء سے پہلے ہی تدریسی مشغلہ قائم کرلیا تھا۔

دوسرا طریقہ کتابت یعنی تصنیفات وتالیفات کا ہے اور درج ذیل سطور میں اسی کی وضاحت کرنی ہے۔

مرزا بسم اللہ بیگ صاحب مآثر الکرام کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''تصانیف در ہر علم دارند واکثر کتب شرح وحواشی دارند'' مزید لکھتے ہیں: اکثر التصانیف تھے، ایک سوستر کتابیں تصنیف کیں۔ صاحب مآثر الکرام لکھتے ہیں: علامہ زماں ویگانۂ اقران است، در عین عصر مثل او کم گزشتہ۔

انہوں نے یومیہ معمولات، تدریسی مشغلہ، انتظامی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی، اکابر اسلاف کی کتابوں پر حاشیے اور ان کی شروحات پر قلم اٹھایا اور طبع زاد تصنیفات چھوڑیں۔

آپ کی تصنیفات کی اجمالی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) نورالقاری شرح صحیح البخاری (حدیث)

مولانا ابوظفر ندوی مرحوم فرماتے ہیں: بخاری شریف کی شرح ہے جو نایاب ہے، البتہ ڈاکٹر باقر علی صاحب ترمذی لکھتے ہیں: اس شرح کا قلمی نسخہ بھروچ کے قاضی کے خانگی کتب خانہ میں محفوظ تھا، لیکن اب ریاست حیدر آباد نے اسے آصفیہ لائبریری کے لئے حاصل کرلیا ہے۔

(۲) اصول الحدیث (حدیث)

اس کا قلمی نسخہ آپ کے خاندانی کتب خانہ احمد آباد میں محفوظ ہے، اس کتب خانہ کی کچھ تفصیلات اور مخطوطات کے آثار باقیات کے بارے میں تفصیلات ''کتب خانہ'' کے زیر عنوان ذکر کی جاچکی ہے۔

(۳) اربعین (حدیث)

یہ نسخہ بھی خاندانی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

(٤) التفسير النوراني للسبع المثاني (تفسير)

یہ سورۂ فاتحہ کی مفصل شرح ہے، اسے صحیفوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے صحیفہ میں مقدمہ اور سات باب ہے، مقدمہ الترجمہ والربط پر مشتمل ہے، اس کے بعد نظم القرآن کا بیان ہے، آخر میں شرح ہے، اس مبسوط شرح کے ۲۰۰/ اوراق ہیں، اس کا قلمی نسخہ پیر محمد شاہ لائبریری میں اس وقت موجود نہیں ہے، البتہ کتاب خانہ عالیہ چشتیہ احمد آباد میں محفوظ ہے۔

(٥) حاشية على تفسير البيضاوی (تفسير)

کچھ لوگوں نے یہی نام لکھا ہے، جبکہ سید باقر علی ترمذی صاحب نے اس کا نام اس طرح ذکر کیا ہے: حاشية على اوائل البيضاوی اور پھر لکھا ہے: یہ انوار التنزیل کے ابتدائی ابواب کی شرح پر منحصر ہے۔

(٦) حاشية على التلويح (اصول فقه)

(٧) حاشية على شرح المطالع

سراج محمد ارموی کی مطالع الانوار پر قطب الدین محمد رازی کی شرح پر حاشیہ ہے۔

(٨) الحاشية القويمة على الحاشية القديمة (علم كلام)

طوسی کی تجرید العقائد پر خوشجی کی شرح المواقف پر حاشیہ ہے۔

(٩) الحاشية على شرح المواقف

الایجی کی المواقف پر سید شریف جرجانی کی شرح المواقف پر حاشیہ ہے۔

(۱۰) حل المعاقد لحاشية شرح المقاصد (علم كلام)

تفتازانی کی المقاصد کی شرح پر حواشی کے مشکل مقامات کا حل ہے۔

(۱۱) طريقة الامم فی شرح فصوص الحكم (تصوف)

تصوف کے موضوع پر مصنف نے ابن العربی کی فصوص الحکم کی شرح لکھی ہے۔

(۱۲) شرح تهذيب المنطق (منطق)

(۱۳) التفسير الربانی (تفسير)

یہ سورۂ بقرہ کی تفسیر ہے، اس مبسوط میں تیس ہزار سطور ہے، مرزا بسم اللہ بیگ لکھتے ہیں: ان میں ۱۲۰۰/ابیات کی تفسیر سورۂ فاتحہ اور ۶۰۰۰/ابیات تفسیر سورۂ الٓمٓ بھی شامل ہے۔

(۱٤) حاشية علی شرح الوقاية (فقه)

(۱۵) المعوّل حاشية علی المطول

معانی و بیان کے موضوع پر التفتازانی کی المطول کی شرح ہے۔

(۱٦) حاشية علی شرح الجامی

بعضوں نے اس کا نام "حاشية علی ملا" لکھا ہے، جامی کی الفوائد الضیائیہ پر حاشیہ ہے۔

(۱۷) حاشية المنهل

نجم الدین علی القزوینی سے متعلق تصنیف الرسالات الشمسية پر حاشیہ ہے۔

(۱۸) رسالۂ الھامیہ (تصوف)

یہ رسالہ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں ۱۳۱۷ نمبر پر موجود ہے، اس کا خط نسخ ونستعلیق ہے، اس کی زبان عربی وفارسی ہے۔

یہ رسالہ روضات شاہیہ بدریہ مسمیٰ بہ تحقیقات نجباء پر مبنی ہے؛ لہذا سید جعفر بدر عالم کے مذکورہ رسالہ کے ساتھ اس کا موازنہ مقابلہ نہایت ضروری ہے، تب ہی اس پر زیادہ روشنی پڑ سکتی ہے، شروع میں اثبات واجبات الوجود کا ذکر ہے، حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے نکاح کا اور اہل بیت کا ذکر ہے، مناقب حضرت علی کرم اللہ وجہہ ور پیر ومرشد کی ضرورت کا ذکر ہے، مرشد میں بیس خواص کا ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ مرشد کہلانے کا اہل سمجھا جائے، کچھ دعائیں ہیں جو کفن پر لکھی جاتی ہے، وہ عبارت درج ہے، جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے کفن پر لکھی تھی، خود مصنف کو کفن پر لکھنے کیلئے ایک دعاء القاء ہوئی تھی وہ بھی اس رسالہ میں محفوظ ہے۔

کتاب میں جو مہر ہے ان کے بیٹے کی ہے جو احمد آباد کے قاضی تھے، نیز یہ رسالہ مصنف کی زندگی میں کتابت کیا گیا ہے، چوں کہ مصنف کے نام کے بعد یہ دعائیہ الفاظ ہیں: مد الله تعالى ظلاله على رؤوس المعتقدين والمستفدين الى يوم الدين . مطلب اس کتاب کی کتابت مصنف کی زندگی میں ہوئی ہے۔

(۱۹) زاد المعاد ونور الفواد . عقائد میں بزبان فارسی ہے۔

(۲۰) توقیر المیزان (صرف)

یہ کتاب کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں 1831-D نمبر پر موجود ہے۔ فارسی

زبان میں ہے۔

(۲۱) شرح مثنوی شریف دفتر اول (فارسی زبان میں)

(۲۲) رساله انوار قادریه (سوانح)

(۲۳) صرف فارسی (۲٤) منظر حسن

(۲٥) الضّا در اوراد

(۲٦) رسالهٔ دقائق اسم فائق (سلوك)

(۲۷) تکمیل الاوزان (صرف نحو)

(۲۸) مطالب المؤمنین (سیرت)

(۲۹) فوائد المقاصد (حدیث)

(۳۰) رسالة الوصلات المحبوبية

(۳۱) شرح مواقف

(۳۲) التقریب فی شرح تهذیب المنطق والکلام

(۳۳) رسالۂ صرف ونحو (فارسی)

اس رسالہ میں الفاظ کے معنی گوجری زبان میں بھی ہیں۔

(۳٤) مسائل حائضه

نمبر۲۰ سے۳۴ تک کے تمام رسائل وکتب آپ کے خاندانی کتب خانہ احمد آباد میں محفوظ ہیں۔

(۳٥) حاشية علی القطبی

قطب الدین محمود رازی کی تحریر القواعد المنطقية فی شرح الرسالة الشمسيه معروف بہ قطبی پر حاشیہ ہے۔

(۳۶) الرسالة الحقانية

اس میں مجاہد یا مسافر فی سبیل اللہ کے اسباب وذرائع کی وضاحت کی گئی ہے ،آپ نے اس رسالہ کی شرح:

(۳۷) الحواشی الايقانية علی الرسالة الحقانية کے نام سے لکھی ہے۔

آپ کے علمی مقام کا جائزہ:

مذکورہ بالا کتابوں کی فہرست اور حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بیک وقت ایک اہم شارح ،ممتاز عالم حدیث اور اعلی درجہ کے فقیہ تھے، اسی لئے آپ کے علمی وادبی مقام کا ہر کوئی قائل ہے،لیکن بندہ کی خواہش یہ تھی کہ حدیث ،فقہ اور تفسیر جیسے علوم عالیہ میں آپ کی کوئی تصنیف (مخطوطہ) دستیاب ہوجاتی تو اس سے آپ کے علمی تبحر اور عربی ادب میں آپ کی مہارت کے کچھ نمونے پیش کرتا ،جس سے آپ کا علمی وادبی مقام زیادہ واضح ہوجاتا جو ہمارے سمینار کا مقصد خاص تھا،لیکن آپ کی مختلف فنون میں لکھی گئی کم وبیش ۱۷۰ر تصنیفات میں سے کئی ایک ناپید ہوچکی ہوگی ۔اور اگر کہیں ہے بھی تو اس کو حاصل کرنا دشوار ہے ،تاریخی پبلک کتب خانوں اور خانگی خاندانی کتب خانوں میں اسے زیارت کے لئے تو رکھا گیا ہے لیکن علمی استفادہ کے لئے اس کا حصول جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ مشکل ہے، یہ ایک بڑا علمی المیہ ہے، بقول جناب شاہد کلیمی صاحب ’’وہ دیمک اور کیرے ہماری بنسبت بڑے خوش نصیب ہیں کہ بزرگوں کی یہ تصنیفات ان کا خوراک وغذا بن رہی ہے اور

ہم ان کے دیدار سے محروم ہیں۔“

حج بیت اللہ:

آپ ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۳۰ء میں اسّی سال کی عمر میں زیارت حرمین شریفین سے سرفراز ہوئے اور دوسرے سال واپس لوٹے تھے۔

آپ کے دیگر حالات زندگی:

درس وتدریس اور دیگر وظیفوں کے بعد آپ کے تمام اوقات ریاضت وعبادت میں صرف ہوتے، ہر روز ایک دفعہ ختم کلام مجید فرماتے، نہایت عابد، زاہد، ولی کامل، فیاض اور متقی تھے، جب پہلو بدلتے تو ایک ہزار بار تہلیل اور ایک ہزار بار درود شریف پڑھتے، پندرہ سال کی عمر سے زندگی کے آخری ایام تک آپ چلہ کشی اور اعتکاف پابندی سے کرتے تھے، کبھی یہ دونوں چیزیں ناغہ نہ ہوئی، زندگی بھر کبھی بھی بادشاہی نوازشوں کو قبول نہیں فرمایا، بلکہ باوجود اسباب ظاہری کے کبھی سونے چاندی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

وفات:

۹۱ رسال کی طویل عمر میں ۹ رشعبان ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء بروز دوشنبہ بوقت دوپہر یہ روشن ستارہ علمی دنیا کے افق سے ہمیشہ کے لئے غائب ہوگیا، آپ کا مزار اسی خانقاہ میں مدرسہ سے متصل واقع ہے، بہت سے لوگوں نے آپ کی تاریخ وفات لکھی ہے جو رسالہ میں جمع کیا گیا ہے جس میں سب سے اچھی تاریخ ”وارث اہل بیت“ ہے۔

اولاد واحفاد:

آپ کی اولاد میں پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں، ان کے نام حسب ذیل ہے:

(۱) شیخ محمد صالح (۲) قاضی نظام الدین خان (۳) شیخ محمود (۴) شیخ فرید الدین، بعضوں نے آپ کا نام فخر الدین بھی لکھا ہے ۔(۵) شیخ بہاؤ الدین اور تین بیٹیاں (۱) حمیدہ (۲) سعیدہ (۳) عفیفہ صالحہ۔

اولاد جہاں ایک طرف نعمت ہے تو وہیں دوسری طرف آزمائش وامتحان ہے، اسی لئے ان کی دینی واخلاقی تربیت کی اولین ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے، صحیح تعلیم وتربیت سے غفلت نہ صرف افراد اور کنبوں بلکہ ملک وملت سب کے حق میں انتہائی خطرناک اور مضر ثابت ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں اولاد ناکارہ بن جاتی ہے، پیدائشی قوتیں اور صلاحیتیں خراب ہوجاتی ہے اور پھر طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا ہوکر دین دنیا تباہ کرلیتے ہیں۔

اسی لئے ان کی صحیح تعلیم وتربیت ایک اہم دینی فریضہ ہے، اس کی ادائیگی کی پوری فکر نہ کی جائے تو سخت گرفت کا اندیشہ ہے، اس ذمہ داری میں اگرچہ والدین کے ساتھ اساتذہ بھی شریک ہیں، لیکن اولین اور عظیم ذمہ داری والدین کے ذمہ ہے۔

ان تعلیمی وتربیتی کوششوں میں انسان کہاں تک کامیاب ہوا اس کا فیصلہ اور نتیجہ یہی اولاد واحفاد سے ہوتا ہے، چنانچہ ذیل میں ہم آپ کی اولاد میں سے جن کے حالات دستیاب ہوسکے ان کی دینی وعلمی زندگی پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں؛ تاکہ معلوم ہوجائے کہ شیخ نورالدین کا دینی رنگ اور علمی نقوش کیسے ثبت ہوئے۔

(۱) شیخ محمد صالح کے مختصر حالات:

آپ کا نام شیخ محمد صالح عرف پیر بابا ہے، جامع علوم وفنون اور اہل تقویٰ تھے، ابتداء سے آخر تک اپنے پیر بزرگوار مولانا شیخ نورالدین سے علوم وفنون حاصل کرکے باپ

کے جانشین ہوئے، سات سال کی عمر میں کلام مجید تجوید کے ساتھ حفظ کرلیا، چنانچہ اعظم شاہ صوبہ دار نے جب یہ سنا تو اپنے سامنے طلب کر کے سورۂ رحمٰن سنی، تعجب کے ساتھ بے انتہا خوش ہوا، خلعت ونقد کے علاوہ موضع تاجپور ضلع بیرم گاؤں جاگیر میں دیکر فرمان تحریر کیا۔ محمد فرخ شیر بادشاہ اور محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں آپ کو دہلی طلب کیا گیا اور ہر دفعہ دو ہزار روپیہ راہ خرچ عنایت ہوا، اور ہر بار دو ہزار نقد خلعت اور ہاتھی مرحمت ہوا، اس ملک کے تمام اہل علم آپ کی قابلیت کا اعتراف کرتے تھے، ۱۶/ جمادی الثانی ۱۱۴۷ھ میں بمقام دہلی عالم بقا کو رحلت فرما ہوئے، آپ کی نعش کو دہلی سے تابوت میں لا کر مدرسہ کی مسجد کے سامنے دفن کیا۔ ''عجب اتفاق'' تاریخ رحلت ہے۔

آپ کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی، بہاء الحق، صدر الحق، رکن الحق، رضاء الحق، فیض الحق۔

قاضی محمد نظام الدین خاں:

مولانا شیخ نور الدین کے دوسرے لڑکے ہیں، حافظ قرآن تھے، جامع علوم معقول ومنقول، علم ریاضی میں خصوصیت سے آپ کو دخل تھا، بہت بڑے ادیب وشاعر تھے، امراء اور سلاطین کی صحبت میں خاص طور پر ممتاز رہتے، ہر عہد میں خلعت اور ہاتھی سے سرفراز ہوئے، ۱۱۵۱ھ میں احمد آباد کے قاضی مقرر ہوئے، احکام شریعت کے جاری کرنے میں انصاف کو ہمیشہ مدنظر رکھتے، ۱۱۶۳ھ احمد آباد کے محلّہ شاہ پور میں بغیر اجازت مسجد کے متصل ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کر ڈالا اور عین نماز کے وقت ناقوس بجاتے اور مؤذن کو تنگ کرنا شروع کر دیا، قاضی صاحب نے بغیر امداد صوبہ دار اور باوجود کثرتِ آبادئ ہندو مندر پر چڑھائی

کردی اور منہدم کردیا، بادشاہ نے جب یہ خبر سنی تو خوش ہوکر خلعت خاصہ اور ایک ہاتھی بھیج کر سرفراز فرمایا۔ ۱۲/ ذوالقعدہ ۱۱۶۵ھ میں آپ رحلت فرماگئے، شرقی جانب اپنے باپ کے پہلو میں مدفون ہوئے، کوئی اولاد نہیں تھی، رسالہ "فضیلت علم، رسالہ میزان الساعۃ، تفصیل الفصول اور رسالہ قہوہ" وغیرہ آپ کی معنوی اولاد (تصنیفات) ہے۔

آپ کی ایک تصنیف تحفۃ العرفان بھی ہے، بابائے اردو مرحوم عبدالحق نے مخزن الشعراء فائق ایڈٹ کرکے شائع کی ہے، اس میں فائق صاحب کی دوسری تصانیف کے ضمن میں تحفۃ العرفان بھی انہیں سے منسوب کی ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، یہ تصنیف خود شیخ نورالدین صاحب کی ہے، اس کا فارسی ترجمہ پیر بابا صالح نے کیا ہے۔

کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہؒ احمد آباد میں تحفۃ العرفان کے دو نسخے ہیں: ایک مخطوطہ؛ دوسرا مطبوعہ، مخطوطے پر قاضی محمد نظام الدین کی مہر ہے، نہ اس کی سن تالیف درج ہے اور نہ سن کتابت، لیکن مہر اس کی قدامت پر دلالت کرتی ہے، گمان غالب ہے کہ تحفۃ العرفان کا یہ قدیم ترین نسخہ ہے جو دریافت ہوا ہے، اس پر لکھا ہوا ہے کہ ترجمہ پیر بابا، پیر بابا کے نام سے محمد صالح مشہور تھے، نظام الدین اور محمد صالح دونوں قاضی نورالدین کے صاحبزادے تھے۔

تحفۃ العرفان کا مطبوعہ نسخہ مطبع نول کشور میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے، سن طباعت درج نہیں ہے، اس کو محمد نورالدین حسینی المتخلص بہ فائق نے طبع کرایا تھا، فائق صاحب نے مقدمہ میں تحفۃ العرفان کی وجہ تالیف وترجمہ تفصیل سے بیان کی ہے، نیز قاضی محمد نورالدین، قاضی نظام الدین اور محمد صالح کے حالات بھی قلمبند کئے ہیں، اس مطبوعہ نسخے

کو بھی اب نوادرات میں شمار کرنا چاہیے۔

وجہ تالیف کے بارے میں فائق صاحب کے حوالے سے پروفیسر زبیر قریشی صاحب لکھتے ہیں:

وجہ تالیف:۔ برضمیر خورشید نظیر شہسَوران میدان طریقت سالکان مسالک طریقت پوشید نماند کہ درعہد پادشاہِ دین پناہ حضرت خلدمکاں ولایت گجرات بہ بتول شاہزادہ محمد معظم عالم مقرر یافتہ وبلدۂ زین البلاد احمد آباد مخیم اقبال شاہ زادہ شد۔ چوں شاہ عالم رغبت وشوقِ اسپاں بہ مرتبۂ تمام می داشت واکثر در مجلس رشک ارم شاہ زادہ گیتی پناہ ذکر از کار خیول کہ افضلین آیات سلطنت وبہترین زینت خلافت است رفتی، چوں درآں زمان شہرۂ خصائلِ معنوی وکمالاتِ صوری قدوۃ المفسرین سلطان المحدثین شیخنا وشیخ العصر مخدومنا ومخدوم الدہر استاد کامل ہادی سبل مولانا محمد نورالدین صدیقی المُحمدی الشاہی السہروردی قدس اللہ سرہ بگوش جہانیاں سیدہ بود وعالمی از صغیر وکبیر استفادہ فیض باطنی وظاہری از خدمتش حاصل کردی، چوں مولانا تارکُ الدنیا ومافیہا بود درملازمت قہرمان زمان نرفتی۔ شہزادہ از اصغائے کمالاتِ صوری وفضائل معنوی اشتیاق ملاقات دردلِ شہزادہ زیادہ تر پیدا شد۔ تا آنکہ شہزادۂ درخدمت مولانا رفتہ اعتقاد تمام بہم رسانیدہ، روزے درمکالمات شہزادہ خواہش جمع احادیث درباره اسپاں ومحاسن ومعائب آن کہ مخبر صادق علیہ السلام فرمودہ واجروثواب نگاھداشتن خیل ظاہر ساخت وبامراد دراں امر فرمود، مولانا التماس شہزادہ رامقرون بہ اجابت فرمود، رسالہ درعربی مشتمل براحادیث صحاح تالیف فرمودہ بشہزادہ داد۔

آزاد ترجمہ:

شہزادہ محمد معظم والی گجرات کی حیثیت سے احمد آباد میں مقیم تھا، شہزادے کو گھوڑوں

سے بڑی دلچسپی تھی، چونکہ گھوڑے آلات حرب میں ایک مخصوص مقام کے حامل ہیں، اکثر اس کی مجلس میں انہیں کا ذکر رہتا تھا، اسی زمانے میں مولانا محمد نورالدین صدیقی کے کمالاتِ معنوی وصُوری کی صیت وشہرت اپنے شباب پر تھی، وہ مرجع خلائق تھے، مگر اُمراء اور سلاطین کی صحبت سے گریز کرتے تھے، تارک دنیا تھے، شہزادہ موصوف کو ان سے ملنے کا شدید اشتیاق پیدا ہوا، چنانچہ وہ حاضر خدمت ہوا اور اپنی عقیدت کا اظہار کیا، ایک روز اثنائے صحبت میں شہزادہ مذکور نے باصرار مولانا کی خدمت میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ حضور ایک ایسا رسالہ ترتیب دیں جو گھوڑوں کے محاسن ومعائب اور ان کی نگہداشت کے بارے میں وارد احادیث صحاح پر مشتمل ہو، مولانا نے اس التماس کو قبولیت کا شرف بخشا اور ایک رسالہ عربی میں تحریر فرما کر شہزادے کو دیا۔

فائق صاحب لکھتے ہیں: اس کے بعد خان محمد معین الدین شہید تخت نشین ہوا، اس نے مولانا نورالدین کے مذکورہ رسالے کی تعریف سنی تو اس نے مولانا کو خط لکھ کر اپنے یہاں بلوایا اور ''رسالہ خیل'' بھی طلب کیا تو.....

''رسالہ خیل بصحابت فرزندان ارشد خود معارف آگاہ حقائق دستگاہ مولانا محمد صالح المتخلص بعرفان ومولانا نظام الدین المتخلص بفائق روانہ درگاہ والا فرمود۔ وفرزندان مولانا در دارالخلافہ شاہجہاں آباد در رسیدہ ملازمت شاہی حاصل فرمودند۔''

یعنی مولانا نورالدین نے اپنے مؤلفہ رسالہ خیل اپنے صاحب زادے مولانا نظام الدین المتخلص بفائق اور محمد صالح المتخلص بعرفان کے ساتھ دہلی بھیجا، دونوں صاحب زادے شاہجہاں آباد میں ملازمت شاہی سے سرفراز ہوئے۔

وجہ ترجمہ:۔صاحب مخزن الشعراء فائق صاحب آگے چل کر رقم طراز ہیں:

درآں ہنگام پادشاہ روزے درملاقات بہ مولانا محمد صالح امر فرمود کہ چوں ایں رسالہ درعربی تالیف بزرگوار شما است بہتر کہ در پارسی ترجمہ نمائید، مولانا محمد صالح بزودی درپارسی ترجمہ نمودہ وموسوم بہ ''تحفۃ العرفان'' کردہ پیشکش ساخت خاقان دوران خوشدل ومحظوظ ازیں رسالہ درپارسی گردیدہ وبنوازش خسروانہ ازخلعت فاخرہ مروارید وشمشیر مرصع واسپ وفیل باساز مرصع سرفراز ساختہ وحکم فرمان آفتاب شعاع مرحمت موضع کنج وبنج از پرگنہ دہ کردھی سرکار حویلی احمد آباد بطریق التمغا بنام مولانا محمد صالح ومحمد نظام الدین فرمود۔''

یعنی انہیں دنوں ملاقات کے دوران ایک روز بادشاہ نے محمد صالح سے کہا کہ یہ رسالہ ''خیل'' جو آپ کے والد ماجد کی تصنیف ہے، عربی میں ہے، کیا اچھا ہوتا اگر آپ اس کا ترجمہ فارسی میں کردیتے، محمد صالح نے فوراً اس کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس کا نام ''تحفۃ العرفان'' رکھا، بادشاہ نے اس کے صلے میں خلعت فاخرہ موتی، شمشیر مرصع، گھوڑا اور ہاتھی دیئے اور ساتھ ہی دہ کروہی پرگنہ میں واقع کنج اور بنج گاؤں بھی دونوں بھائیوں کو عنایت کئے۔

مولانا محمد صالح کی تصانیف کے بارے میں فائق صاحب لکھتے ہیں:

وازتالیف وتصانیف ایشاں یکے ایں رسالہ پارسی است، ونورالعرفان درتعریف مدرسہ ہدایت بخش واقع احمد آباد، ویک دیوان فارسی وچند مثنویات ورسالہ عربی درعلم قرأت ودیگر شرح وحاشیہ برکتب ازایشاں یادگار روزگار است۔''

یعنی محمد صالح کی تصانیف میں ایک تو یہی رسالہ ہے اور احمد آباد میں واقع مدرسہ

ہدایت بخش کی تعریف میں لکھا گیا رسالہ نور العرفان ، ایک دیوان فارسی ، چند مثنویات ، علم قرأت پر ایک رسالہ عربی اور اکثر کتابوں پر شروح وحواشی ہیں۔

(۳) شیخ محمود:

جن کو لوگ شیخ بڑا بھی کہتے ہیں، قابل لائق اور جوان تھے، پیک اجل آ پہنچا۔ ۵ ربیع الاول کو وفات پائی ، لاولد تھے ، دلاساپورہ موضع مہیج ان کے متعلقوں کے نام مقرر رہے، اپنے دادا مولانا محمود کے مقبرہ میں آپ دفن ہوئے۔

(۴) شیخ فخر الدین:

آپ کو لوگ شیخ بزرگ بھی کہتے تھے، باوجود گونگے ، بہرے ہونے تیز فہم اور عقل مند تھے، خط نسخ اور نستعلیق خوب لکھتے تھے، بار بار تمام کلام اللہ تحریر کیا ، بلکہ پارۂ عم زبانی لکھتے تھے۔

(۵) ابوالبصیر بہاؤ الدین:

بچپن ہی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ (تاریخ اولیاء گجرات ص ۱۷۱ تا ۱۷۳)

مراجع ومصادر

اسماء کتب	اسماء مصنفین ومؤلفین	مطبع وناشر
(۱) تذکرۂ قاریان ہند	مرزا بسم اللہ بیگ صاحب	میر محمد کتب خانہ کراچی
(۲) عربی زبان وادب کی ترقی میں احمد آباد گجرات کے دانشوروں کا حصہ	ڈاکٹر باقر علی محمد علی ترمذی	پیر محمد شاہ لائبریری
(۳) گجرات کے علماء حدیث وتفسیر	پروفیسر محبوب حسین احمد حسین عباسی	//
(۴) تاریخ اولیاء گجرات	مولانا ابوظفر ندوی صاحب	اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
(۵) گجرات کے مشاہر علماء	پروفیسر زبیر قریشی صاحب	//
(۶) گجرات کی تمدنی تاریخ	مولانا ابوظفر ندوی صاحب	دار المصنفین اعظم گڑھ
(۷) مشائخ احمد آباد	مولانا محمد یوسف متالا صاحب	امرین بک ایجنسی احمد آباد
(۸) نزہۃ الخواطر	علامہ سید عبد الحی حسینی ندوی صاحب	دائرہ المعارف العثمانیہ
(۹) عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ	ڈاکٹر زبید احمد صاحب	ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور
(۱۰) عرب ممالک اور صوبۂ گجرات کے تعلقات	مولانا اقبال صاحب ٹنکاروی	دار العلوم ماٹلی والا
(۱۱) ندائے حرم (ماہنامہ) (مضمون نگار)	ڈاکٹر زبیر قریشی صاحب	جامعہ کنز العلوم احمد آباد

❖❖❖

علامہ شاہ وجیہ الدین احمد بن نصر اللہ بن عماد الدین علوی، حنفی گجراتی، ہندیؒ

(۲۲/محرم الحرام ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۰ء)

رابطۂ ادب اسلامی گجرات کی طرف سے صفر ۱۴۳۱ھ مطابق جنوری ۲۰۱۰ میں سمینار منعقد ہوا تھا، تاکہ اسلاف کے علمی وادبی کارنامے اجاگر کئے جاسکے، چنانچہ صوفیاء کرام، دعاۃ ومبلغین، فقہاء ومحدثین کی حیات پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے علمی ودینی کارنامے اجاگر کرنے کی غرض سے سلف صالحین میں سے کسی بھی ایک شخصیت کا سوانحی خاکہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی؛ لہذا اس موقع پر یہ مقالہ پیش کیا گیا، اور حضرتؒ کی دینی خدمات اور تصنیفی سرگرمیوں کو اجاگر کیا گیا۔

علامہ شاہ وجیہ الدین کی علمی، ادبی، فنی وروحانی خدمات

(تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور ملفوظات ومواعظ کے آئینہ میں)

الحمدلله رب العالمين الذى جعل العلماء ورثة النبيين ،وخصّ منهم الأئمة المجتهدين والمفسرين والمحدثين ،فاختارهم قادة الأمة الى يوم الدين ،والصلوة والسلام على سيدنا محمد خاتم الأنبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه ومن تبعهم اجمعين.

علامہ شاہ وجیہہ الدین احمد بن نصر اللہ بن عماد الدین علوی حنفی گجراتی ہندی ۲۲ محرم الحرام ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۰ء کو چانپانیر (محمد آباد، گجرات) میں پیدا ہوئے ،آپ کے دادا جان سید بہاؤ الدین مکی عرب سے ہندوستان میں (گجرات) سلطان محمود ثانی کے عہد حکومت میں تشریف لائے تھے ،اور چانپانیر کو ہی اپنا مسکن بنایا ،اور یہیں انتقال بھی ہوا۔ (مشائخ احمد آباد: ص ۲۷۱)

آپ کی زندگی کے مبارک دور میں یعنی دسویں صدی میں خطۂ گجرات خصوصا احمد آباد کو علوم وفنون کا وہ شرف حاصل ہوا جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔یہی شہر ایک زمانہ میں دار العلوم ومخزن فنون بنا ہوا تھا، بقول مصنف یادایّام یہ صرف اُن کی (یعنی شاہان گجرات کی) قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ شیر از ویمن اور دیگر ممالکِ اسلامیہ کے چیدہ وبرگزیدہ علماء نے گجرات میں آکر بودوباش اختیار فرمائی،جن کے

فیوضات سے چند دنوں میں گجرات مالا مال ہوگیا،اور خود گجرات میں اس پایہ کے علماء پیدا ہوئے جن کے علمی فیوض کی آبیاری سے اب تک ہندوستان کی درسگاہیں سیراب ہورہی ہیں۔

اگر گجرات علوم عقلیہ ونقلیہ کے اعتبار سے شیراز تھا،تو حدیث شریف کے لحاظ سے یمن سے مماثلت رکھتا تھا،ایسے مبارک دور میں آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا ۔(تذکرۃ الوجیہ:ص:۳۸)

حضرت علامہ نے پانچ سال کی عمر میں ناظرہ اور سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ بھی کرلیا،ابتدائی علوم اپنے چچا سید شمس الدین اور ماموں سید ابوالقاسم سے حاصل کئے،اور حدیث شریف کا علم ۱۵ر سال کی عمر میں حافظ سخاوی کے شاگرد محمد بن احمد مالکی اور محدث ابوالبرکات عبدالملک بنبانی عباسی سے حاصل کرکے سند فراغت حاصل کی۔

ان کے بارے میں صاحب خلاصۃ الوجیہ لکھتے ہیں: شیخ محدث ابوالبرکات بنبانی العباسی وھو مجاز عن آبائه المحدثین مسلسلا ومعنعنا فی احمدآباد.

اس کے بعد علوم عقلیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور علامہ جلال الدین دوّانی کے مایۂ ناز شاگرد مولانا عماد الدین طارمی اور ابوالفضل محمد مظہر الدین گاذرونی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور چوبیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کرلی اور تقریبا سڑسٹھ سال تک احمد آباد میں معقول ومنقول پڑھانے میں زندگی بسر کی۔(مشائخ احمد آباد:ص۲۷۲)

پچیس سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے درس کا سلسلہ جاری کیا اور درسگاہ قائم کی اور اس جانفشانی سے اس میں مصروف ہوئے کہ آپ کی خداداد قابلیت کے جوہر خود بخود نمایاں ہونے لگے، گویا قدرت نے آپ کو اس علمی خدمت کے لیے منتخب کرلیا تھا، آپ کی ہمہ تن مشغولیت ومصروفیت کا یہ نتیجہ نکلا کہ اطراف عالم میں آپ کی درسگاہ کا شہرہ ہوگیا، آپ علوم عقلیہ ونقلیہ میں استاذِ وقت مانے گئے، بالخصوص علومِ دینیہ کی تدریس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، یہ مدرسہ آپ نے سلطان بہادرشاہ کے عہد میں قائم کیا جو اپنی خوبیوں کے باعث دن بدن ترقی پذیر ہوتا رہا، اس مدرسہ میں جملہ علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی، تفسیر، حدیث اور فقہ کے بعد فلسفہ، منطق، ریاضی اور ہیئت وغیرہ کا پورا اہتمام تھا، اس کے ساتھ آپ سے ارشاد وطریقت کا سلسلہ بھی جاری تھا، شب کو جب اذکار واشغال سے فارغ ہوتے تو طلباء سے ان کی ضروریات وغیرہ کا حال دریافت کرتے اور نکاتِ علمی بتاتے ہوئے روحانی وقلبی حقائق کی باریکیاں نہایت فراخ دلی وخندہ پیشانی سے ذہن نشین فرماتے، آپ کے تلامذہ علمی کمال کے ساتھ روحانی انوار سے بھی مستفیض ہوتے جاتے تھے اور دور دور کے لوگ آکر فیضیاب ہوتے۔

ان تمام خوبیوں سے آپ کے مدرسہ کا شہرہ ہوگیا جس کی شہرت سن کر طلبا کا جم غفیر آپ کے یہاں جمع ہوگیا اور یہ معاملہ آپ کے زمانۂ حیات تک بڑی شہرت کے ساتھ قائم تھا، ہر طرف سے مشتاقانِ علم بے شمار تعداد میں آئے اور فیض پاکر واپس چلے گئے، جن کی علمی معلومات وروحانی کیفیات کے اثرات ہند سے لے کر عرب تک چمکے اور آپ کی مبارک زندگی میں استاذ الاساتذہ اور استاذ البشر اور

استاذ الامۃ الحمد یہ جیسے معزز خطاب آپ کے اسم گرامی کے ساتھ وابستہ ہو گئے ،فقہاء میں آپ بے نظیر فقیہ اور محدثین میں ملک المحدثین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، اسی طرح اکثر فتاوے آتے اور آپ محققانہ انداز سے جواب تحریر فرماتے تھے،بعض علماء خط وکتابت سے آپ کی رائے طلب کرتے ان کو آپ مفصل جوابات تحریر فرماتے ،مدرسہ میں آپ کی فاضل اولاد اور وہ شاگرد جو تحصیل علوم سے فارغ ہو چکے تھے ،درس دینے پر مامور تھے،اکثر تلامذہ دوسرے مقامات پر بھی گئے ،اور جس جگہ یہ پہنچے ان کی علمیت کی شہرت ہوگئی ،آپ کی سند بالاتفاق مانی جاتی تھی ،اور جو تلامذہ عرب گئے ان کو نہایت احترام کے ساتھ علمائے حرمین نے اپنے یہاں جگہ دی ،اوران کے علم سے مستفید ہوئے ،مجموعی طور پر آپ کے ۸۴ ہزار شاگرد ہوئے ،جن میں اسّی اس پایہ کے تھے ،جنہوں نے اپنی زندگی درس دینے میں وقف کردی ،جن کے علمی فیض سے صدہا لوگ سیراب ہوئے۔

گویا آپ کی زندگی میں آپ کے مدرسہ کی شاخیں آپ کے شاگردوں کے ذریعہ جابجا قائم ہوگئیں ،اور بہت تھوڑے عرصہ میں اس درسگاہ نے اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹی کا مقام حاصل کرلیا، مدرسہ کی از سرنو صادق خاں نامی امیر نے تعمیر کرائی جس میں طلباء کے آرام وآسائش کا پورا انتظام تھا،اوران کے وظائف روزینہ بھی حکومت کی طرف سے مقرر تھے،آخر عمر میں آپ نے چاہا کہ خود درس دینا موقوف کردیں مگر جناب رسالت مآب ﷺ نے خواب میں فرمایا کہ اس کو ترک نہ کرو،اس پر آپ نے درس جاری رکھا اور اس کا نام درس محمدی رکھا ،کامل چونسٹھ سال تک آپ نے معقول ومنقول کے پڑھانے میں اپنی عمر صرف کی ، بقول مصنف گلزار ابرار'' اس مدت میں

آپ کے فیض رسانی کی بدولت بہت سے ذی استعداد لوگوں نے آپ کی شاگردی سے خلعت استاذی پایا، اور بہت سے صوفیوں نے آپ کی دلنشیں تلقین سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔'' مصنف یاد ایّام لکھتے ہیں کہ علاّمہ وجیہ الدین علوی گجرات کے ان برگزیدہ علماء میں ہیں جن کے احسان سے اہلِ ہند کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔

آپ کے درس کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ جب سے آپ نے درس دینا شروع کیا آخر عمر تک صرف چار مرتبہ ایسے مواقع پیش آئے جس سے کچھ روز آپ کا درس موقوف رہا، جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔(تذکرۃ الوجیہ:۴۲)

حضرت مولانا سید عبدالحی الحسنیؒ ''نزہۃ الخواطر'' میں تحریر فرماتے ہیں: اشتغل بالعلم علی اساتذة عصره ،ثم لازم العلامة عمادالدين محمد بن محمود الطارمی ،واخذ المنطق والحكمةوالكلام والاصول وغيرها من العلوم الآليةوالعالية ،واقبل علی العلم اقبالا كليا حتی حاز قصب السبق فيه ،واحكم ،فافتی ودرّس وله نحوالعشرين ، وصنف التصانيف وصار من اكابرالعلماء فی حيآةشيوخه.

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں: أحد كبار الأساتذةلاتكاد تسمع من يدانيه فيمن عاصره من العلماء فی كثرةالتصانيف ويجاريه فی قوةالتدريس.(شرح نزهة النظر:۱۳-۱٤)

۹۸۶ھ میں جب علاّمہ محمد طاہر پٹنی مصنف مجمع البحار نے فرقۂ مہدویہ کی بیخ کنی کی خاطر آگرہ شہنشاہ اکبر کے حضور میں پیش آمدہ واقعات عرض کرنے کے لیے جانے کا ارادہ کیا، تب آپ کے مدرسہ میں آکر آپ سے رائے طلب کی تھی، جس کو

مصنف گلزار ابرار نے اس طرح تحریر کیا ہے کہ استاذی شیخ وجیہ الدین احمد آبادی کی ملازمت میں پہنچ کر وداعی مراسم ادا کیے، استاذی شیخ وجیہ الدین اس عزم سے مانع تھے اور شیخ عزم کے واسطے تحریک فرماتے تھے، حضرت شاہ صاحب نے ان کی تمام باتیں سن کر ناصحانہ انداز میں اپنے خیالات سے آگاہ کیا:

"گرامی برادر کے حقیقت شناس ضمیر کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس نظم ونسق کے ساتھ جو کارخانہ عالم آفرینش ہوئی ہے اسکا باعث یہ ہے کہ آسمانی کمالات کا اظہار ہو اور یہ اظہار جمالی اور جلالی مظاہر کے ساتھ وابستہ ہے اور اپنے مربّی کے آثار واحکام کی طرز پر اسم کے مظہر کی جو کچھ رفتار ہے یہی رفتار اس کے واسطے صراط مستقیم ہے گو اس کے تقابل پر نظر کر کے وہ رفتار مخالف ومنحرف معلوم ہوتی ہو اور اس مقام پر ہر موسیٰ کو اپنے فرعون کے ساتھ آشتی رکھنی چاہیئے، واضح ہو کہ صراط مستقیم حقیقت شناس مفسروں کے نزدیک دوطرح پر ہے: ایک ایجابی دوسرے ایجادی، قرآن مجید میں صراط مستقیم کا جہاں کہیں لفظ نکرہ واقع ہوا ہے وہاں پر اکثر مراد ایجادی ہے اور جس آیت میں یہ لفظ معرفہ وارد ہوا ہے وہاں پر زیادہ تر مفہوم ایجابی ہے۔ فافہم۔

دوسری بات یہ کہ انسان جو عالم کبیر کا نمونہ ہے اس کے عنصری پیکر سے دقیقہ شناس شخص یہ عبرت کیوں حاصل نہیں کرتا ہے؟ کہ اس کی ہستی اس بندوبست اور متعارف اعتدال کے ساتھ چند لطیف وکثیف اعضاء پر موقوف ہے چنانچہ امعاء (آنت) جیسے کثیف عضو کو بھی کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو باغیچۂ بدن کی شگفتگی میں سرا سر آشفتگی و پژمردگی نمایاں ہو جاتی ہے، اب برادر من! سیاست وفراست کی بات یہی

ہےاور مشغولی حق کے ساتھ ہی ہونا زیبا ہے، نہ خلق کے ساتھ۔ ھذہ اوانُ السکوتِ والتزام البیوتِ (یہ زمانہ خاموشی اور مکان میں بیٹھنے کا ہے) (تذکرۃ الوجیہ:۴۴)

افسوس کہ حضرت محدث محمد بن طاہر صاحب نے شاہ وجیہ الدین صاحب کی نصائح پر عمل نہ کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ مخلوق آپ سے استفادہ کرنے سے محروم ہوگئی۔

سید غلام علی آزاد بلگرامی ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' میں تحریر فرماتے ہیں: کان صاحب المناقب الفاخرۃ وجیهًا فی الدنیا والآخرۃ، عالما بعلوم الجهتین، خازن لکنوز النشأتین. ولد فی المحرم سنة إحدی عشرۃ وتسع مائة ومسقط رأسه جانبانیر۔ بالجیم الموحدۃ بین الألفین والنون المکسورۃ والتحتانیة الساکنة آخرها راء ۔ من بلاد کجرات ونشأ وارتحل إلی کجرات وأخذ الفنون الدرسیة عن الملا عماد الطارمی من أعیان علماء العصر ولبس الخرقة من الشیخ قاضن قدس سره ولما ورد الشیخ محمد غوث الکوالیاری، صاحب الجواهر الخمسة، بکجرات تلاشی الشیخ وجیه الدین فی جماله وسلك إلی منتهی الطریقة فی ظلاله، ومتع طلبة بجلائل الإفادات وملأ شرق العالم وغربه من لوامع البرکات. (سبحة المرجان: ۱۱۵-۱۱۶)

تصنیف وتالیف

درس وتدریس کے ساتھ آپ نے تصنیف وتالیف کا شغل بھی جاری رکھا اور بکثرت کتابوں پر شرحیں اور حواشی لکھے، کوئی علم ایسا نہیں جس کی منتہی کتاب پر آپ

کی شرح اور حاشیہ نہ ہو، بلکہ آپ کی اکثر شروح وحواشی پر آپ کے شاگردوں نے حاشیے اور شرحیں لکھی ہیں، سب سے پہلی تصنیف شرح ارشاد ہے، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مآثر الکرام میں آپ کی مصنفہ کتب کی تعداد ایک سوستانوے بیان کی ہے، مگر آپ کی تصانیف کی تعداد ان سے زیادہ بیان کی جاتی ہے۔

ہمارے محترم پروفیسر زبیر صاحب نے تصنیفات کے سلسلے میں تذکرۃ الوجیہہ کے مقدمے میں شاہ صاحب کے خصوصی شاگرد حضرت عبدالعزیز صاحب کے عربی اشعار نقل کئے ہیں، جس میں آپ کی تصانیف کی تعداد چالیس سے زیادہ بتائی ہے۔

له فی کل علم اقتدار و تصنیف تجاوز اربعینا

اسی طرح شاہ علویؒ کے دوسرے بڑے شاگرد جو خود آپ کے مدرسہ علویہ کے مدرس بھی رہے ہیں، یعنی شیخ محمد فرید بن محمد شریف صدیقی ان کے شاگرد شیخ احمد بن محمد فاروقی نے بھی خلاصۃ الوجیہہ میں شاہ صاحب کی تصانیف کی تعداد چالیس بتائی ہیں؛ لہذا ہوسکتا ہے کہ دوسرے مصنفین یا آپکے بڑے شاگردوں میں سے کسی کی کتابیں آپ کی طرف منسوب کردی گئی ہو؛ چونکہ وہ زمانہ حاشیہ وشرح نگاری کا تھا لہذا ایک کے حاشیہ کے اوپر دوسرے کے حواشی یا شرح لکھ دی جاتی تھی اور اس سے اشتباہ ہوجاتا تھا، یا ہوسکتا تھا۔ پروفیسر زبیر صاحب کی بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تذکرۃ الوجیہ ،نزہۃ الخواطر، عربی ادب میں پاک وہند کا حصہ، سبحۃ المرجان فی آثار ھندوستان، وغیرہ کتابوں کی فہرست سے آپ کی کتابیں تین طرح کی معلوم ہوتی ہے، ان کتابوں میں

رسائل، حاشیے اورشروحات کا مجموعہ ملا کر ٦٦ تک عدد پہنچتا ہے، جس میں ۳۴ حواشی ،۱۲/رسائل، ۱۶/شروحات اور ۳/مختصر کتابیں یعنی رسائل اور ایک مکتوبات شامل ہیں۔

(۱) رسالہ جنات عدن علی تفسیر البیضاوی (۲) حاشیہ بیضاوی (۳) حاشیہ علی تفسیر الرحمانی (۴) شرح نخبہ فی اصول حدیث (۵) شرح تجرید (٦) حاشیہ علی التلویح فی اصول الفقہ (۷) حاشیہ ہدایہ (۸) حاشیہ شرح وقایہ (۹) حاشیہ علی شرح عقائد تفتازانی (۱۰) حاشیہ شرح مختصر الاصول لابن الحاجب (۱۱) حاشیہ عضدی اصول فقہ میں (۱۲) حاشیہ کشف الاصول (۱۳) حاشیہ شفا قاضی عیاض (۱۴) شرح بسیط فی الفرائض (۱۵) رسالۃ الانسکریہ فی اجوبۃ الطفقریۃ (۱٦) شرح قدیمہ (۱۷) حاشیہ شرح جغمنی (۱۸) حاشیہ مختصر المعانی (۱۹) حاشیہ آصفحانی (۲۰) شرح وجیز (۲۱) رسالہ الکلام (۲۲) حاشیہ علی شرحین للمفتاح فی علم المعانی والبیان (۲۳) حاشیہ علی شرح المواقف فی الکلام (۲۴) حاشیہ شرح مطالع (۲۵) حاشیہ علی شرح العلامۃ الجامعی (۲٦) حاشیہ کافیہ فی النحو (۲۷) حاشیہ الجلالیہ (۲۸) حاشیہ علی منہل العلامۃ الجامعی (۲۹) وافیہ شرح کافیہ (۳۰) حاشیہ علی حاشیہ الخیالی (۳۱) شرح ابیات منہل الدمامینی (۳۲) شرح ابیات تسہیل (۳۳) شرح تحفہ شاہیہ (۳۴) حاشیہ شرح فوائد ضیائیہ (۳۵) شرح ارشاد قاضی شہاب الدین دولت آبادی (۳٦) حاشیہ مطول علم معانی (۳۷) حاشیہ زبدہ (۳۸) شرح شمسیہ فی المنطق (۳۹) حاشیہ شرح تہذیب (۴۰) حاشیہ عین المفتاح (۴۱) حاشیہ قطبی منطق میں (۴۲) شرح حکمۃ العین (۴۳) شرح لوائح جامی (۴۴) شرح کلید مخازن فارسی (۴۵) حاشیہ علی الزرح تذکرہ النیشابوری (۴٦) شرح رسالہ علی قوشجی فی الہیئۃ فارسی (۴۷) شرح علی جام جہاں نما فارسی (۴۸) رسالہ

القلب (۴۹) رسالہ وقف اعداد (۵۰) حقیقت محمدی (۵۱) رسالہ ترتیب فی الصلوات (۵۲) رسالہ ایمان (۵۳) رسالہ فی تحقیق ابلیس (۵۴) حاشیہ برحاشیہ محقق دوانی (۵۵) رسالۂ تفسیر والذین آمنوا واتبعتهم ذریتهم بایمان (۵۶) رسالہ فامامن ثقلت موازینه (۵۷) حاشیہ علی کتاب السید الشریف الجرجانی (۵۸) رسالہ فی اجوبۃ الاعتراضات الفقیہ الحیر تی علی فاضل الهندی (۵۹) حاشیہ بزدوی (۶۰) رسالہ طریقۂ بیعت (۶۱) المختصر المولود الامام الجزری (۶۲) اورادوجیہ (۶۳) مکتوبات (۶۴) حاشیہ شرح مقاصد (۶۵) مختصر تلخیص (۶۶) حاشیہ ضریری۔ آپ کی اکثر تصانیف وتالیفات توضائع ہوچکی ہیں اور کچھ باقی ہیں ،اگران کی تلاش کی جائے تو کہیں نہ کہیں ضرورموجودہوگی۔ (تذکرۃ الوجیہ:۴۶)

حضرت شاہ وجیہ الدین صاحبؒ کی بہت ساری کتابوں میں سے کچھ کے قلمی نسخے کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ،آصفیہ حیدرآباد،دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،رامپور، دہلی انڈیا آفس: لنڈن وغیرہ میں پائے جاتے ہیں،حضرت مولانا ابو الظفر ندوی صاحب نے تذکرۃ الوجیہ کے مصنف سید حسینی پیرعلوی صاحب کی فرمائش پر کتب خانہ پیرمحمد شاہ اور دیگر مختلف کتب خانوں میں موجود چند کتابوں پر اپنی بیش بہا رائے کا اظہار کیا ہے، مجموعی طور پر ۲۰ کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے ابتدائی اورانتہائی کلمات کوبھی ذکر کیا ہے۔

پیرمحمد شاہ کتب خانے کی وضاحتی فہرست میں مخطوطہ کے نمبر کے ساتھ اجمالی وضاحت ہے، بندہ نے ان کو وضاحتی فہرست ۱/تا ۹/ سے تلاش کرکے نمبر کے ساتھ جمع کیا ہے، وہ اس طرح ہیں: 176 حاشیۂ بیضاوی (ص ۱۵)، 261 شرح نزہۃ

النظر فی توضیح نخبۃ الفکر(ص۶۹)، 4 2 2 حاشیہ علوی علی التلویح (ص/۱۴۰)،428 حاشیہ شرح وقایہ (ص/۶ تا ۳۷۰/)،۵۴۳،۳۴۳/ حاشیہ علی شرح المواقف علی للسید السند، 8 3 8 الرشاد حاشیہ شرح الارشاد(ص/۱۹۰)، 8 8 0 حاشیۃ علی شرح مختصر التلخیص وحاشیۃ علی شرح الجرجانی (ص/ ۱۳۱) ، 932-931 حاشیۂ عضدی (ص/۷۸،۱۳۱)، 1328-1324 شرح جام جہاں نماں من شرح ملاعلی برو(ص/۴۳،۳۳)،1363 سلسلہ طریقت شجرات شاہ وجیہ الدین،A-1799 الحقیقۃ المحمدیۃ (ص/۱۱)۔

تذکرۃ الوجیہ کے مقدمے میں ہمارے کرم فرما محترم ومکرم جناب ڈاکٹر محمد زبیر قریشی صاحب نے بھی چند کتابوں کے تعارف کے ساتھ خدابخش لائبریری: پٹنہ، کتب خانہ ٹونک، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے مخطوطات (الف) حاشیۂ علوی علی تفسیر البیضاوی، حاشیۂ علوی علی تلویح، حاشیۂ علوی علی عضدی، حاشیۂ علی وقایہ، حاشیۂ علی شرح العقائد کا تذکرہ کیا ہے، نیز جناب وارث علوی صاحب کے بی۔ جے۔ انسٹیٹیوٹ کو دئے گئے عطیہ میں بھی حضرت شاہ وجیہ الدین صاحبؒ کی ملکیت کی چند کتابیں اور ان کے خط سے بھی محترم ڈاکٹر صاحب نے استفادہ کیا ہے۔ (تذکرۃ الوجیہ:۱۵)

ڈاکٹر زبیر احمد صاحب نے اپنی کتاب ’’عربی ادبیات میں ہندو پاک کا حصہ ‘‘میں بھی مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے مختلف مقامات پر حضرت شاہ وجیہ الدین صاحب کی کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مختلف کتب خانوں اور میوزیموں میں موجود نسخوں کا نمبرات کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، وہ اس طرح ہے:

تفسیر : حاشیۃ علی تفسیر البیضاوی، آصفیہ چہارم ۲۱۰۔ **علوم حدیث** : شرح شرح نخبۃ الفکر، رامپور ۱۲۷۔ **علم الکلام والعقائد**: الحاشیۃ علی التجرید، تذکرہ ۲۵۰، الحاشیۃ علی شرح العقائد للتفتازانی، الحاشیۃ علی الحاشیۃ القدیمۃ ۔ **تصوف اور اخلاقیات** : الحقیقۃ المحمدیہ، انڈیا آفس، ۱۳۸۱۔ **علم فقہ واصول فقہ**: حاشیۃ علی شرح الوقایہ، بوہار ۱۶۴، رامپور ۱۸۶، حاشیۃ علی التلویح، ندوہ ۱۲۷، حاشیۃ علی اصول البزدوی، تذکرہ ۲۵۰، حاشیۃ علی الشرح العضدی علی المختصر لابن الحاجب۔ **علم اللسان**: حاشیۃ علی شرح الجامی، بوہار ۳۸۷، آصفیہ ۴۴۵۷، محمود شاہ ۲/۳۳، رامپور ۵۳۵، مجموعہ حسین ۴۰۸، بنگال ۳۱۰، دہلی ۱۰۷۱، آصفیہ ۱/۱۶۴۴، ندوہ ۶۸۴، شرح ارشاد النحو، لوتھ ۹۷۶، رام پور ۵۳۹۔ حاشیۃ علی المطول، تذکرہ ۲۸۰، حاشیۃ علی مختصر المعانی۔ **علم الحساب** : حاشیۃ علی شرح الجغمینی، تذکرہ ۲۵۰۔

(عربی ادب میں پاک وہند کا حصہ: ص ۱۰۳، ۲۶۴، ۲۸۳، ۳۰۱، ۳۰۷، ۳۲۳، ۳۳۸، ۳۷۸، ۳۹۹)

بندہ کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ کے معزز ومکرم چیرمین جناب پروفیسر محی الدین صاحب بمبئی والے کا ممنون ومشکور ہے کہ آپ محترم نے کتب خانے میں سے تصانیف حضرت شاہ وجیہ الدین صاحب کے مختلف مخطوطات کا کچھ حصہ زیروکس کرواکے بندہ کو عنایت فرمایا، شاہ صاحب کی ایک کتاب ''الحقیقۃ المحمدیہ'' کے مخطوطہ کے ساتھ اس کی شرح ''الافاضات الاحمدیہ'' (تالیف: علامہ مرزا محمد دائمی) مع تحقیق محمد جلال رضا صاحب ازہری جو قاہرہ مصر کے ''المطبعۃ الکیلانی'' سے شائع ہوئی ہے،

اس کا بھی بڑا حصہ محترم جناب محی الدین صاحب نے زیروکس کروا کے عنایت فرمایا ہے۔ **فجزاہم اللہ خیرالجزاء.**

حضرت شاہ وجیہ الدین کی ایک کتاب ''شرح نزہۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر'' مولانا عبداللہ خطیب ندوی صاحب کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ مجمع الامام احمد بن عرفان الشہید رائے بریلی سے شائع ہوچکی ہے، بندہ نے اس سے مکمل استفادہ کیا ہے ،علمائے گجرات کی طرف سے آپ محترم کا میں انتہائی ممنون ومشکور ہوں کہ جو قرضہ علمائے محدثین گجرات پر تھا؛ آپ نے اس کا کما حقہ حق ادا فرما کر ہم کو زیر بارِ احسان فرمایا۔

شاہ وجیہ الدین صاحب کے ان مخطوطات ومکتوبات کے مطالعہ سے قدرے مشترک یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالی نے آپ کو معقولی ومنقولی تمام علوم وفنون میں کمال قدرت عطا فرمائی تھی ،فن کی مشکل سے مشکل عبارت کو حل کرنا اور آسان وسہل انداز میں اس کو پیش کرنا؛ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے، بلکہ زبان وفن دونوں پر مکمل دسترس اور کمال قدرت کے بعد ہی ممکن ہے ، بسا اوقات آدمی فن کا ماہر ہوتا ہے ؛ لیکن تفہیمی صلاحیت نہیں ہوتی یا آسان وسہل انداز میں پیش نہ کرسکنے کی وجہ سے مافی الضمیر کو ادا نہیں کرپاتا ہے، یا ادبی شیریں بیانی نہ ہونے کی وجہ سے بھی مضمون آسان ہونے کے باوجود خشک اور بارگراں بن جاتا ہے، جب کہ حضرت علامہ وجیہ الدین صاحب نے تو تمام مشکل مضامین کی کتابوں پر ہی عموماً تحشیہ کا کام کیا ہے، جو ہر فن میں آپ کی کمالِ قدرت کے ساتھ اعلی ادبی عربیت سے بھی بہرہ ور ہونے پر دلالت کرتا ہے ۔

ان کتابوں میں سے ''شرح نزہۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر'' حضرت مولانا عبد

اللہ الخطیب ندوی صاحب کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ چھپ چکی ہے، بندہ نے اس شرح کا طالب علمانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے، اس مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت شاہ وجیہ الدین صاحبؒ نے حل کتاب میں کافی محنت کی ہے، مسائل کی توضیح میں سہل انداز اور مباحث طویلہ سے اجتناب کیا؛ تاکہ طلبۂ عزیز کے لئے اکتاہٹ کا باعث نہ بنے، لیکن اتنا اختصار بھی نہیں کہ نفس مضمون سمجھ نہ سکے، اسی طرح ضمائر کے مرجعوں کی وضاحت، کلمات محذوفہ کا اعادہ، مبہم ومقدر عبارتوں کی تعیین، تخصیص وتعمیم کی وضاحت، شرح کا متن سے ربط، ترکیب نحوی، کلام غیر تام کی تکمیل اور عبارت کی مکمل مختصر انداز میں وضاحت، لفظ کا صحیح تلفظ، حل لغات، تاریخی مقامات کی نشاندہی اور مصنفؒ کے زمانے میں اس شہر کے حالات کی وضاحت وغیرہ کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔

مثلاً ''العسقلانی'' کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں: نسبه الى عسقلان بفتح العين وسكون السين المهملتين والقاف المفتوحة ولام والف وآخره نون: مدينة حسنة من بلاد الشام، ولها سوران ذات بساتين وثمار، وفيها آثار قدرته وهى فى زماننا خراب ليس فيها ساكن۔

اور مثلاً ''الاسفرائنی'' کا تلفظ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: بلدة بخراسان بنواحى نيسابور فى تنصيف الطريق الى جرجان.

اور اسی طرح ''نیسابور'' کی تحقیق کرتے ہوئے بھی صحیح تلفظ ذکر کرکے: بلدة من خراسان سے اس کی وضاحت کی ہے، ایک محدث کے نام کے بارے

میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وکان کما قال الحافظ ابوبکر بن نقطة بنون مضمومة ثم قاف ساكنة بعدها طاء مهملة وهاءِ تانيث اسم جارية ربت جدته ام ابيه عرفوا بها.

اسی طرح کئی مقامات پر اصول حدیث کی اصطلاحات اور قواعد کے سلسلہ میں مختلف محدثین کے اقوال نقل کرنے کے ساتھ ان کے درمیان بہترین انداز میں تطبیق پیش کرتے ہیں اور باہمی تعارض وتطبیقات میں بھی واضح انداز اختیار کرتے ہوئے اصول حدیث میں اپنی انفرادی اور اجتہادی شان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

لہذا ایک مقام پر عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وانما قال:المرادبالطرق الاسانيد وان كان ما سبق مغنيا عنه للتنبيه على ان ما ذكره من التفسيرليس مدلولا حقيقيا لطرق وانما هو استعارة عن السبل۔(ص:٦٢)

کسی مشکل لفظ کی لغت وتشریح نقل کرنے میں لغات کی کتابیں تاج العروس، جوہری وغیرہ کا حوالہ دے کر سمجھاتے ہیں۔ اصول حدیث بیان کرتے ہوئے اصول فقہ کے ماہرین کے اقوال بھی کثرت سے نقل کرتے ہیں۔خاص کر کے ابن الحاجب، الآمدی، تفتازانی، ابن حزم، صیرفی، قفال وغیرہ کے حوالے بھی بکثرت موجود ہیں۔

حدیث مرفوع کی تعریف میں حافظ ابن حجر کی عبارت "ان يخبر الصحابى انهم كانوايفعلون فى زمان النبي كذا" اس کی تشریح بہت ہی مختصر مگر جامع عبارت سے یوں کرتے ہیں،ای بالاضافةالى زمن النبى لا الى حضرته۔

کچھ اعتراضات کے جوابات عقلی ونقلی انداز میں بھی دیے ہیں، اسی طرح محدثین کے کلام کے کثرت سے حوالے ، وسعت مطالعہ اور امعان نظر پر دلالت کرتے ہیں۔

محقق مولانا عبداللہ الخطیب صاحب بھی کلمۃ المحقق میں فرماتے ہیں: وجدت المصنف قداجتهد فی حل عبارة الکتاب اجتهادا بالغا، وسعی فی توضیح مسائلها سعیا مشکورا،واعرض عن الاسهاب والتطویل والمباحث الطویلةاعراضا کلیاً حتی لا یسآمه الطالب المبتدی۔

اسی طرح ص:۱۴ پر تحریر فرماتے ہیں: کانت له المهارة التامة فی حل العبارة وتوضیح المسئلة وتبیین المراد من الکلام ۔ ویقول العلامة عبد الحی الحسنی "کانت له الید الطولی فی حسن التصنیف وجودة العبارة والترتیب والتقسیم والتبیین"۔

محقق کتاب مولانا نے ایک عجیب بات یہ بھی لکھی ہے کہ حضرت شاہ وجیہ الدین صاحب کی یہ کتاب ملا علی قاری کی شرح نزھۃ النظر کی اساس اور بنیاد ہے،فرماتے ہیں: فان علی القاری اخذ حظا کبیرا ونصیبااوفر من الاستفادة بهذا الکتاب واکثر منه النقل فی شرحه لکنه لا یصرح باسمه فی اکثر المواضع بل ینقل کلامه قائلاً "قال شارح" وتارة یقول "قیل "وفی بعض المواضع نقل کلامه ولم ینسبه الیه۔

دونوں شرحوں کا مقارنہ اور موازنہ کرنے کے بعد محقق صاحب نے یہ نتیجہ اخذ

کیا کہ ملا علی قاری کے الشارح سے مراد حضرت شاہ وجیہ الدینؒ ہی ہیں، چنانچہ ملا علی قاریؒ نے دو جگہوں پر قال الشارح وجیہ الدین الھندی یا الشارح وجیہ کی صراحت بھی کی ہے، اور جہاں شاہ وجیہ الدین صاحبؒ کو وہم ہوا اس جگہ محقق صاحب نے شرح ملا علی قاریؒ سے رجوع کیا تو وہاں ملا علی قاریؒ کو بھی وہم کا شکار پایا۔

رسالۃ المحمدیہ: یہ رسالہ تصوف میں ہے، جس میں ایک مقدمہ، دو مطلب اور تکملہ ہے، مقدمہ میں موضوع، مبادی اور مسائل کا ذکر ہے، مطلب اول کا عنوان ہے "فی التفویض بین مذهب اهل السنة والجماعة من المتكلمين والمتصوفة"، اس کی ابتدائی عبارت اس طرح ہے :قد ثبت عند اهل السنة والجماعة من المتكلمين ان كل واحدة من صفات الله تعالى صفةواحدة قديمة غير متناهية ،لاذاتا ولا تعلقا،اما ذاتا فلان التناهى من خواص الكم ولا كم ثم۔

تکملہ میں اولیاء کی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے قطب العالم، قطب الاقطاب، غوث، اوتاد، ابدال، النقباء، الامناء وغیرہ کی تعریف اور ان کے ذمہ سونپے گئے امور کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

شیخ الشریف میرزا محمد دائم الہندی نے الاضافات الاحمدیہ کے نام سے اس کی شرح بھی کی ہے، جو محقق محمد جلال رضا صاحب کی تحقیق کے ساتھ قاہرہ مصر سے چھپ چکی ہے، اور حضرت پیر محمد شاہ صاحب کے کتب خانے کی زینت بنی ہوئی ہے۔

رسالۃ حقیقۃ محمدیہ کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، جو کتب خانہ پیر محمد شاہ کے ناظم

مولانا محمد سملکی صاحب کی زیر نگرانی ۱۹۷۶ء میں چھپ چکا ہے، اکابرین گجرات کے مصنف مولانا عبدالحی کفلیتویؒ نے اپنی گجراتی کتاب کے دوسرے حصہ ص: ۳۴۴ پر اس تکملہ کا ترجمہ اردو میں شائع کیا ہے۔

حاشیہ علی البیضاوی، حاشیہ علی التلویح اور حاشیہ علی مختصر المعانی کے بھی کچھ صفحات کا بندہ نے مطالعہ کیا؛ تو اس میں بھی حضرت کا زورِ قلم فصاحت و بلاغت اور ادبی شہ پاروں کے ساتھ اصل فن کے مضامین کو بھی بہت عمدہ طریقہ سے آسان فہم میں بیان کرتا ہوا رواں دواں ہے، حضرت نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کتابوں کے مشکل مضامین طلبہ کی سمجھ میں آجائیں، ان کتابوں میں بھی وہ تمام خصوصیات ہیں؛ جو شرح نخبۃ الفکر میں ذکر کی گئیں، فن کے ساتھ زبان کی چاشنی سے بھی طلبہ کو محظوظ کیا ہے۔

حضرت مولانا ابو الظفر ندوی صاحب نے تذکرۃ الوجیہ کے مصنف سید حسین پیر علوی صاحب کی فرمائش پر کتب خانہ پیر محمد شاہ میں موجود حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کی کتابوں پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، ان میں سے کچھ کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

توضیح تلویح :

جہاں جہاں اصل کتاب کا حوالہ ہے وہاں سرخی سے قولہ لکھ دیا ہے، مختلف مقامات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ تشریح کرتے وقت طلبہ کے ذہن نشین

کرانے کی بے حد کوشش کی گئی ہے، مثلاً حقیقت ومجاز کی بحث میں ایک جگہ صاحب تلویح نے لکھا ہے: ففیہ نظر، اس نظر کے پیچیدہ مطالب کو جناب شاہ صاحب نے حاصل النظر کے عنوان سے بہت سہل عبارت میں تحریر فرمایا ہے تاکہ طالب کے دماغ پر زیادہ بار نہ پڑے، پھر اس نظر کا جو جواب دیا جاتا ہے اس کو تحریر فرما کر حاصل الجواب کے عنوان سے اس کی تشریح فرماتے ہیں، سید شریف جرجانی کا اس پر اعتراض نقل کر کے پھر خود اپنا جواب تحریر فرماتے ہیں، اس خیال سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جناب شاہ صاحب کا اس طرز تحریر سے کیا منشا تھا؟ اور کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

حاشیہ علی المواقف

اس بات سے تو ہر اہل علم واقف ہے کہ یہ کتاب علم کلام کی معرکۃ الآراء کتابوں میں سے ہے، اور اسی لیے اس کی متعدد شرحیں اور حواشی لکھے گئے، جناب شاہ صاحب کا طریقۂ بیان اس کتاب سے بھی واضح ہے، ہر جگہ حاصل الکلام پر حاصل الجواب وغیرہ کے عنوانوں سے تشریح کی ہے، اور ہر پیچیدہ عبارت کو آسان اور سہل طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، لیکن جہاں ذات واجب الوجود کے متعلق کوئی تذکرہ آجاتا ہے، تو الفاظ شاندار اور معانی خیال بہت بلند ہوجاتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا ذوق وشوق رہبری کر رہا ہے مثلاً کتاب کی ابتداء میں ہے: سبحات جماله عن سمة الحدوث وتنزّهت سراوقات جماله عن وصمة التغير والانتقال.

رسالہ انسکر یہ

اس رسالہ کا نام رسالہ انسکر یہ فی اجوبۃ الطفقر یہ مولانا علی قوشجی علی بحث ماانا قلت فی المطول ہے، معانی وبیان پر ''تلخیص المفتاح'' جلال الدین محمد بن عبد الرحمٰن قزوینی متوفی ۷۳۹ھ کی مشہور کتاب کی بحث: ماانا قلت پر مولانا علی قوشجی نے چند اعتراضات کیے تھے یہ ان کے جواب میں ہے۔

یہ رسالہ ۹ مبحث پر مشتمل ہے جن میں سے بعض بہت ہی مختصر اور بعض طویل ہیں، طرز تحریر یہ ہے کہ پہلے تلخیص المفتاح کا مسئلہ لکھا ہے، پھر شریف جرجانی کا اعتراض نقل کر کے علامہ قوشجی کا نظریہ بیان فرمایا ہے، اور آخر میں اپنا جواب تحریر کیا ہے، جہاں علامہ قوشجی کا اعتراض شروع ہوا ہے وہاں سرخی قولہ ہے اور جس جگہ سے جواب دیا ہے اس کی ابتدا اقول سے ہے، اور بدقسمتی سے یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ اس رسالہ کا نام ''انسکر یہ'' کیوں رکھا اور کس مناسبت سے؟ میرا ذاتی خیال ہے کہ جناب شاہ صاحب کا ایک دوسرا رسالہ ''انکریہ'' ہے ، جو غالبا انکار سے ہے، جس میں ایک کفر کے فتوے کی تردید کی ہے، کاتب نے اسی لفظ کو ''انسکر یہ'' سے تبدیل کر دیا۔

حاشیہ بیضاوی

یہ حاشیہ بے حد مقبول ہوا، دسویں اور گیارہویں صدی میں عرب وشام میں عام طور پر زیر درس تھا، شرح تفسیر قولہ کر کے شروع کرتے ہیں، حواشی مختصر مگر واضح اور موضح ہیں۔

وافیہ شرح کافیہ

ناقص از ابتداء ووسط تھی، تقطیع متوسط اور کرم خوردہ ہے، اس کے آخر میں لکھا ہے: کاتبہ و مالکہ حامد بن شاہ وجیہ الدین علوی۔

رسالہ قوشجی فی الھئیۃ فارسی

اس کتاب پر حضرت شاہ علوی کا حاشیہ ہے، مختلف نقشے بھی ہیئت کے ہیں، بالکل بوسیدہ اور کرم خوردہ ہے، بس تبرک ہی تبرک ہے، یہ بھی قاضی صاحب موصوف کے حصہ میں آیا ہے۔

حواشی علی المحصل للعلوی

اس کے ابتدا میں ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم ،قولہ موردھا ومصدرھا اور اس کے آخر میں ہے: ولیس ھذا یفید للجمع وانما ھو بیان لالحلاق ای الحلاق الجمع ،کل صفحہ ۹، خط نسخ ہے، پٹن کے مشہور خاندان جمال الدین قطب و محمد سعید قطب کے ذاتی کتب خانہ میں یہ موجود ہے۔

شرح جام جہاں نما

جام جہاں نما تصوف میں مشہور متن ہے، اس کے مصنف محمد بن عز الدین بن عادل بن یوسف مغربی مشہور بہ سیرین ہیں، ۷۸۵ھ کی تصنیف ہے، عام صوفیوں میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی مختلف شرح لکھی گئیں۔ جناب شاہ صاحب نے بھی ایک شرح تحریر فرمائی ہے ،اس کے دو نسخے اس کتب خانہ میں موجود

ہیں، جہاں متن کی اصل عبارت ہے ، وہاں سُرخ خط کشیدہ ہے۔

یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور متن کی ابتداء یوں ہوتی ہے:

حمد بے حد وشکر بے عد سزائے ذاتی کہ وحدتش منشاء احدیت وواحدیت شد۔اس کے بعد اس کی شرح اس جملہ سے ہوتی ہے، یعنی وحدت کہ اصل قابلیات جمیع اشیاء است، احدیت واحدیت از وناشی است، اس کتاب کا اختتام اس فقرہ پر ہوتا ہے: ترک قیل وقال واستغراق درحق است وصفات حق۔ ذاتہ ذاتہ صفاتہ صفاتہ افعالہ افعالہ، درپیش است، تمام شد۔ اس کتاب کا موضوع علم التوحید ہے، اور اس کے ابواب کی تقسیم مندرجۂ ذیل طریقہ سے کی گئی ہے۔

کتاب کے دو حصہ ہیں، ہر حصہ کا نام دائرہ ہے، اور ہر دائرہ میں دو قوس اور ایک خط ہے، دائرہ اول میں مندرجہ ذیل مضامین ہیں۔ احدیت، واحدیت، وحدت، اعتبار، وجود، علم، شہود، نور، تعیین یا تجلّی اوّل۔

دائرہ دوم کے مضامین حسب ذیل ہیں: ظاہر وجود (باصطلاح فلاسفہ واجب الوجود) ظاہر علم (باصطلاح فلسفی ممکن الوجود) برزخیت (باصطلاح مذکور حقیقت اضافی یا روح) تعیین یا تجلّی ثانی۔

الغرض اس کتاب پر حضرت شاہ صاحب نے شرح لکھی ہے، حمد وصلوۃ کے بعد علم توحید پر آپ نے جو شرح کی ہے، اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

علم توحید علمی ست کہ شناختہ شود باد۔ کہ وجود نیست، واشیاء نیست مگر مجالی مظاہر حق وموحد آں بیند غیر حق را وجود، ونمی دانند اشیا را مگر مظاہر ومجال حق، ومعنی تحقیق

نزد ایشاں شہود حق است فی صورۃ اسماء او۔ پس ممتزج نشو محقق از خلق، و نہ بخلق از حق، و معنی تجرید نزد ایشاں ازالہ ماسوا است از قلب، و سیر بسوے رویت ظہور حق۔

رسالہ حقیقت محمدیہ

یہ رسالہ عربی میں تصوّف کے مسائل پر آپ کی تصنیف ہے۔ اہل تصوّف نے جو اصطلاحات عوام سے بچنے کی خاطر مقرر کی ہیں ان کو آپ نے اپنے طریقہ پر سمجھایا ہے، اور اسماء الہیہ کے تکوینی مرتبہ کی طرف جو اسماء رہبری کرتے ہیں ان کو مختصر طور پر بیان کر دیا ہے، گویا اس مختصر رسالہ میں آپ نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

الغرض باعتبار درس و تدریس و کثرت تصانیف، گجرات میں آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوا۔ آپ کی تصانیف کی اس قدر مقبولیت تھی کہ علماء اپنے درس میں ان سے استفادہ حاصل کرتے تھے، جامع از ہر مصر میں بعض کتب داخل نصاب تھیں، شیخ عثمان ابن منجھن سارنگ پوری مالوی کہتے ہیں کہ ایک روز شیخ منوّر ابن عبد المجید لاہوری نے بیان کیا کہ وجیہ الدین کے حاشیے دور اندیش اور بلند نظر نکتہ سنجوں کی نظر میں کمالِ علمیت کا کوئی رنگ نہیں رکھتے، شیخ عثمان نے کہا کہ بزرگوار محشی کا انداز تعلیقات میں یہ ہے کہ جو بات طلباء کی سمجھ میں نہ آسکے اس کو آسانی کے ساتھ کسی کنایہ یا اشارہ سے ذہن نشین کرا دیں، مگر معترض اس کو نہ سمجھ سکا، اتفاقاً چند روز درس کے وقت مختصر عضدی کی شرح میں ایک عبارت ایسی آئی کہ کسی صورت سے حل نہ ہو سکی، ناچار حضرت کے حاشیہ پر توجہ کی اور تھوڑی دیر غور کرنے پر وہ مسئلہ کھل گیا۔

عشقیہ اشعار

گاہے گاہے آپ نظم کی طرف بھی مائل ہو جاتے تھے، وجیہہ آپ کا تخلص تھا۔

ذیل کے اشعار سے آپ کے اعلیٰ تخیل کا انداز ہو سکے گا، جن میں عاشقانہ رنگ میں تصوّف کے نکات کو ادا کیا ہے، یہ غزلیں پیر محمد شاہ شطاری کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئی ہیں۔

زہے در سروری سلطان دلہا — فدائے خاک پایت جان دلہا
لب لعلت بدل جوئی طبیب است — کہ میجویند ازو ارمان دلہا
بروہ بہ یک فسوں زکف جان ودن خراب را — سرِ نہانِ من مدہ قلزمِ اضطراب را
محوشداز تغافلت صبروشکیب دین دل — رخصت نازوعشودہ نرگس نیم خواب را
ازپئے صلح وجنگ من لطف وعنایت ایست خویش — ربط نداد ہیچ گہ گرچہ بشعلہ داب را
شوق رابسوء اوگرم بردکشاں کشاں — قدر نمی شناختم لذت اضطراب را
قدرتے نیست تا کند پنجہ بہ پنجہ غمش — آنکہ بحسن تافتہ پنجۂ آفتاب را
شب کہ زعیش بیخودی عشق تو تاب زد بہ دل — زلف تو داد سر بمن ایں ہمہ پیچ وتاب را
ساقئ ماکہ ازطرب بادہ جام می کند — برسردست میدہد جلوۂ آفتاب را

آپ کے اقوال زرّیں

آپ کے زمانہ میں حکومت کی زبان فارسی تھی، علماء وشرفاء فارسی ہی میں بات چیت کرتے تھے، کبھی کبھی ضرورت کے وقت اُردو (جو گجراتی میں گوجری نام سے مشہور تھی) اور قریباً آپ سے سوا سو سال پیشتر اس زبان کا رواج تھا، صوفیائے کرام کے بعض بعض اقوال گوجری زبان میں بھی پائے جاتے ہیں، درس کے درمیان اور کبھی درس کے بعد آپ شاگرد اور خلفاء کی مجلسوں میں تشریف فرما ہوتے تو آپ کی زبان معجز بیان سے جو ارشادات وکلمات صادر ہوتے ان کو آپ کے شاگردوں

نے مختلف رسالوں میں جمع کیا ہے،جن کے مطالعہ اوران پرعمل کرنے سے دینی ودنیاوی بہبودی حاصل ہوتی ہے۔

''خدائے قدوس کا ہمیشہ ذکر کرو۔

ذکر سے وسوسے دورہوتے ہیں،اوردل کی صفائی حاصل ہوتی ہے ۔

دل کی صفائی کا نشان شوق اورولولہ محبت ہے۔

خدا سے غافل کرنے والی عادت سے بچواورغفلت لانے والی شیئ کوترک کردو۔

خدا کی بھی مرضی ہے کہ سب اس کو پہچانیں۔

علم اورشغل دونوں حاصل کرو؛ کیوں کہ دونوں کا مقصدایک ہے ۔

شغل کرنا ریاضت سے بہتر ہےاورخلوت اس سے زیادہ مفید ہے۔

ایام شغل میں کشف وکرامت کا انتظار نہ کرو۔

راحت سے سستی ہوتی ہے،حلاوت نہیں ملتی۔

دنیا کوترک کردو،خدامل جائے گا،اوردنیا سے دورہوخدا تم سے قریب ہوجائے گا۔

جوانی کی ریاضت بہت مفید ہے ،جوانی میں جتنا سلوک اورریاضت ہوا اتنا ہی زیادہ مفید ہے۔

مرشد کی اجازت کے بغیر ریاضت ومجاہدہ کرنا محض مُغز سکھانا یابدن کوضعیف کرنے کا سبب ہوتا ہے۔

مجاہدے اورریاضت سے فتوحات کا باب کھل جاتا ہے ؛مگرحجاب نہیں

ہٹتا۔

راحت اور تکلیف میں نفس کا رجحان معلوم کرو تا کہ آئندہ حال میں سنبھل سکو۔

نفس خطرہ میں مبتلا کر دیتا ہے ؛ ذکر کرو خطرے دور ہو جائیں گے۔

کسی کو شغل سے کسی کو فکر سے کمال حاصل ہوا اور کچھ ذکر سے درجۂ ولایت پر پہنچے۔

روحانی اشتغال سے کشائش اور باطنی ترقی حاصل ہوتی ہے۔

ضعیفوں کی امداد کرنا، غریبوں سے حسنِ سلوک کرنا، ہاتھ کی عبادت ہے۔

خویش و اقرباء سے ملنا، علماء اور اولیاء اللہ سے ملنا، پاؤں کی عبادت ہے۔

مناظر قدرت دیکھ کر خوفِ الٰہی پیدا ہونا اور گریاں ہونا، آنکھ کی عبادت ہے۔

دنیا سے قطع تعلق اور عقبیٰ کی طرف رجوع کرنا دل کی عبادت ہے۔

کلام الٰہی اور مقبول دعاؤں کا پڑھنا زبان کی عبادت ہے۔

فرمایا کہ تلاوت قرآن مجید ہمیشہ کرتے رہو، اور جو چیز حضور حق میں غفلت کا سبب ہو اس سے پرہیز کرو۔

کشائش اور ترقی زیادہ روزہ رکھنے سے نہیں ہوتی بلکہ شغل سے زیادہ ترقی ہوتی ہے۔

صوفی ماسوا کو بالکل بھول جائے، اس کا جو کام ہو وہ اللہ کے لئے ہو؛ تا کہ باطنی کشائش سے بہرہ حاصل ہو، اور جب وہ من كان لله فكان الله له کے مطابق ہو جائے گا ، تو بغیر طلب ضرورت کے اسباب مہیّا ہو جائیں گے، اور یہی مطلب ہے من ترك الكل وجد

الکل کا اگر طالب شغل و عمل سے گھبرائے تو اس کو لازم ہے کہ ان لوگوں کو موحد علماء کی کتب جن میں توحید و علم باطن کا بیان ہو پڑھنے کا حکم کرے۔(تذکرۃ الوجیہ:۷۹)

ملفوظات حضرت وجیہ الدین: بحر الرائق کے نام سے آپ کے ملفوظات کا مجموعہ معروف ہے، جو تاریخ زبان اردو مصنفہ شمس اللہ قادری اور اردو کی ابتدائی نشونما مصنفہ مولوی عبدالحق میں مطبوع ہیں۔

گوجری زبان کا نمونہ : کسی نے پوچھا، عارف کس کو کہتے ہیں ؟فرمایا: اسے کہویں جو خدا سوں بھریا۔

اور فرمایا کشف کی طلب نہ کرو، اپنوں کو کیا کشف ہوئے یا نہ ہوے، اے کام اس کا ہے یعنی یہ کام خدا کا ہے ، ہمارا کام مشغول رہنا ہے، کشف ہو یا نہ ہو، مشغول رہنا چاہیئے ، نہ کہ منتظر کشف۔

کسی عزیز نے پوچھا کہ اخلاص کا کیا مطلب ہے، فرمایا: اخلاص سے نیت مراد ہے، فرمایا جس چیز میں ذوق پاوے اسے ترک نہ دیوے۔ کسی نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو چلّہ میں بیٹھوں، فرمایا اس سے اور کیا خوب ہے کہ اس دنیا میں یہ دل خدا سے مشغول ہو۔

فرمایا اگر کسی کو تھوڑی بھی صفا حاصل ہوئی اور اس نے حرام لقمہ کھاوے، یا کوئی اور حرام کام کرے تو تنبیہہ پاوے دوجے بار بھی پاوے، تیجے بار بھی پاوے، اس کے بعد بھی احتیاط نہ کی تو دل سیاہ ہو جاتا ہے، پھر نیکی اور بدی کا فرق نہیں رہتا، اور حیوانوں کی طرح ہو جاتا ہے، فرمایا حق تعالی قادر مطلق ہے اور یہ بندہ قاصد اور عادت اللہ یوں

جاری ہے، کہ جب بندہ قصد کرے، مقصد حاصل ہو جائے۔ (تذکرۃ الوجیہ:۸۳)

شیوخ سے تعلق: آپ نے متعدد بزرگوں سے فیض پایا، پہلے اپنے والد سے چشتیہ اور مغربیہ سلسلہ کی تعلیم پائی، پھر قاضی خاں چشتی المشہور بہ قاضی قاضن چشتی نہروالی (مدفون بہ پٹن) کی صحبت میں رہ کر علوم باطنی حاصل کرتے رہے ان کے انتقال کے بعد میاں بدرالدین ابوالقاسم سہروردی سے تعلق قائم کیا، جب جذبۂ شوق کا غلبہ ہوا تو سید کبیرالدین مجذوب کی خدمت میں حاضر ہوئے، نیز آپ نے شیخ نجم الدین صدیقی سے بھی فیض پایا، آخر میں سید غوث گوالیاری شطاری کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوگئے۔

اوصاف وکمالات: علامہ وجیہ الدین بڑے صاحب صدق واخلاص تھے ،قناعت اور سخاوت کے پیکر تھے، جو کچھ حاصل ہوتا طلبہ پر صرف کردیتے ،اپنے دولت کدہ اور مسجد میں عبادت وتدریس کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔مولانا سید عبدالحیؒ ''نزھۃ الخواطر''میں تحریر فرماتے ہیں:وکان صاحب صدق واخلاص ،قانعا باليسير ،شريف النفس،لا يمتاز عن احد الناس فى الملبس، ويبذل على الطلبة والمحصلين عليه ما يفتح له، ويختار الثياب الخشنة فى اللباس مع انقطاعه إلى الدرس والإفادة والاشتغال بالله سبحانه والتجرد عن أسباب الدنيا ،لم يتردد إلى بيوت الأمراء والأغنياء إلا مرة أو مرتين مكرها ، فما رآه أحد إلا فى بيته أو فى المسجد مشتغلا بالإفادة والعبادة۔(شرح نزهة النظر: ١٥)

مدرسہ کا قیام : آپ نے ۹۳۴ھ میں خانپور احمد آباد میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اس کا نام مدرسہ عالیہ علویہ رکھا۔ ۸۴/سال کی عمر تک اسی مدرسہ میں درس دیتے رہے، آپ کی طبیعت پر طریقت وسلسلہ کا اور باطنی شغل کا اس قدر غلبہ ہوا کہ کبرسنی میں درس وتدریس بھی موقوف فرمادی، اور ہمہ تن طریقت ہی کے ہوکر رہ گئے، اسی اثناء میں ایک رات سرور دو عالم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مدرسہ میں درس دینا نہ چھوڑو، اس ارشاد عالی پر دوبارہ درس دینا شروع کردیا اور تادم آخر یہ خدمت انجام دیتے رہے، مذکورہ خواب کے بعد مدرسہ کا نام تبدیل کرکے مدرسہ درسِ محمدی رکھ دیا۔

مدرسہ درس محمدی کے ہونہار فضلاء میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں: حضرت غوث گوالیاری کے چاروں صاحبزادے، شیخ محمد بن فضل اللہ، علامہ صبغۃ اللہ بھروچی، شیخ اسحاق بھروچی اور سید جلال الدین ماہ عالم۔

زہد وقناعت : آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی، موٹا کپڑا پہنتے تھے اور عام لوگوں کی طرح رہتے، جو کچھ آتا دوسروں پر خرچ کردیتے، امیروں کے گھر پر خود کبھی نہ جاتے، ایک دو مرتبہ حکامِ وقت کی طلب پر مجبوراً جانا پڑا؛ ورنہ گھر اور مسجد کے احاطہ سے باہر قدم نہ رکھتے۔ (مشائخ احمد آباد: ۲۷۷)

شاہ وجیہ الدین کا کتب خانہ: شیخ وجیہ الدین کے مدرسہ کا کتب خانہ بہت بڑا تھا، لکھا ہے کہ اس میں مختلف مضامین کی بہت سی کتابیں تھیں، یہ مدرسہ بقولِ مصنف ’’یادایّام‘‘ احمد آباد میں سب سے زیادہ مشہور تھا، اسے علامہ وجیہ الدین نے ۹۳۴ھ میں

قائم کیا تھا، جہاں وہ خود تادمِ وفات (۹۹۸ھ) تعلیم دیتے رہے،اس مدرسہ کا فیض ان کے بعد ۲۳۸/برس تک جاری رہا،علامہ وجیہہ الدین کا علمی مرتبہ علماء گجرات میں نہایت بلند تھا،انہوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں اور علامہ کے شاگرد جس طرح احمد آباد سے لاہور تک پھیلے ہوئے تھے،اسی طرح ممدوح کے مدرسہ اوراس کے کتب خانہ کا شہرہ احمد آباد سے لاہور تک گونج رہا تھا۔

''تمدنی کارنامے'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ علامہ شاہ وجیہہ الدین (متوفی ۹۹۸ھ) احمد آباد میں بڑی مقدس ہستی تھی، ۹۳۴ھ میں آپ نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جوآپ کی وفات کے بعد ۱۲۳۶ھ تک قائم رہا،اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، یہ کتب خانہ بہت بڑا تھا،اور ہر فن کی کتابیں اس میں موجود تھیں، بزرگوں کا بیان ہے کہ دو بڑے کمروں میں بے ترتیبی سے کتابیں بھری تھیں،لیکن جب خاندان میں علم کے قدرداں نہ رہے تو کتابیں بھی ضائع ہوگئیں۔

شیخ وجیہہ الدین مصنفین کی نظر میں

''النورالسافر'' میں تحریر ہے کہ: ۹۹۸ھ میں شیخ وجیہہ الدین نے احمد آباد میں انتقال کیا،آپ بڑے زبردست عالم وزاہد تھے اور لوگوں میں زبردست مقبولیت تھی۔

بہت سے فنون میں طلباء نے آپ سے نفع اٹھایا اور آپ کا معاملہ بہت ہی زیادہ مشہور ہوگیا تھا۔

آپ کے معاصر مشہور مؤرخ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں: میاں وجیہہ الدین احمد آبادی، اپنے زمانہ کے بڑے عابدو متقی عالم تھے،شریعت کی نہایت پابندی

کرتے اور گوشہ نشینی ان کا شعار تھا، ہمیشہ دینی علوم کے درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے، تمام علوم عقلی ونقلی پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ درسی کتابوں میں صرف حاوی سے لے کر قانون، شفا، شرح مفتاح اور عضدی جیسی کتابوں میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انہوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو، ایک مخلوق ان سے فیض اٹھاتی رہی، اللہ تعالی نے انکی دعا میں بڑا اثر دیا تھا، اور شفا رکھی تھی چنانچہ ہر روز بے شمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لئے آتے تھے اور ان کی دعا کا بھی بہت جلد اثر ہوتا تھا، وہ کبھی اپنے طور پر دنیاداروں کے گھر بھی نہیں گئے بجز ایک دوبار کے، وہ بھی طلب کرنے پر نہایت کراہت کے ساتھ، اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم جمعہ کی نماز کے سوا باہر نہیں نکلتا تھا، سب کے مرجع ومرکز تھے، وضع ولباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے، موٹے جھوٹے کپڑوں پر ہی قناعت کرتے تھے، ارادت کا تعلق تو کسی اور سے تھا، لیکن شیخ محمد غوث سے تربیت وارشاد حاصل کیا تھا اور آدابِ طریقت میں ان کے پیرو تھے، انہیں کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی، صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی۔

مشہور مؤرخ اور آپ کے معاصر خواجہ نظام الدین احمد بخشی لکھتے ہیں کہ میاں وجیہ الدین گجراتی پچاس سال جادۂ ارشاد وہدایت پر متمکن رہے، فقر وفاقہ اور توکل میں زندگی بسر کی، ہر وقت درس دیا کرتے، علوم نقلی وعقلی سے بھی خوب آگاہ تھے، آپ کی تصانیف نہایت عمدہ ہیں اور اکثر علمی کتابوں پر آپ نے شروح وحواشی لکھے ہیں، ملا عبدالباقی نہاوندی نے آپ سے استفادہ بھی کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے اکثر متبحر علماء میاں صاحب موصوف سے شاگردی کا تعلق رکھتے ہیں۔

اس زمانہ کے فضلاء میں کوئی جامعیت میں ان کی ہمسری نہیں کرسکتا، مجاہدۂ نفس اور دنیاوی لذتوں سے کنارہ کشی میں کمال درجہ کوشش کی ہے، تزکیۂ نفس میں اعلی مقام رکھتے ہیں، میاں صاحب کے عمدہ احوال کی حد درجہ شہرت ان کے تفصیلی حالات بیان کرنے سے روکتی ہے۔

جید عالم شیخ عبدالقادر عیدروسی لکھتے ہیں: وہ اصحاب علم وزہد میں تھے، انہیں لوگوں میں بڑی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی، طلبہ نے آپ سے بہت سے فنون میں نفع اٹھایا اور اس کی بڑی شہرت ہے۔

مشہور مؤرخ معتمد خاں لکھتے ہیں کہ شیخ وجیہہ الدین شیخ محمد غوث کے خلفاء میں ہیں، لیکن ایسے خلیفہ کہ مرشد بھی ان کی خلافت پر ناز کرے، بہت کم ہوتے ہیں، شیخ وجیہہ الدین ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے آراستہ تھے۔

شیخ وجیہہ الدین کے مدرسہ کا فیض اور عمارتیں: علامہ شاہ وجیہ الدین متوفی ۹۹۸ھ ۱۵۸۹ء کے عہد میں احمد آباد کے شاہی محل کے بالمقابل (جہاں آج پارسی کلب ہے) روضہ شاہ وجیہہ الدین کے متصل یہ مدرسہ قائم کیا گیا تھا، یہ درحقیقت اس زمانہ کی یونیورسٹی تھی جس سے گجرات، خاندیس، کاٹھیاواڑ اور دکن کے مدارس ملحق تھے۔

اس مدرسہ میں منطق، فلسفہ، تصوف اور علوم دینی کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا، اس کے ساتھ ایک دارالاقامہ بھی تھا، جس کے شکستہ حجرے اب تک موجود ہیں، جہانگیر کے عہد میں طلبہ کے لئے وظائف بھی مقرر تھے اور اس پر متعدد گاؤں وقف تھے۔ ۹۵۰ھ سے ۹۹۸ھ تک شاہ صاحب اس کو خود چلاتے رہے پھر ان کے لڑکے

اور پوتے چلاتے رہے، گیارہویں صدی کے آخر تک یہ پورے عروج پر تھا، مدرسہ ہدایت بخش قائم ہوا تو اس پر زوال آ گیا۔ (مشائخ احمد آباد: ۲۸۶۔۲۹۲)

خلفاء وتلامذہ : آپ کی یہ خصوصیت نہایت حیرت انگیز ہے کہ آپ سے فیض پانے والے جید عالم بھی تھے اور ولیٔ کامل بھی، آپ نے اپنی خداداد روحانیت وعلمیت سے جو خدمت خلق انجام دی اور جس میں تمام عمر صرف کی اس کے ثمر بھی اپنی زندگی میں دیکھ لیے۔

تلامیذ له بین الاراضی تراهم فی جمیع العالمینا

آپ کے خلفاء وتلامذہ سے اکثر علامہ، محدث، مفتی اور مُلّا کے القاب سے یاد کیے گئے، بعض مفتی کے منصب پر فائض ہوئے۔ بعض نے مسند قضا کو زینت بخشی، بعض نے علمی گوشہ میں درس وتدریس کی خاموش خدمت پسند کی، جس جگہ ان بزرگ ہستیوں کا قیام ہوا وہاں علمی وروحانی بزم آراستہ ہوگئی، غرض کہ آپ کے حلقہ درس وفیض تربیت سے ایسے باکمال مشائخ نکلے، جن کے انفاس قدسی کا فیض ہند وعرب تک پہنچا، جن میں شاہ صبغۃ اللہ بھروچی، مدنی اس پایہ کے بزرگ تھے کہ جب آپ عرب گئے تو علمائے حرمین نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر آپ کے فضل وکمال سے پورا فائدہ اٹھایا، قاضی جلال الدین ملاّ حسن فراغی، ملاّ عبدالرحمٰن گجراتی، اپنے علم وفضل سے اکبری اور جہانگیری عہد کے علماء میں شمار کیے گئے، ملاّ حسن فراغی کے تین لڑکوں نے اس مدرسہ میں مدتوں درس کی خدمت انجام دی، اسی طرح مولانا حسین شیبانی، مولانا محمد عثمانی، مفتی یونس، مفتی کمال محمد عباسی احمد آبادی وغیرہ ہیں جنہوں نے دکن، لاہور، آگرہ ، مالوہ وغیرہ میں اپنے استاذ کی زندگی میں جا بجا مدرسے قائم کیے، یہ وہ حضرات ہیں جن

کے انفاس قدسی سے ہزار ہا لوگوں نے فیض پایا اور بے شمار تشنگانِ علوم سیراب ہوئے۔
(تذکرۃ الوجیہ:۱۱۳)

ان کے علاوہ بھی آپ کی ذات ستودہ صفات سے بہت سے ایسے خلفاء اور بے شمار تلامذہ نکلے، جنہوں نے مختلف مقامات پر بودوباش اختیار کرتے ہوئے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے مخلوق خدا کو فیض پہنچایا، جن میں سے چند نام یہ ہیں۔

سید احمد مکی مولانا عبد الہادی، بایزید ثانی سرہندی، مولانا حسین شیبانی، سید اشرف بلگرامی، شیخ احمد بن رحمت اللہ، شیخ شریف بن عزیز اللہ صدیقی احمد آبادی، اور ان کے فرزند شیخ فرید محدث، ملاّ عبد الرحمٰن گجراتی، مولانا برہان الدین گجراتی، مفتی عبد الرحمٰن عباسی، شیخ جمال بن عثمانی، اور ان کے لڑکے محمد عثمان، مولانا محمد شفیع نورانی، محمد طاہر بن یوسف برہان پوری، سید علم الدین بخاری، شیخ مولانا محمد دکنی، مولانا یعقوب پٹنی، مولانا عبد اللطیف دھولقی، مولانا عبد القیوم، مولانا بہاء الدین، ملا عبد النبی احمد نگری، شاہ ابو الفتاح، مولانا نظام الدین، مولانا ابراہیم دکنی، شیخ ابو سعید شطاری سرنگ پوری (مالوہ) صوفی شریف جھجھانی، شاہ راجی درویش، شاہ کجن درویش، شاہ شیخ جی درویش، شیخ عبد العزیز بن عبد الکریم، شیخ حبیب صوفی، شیخ متھن، شاہ اویس اور شاہ اسمٰعیل، فرزندانِ غوث گوالیری وغیرہ ہیں۔ (تذکرۃ الوجیہ:۱۳۰)

وفات

آپ نے اپنی زندگی میں دس بارہ بادشاہوں کا عروج وزوال دیکھا، سات سال کی عمر تھی جب سلطان محمود بیگڑہ نے وفات پائی، زمانہ کی بائیس بہاریں جب

آپ نے دیکھیں تو سلطان مظفر دوم چل بسا اوراسی سال سکندر گجراتی مقتول اور محمود دوم معزول ہوا، تینتیس (۳۳) سال کی عمر میں سلطان بہادر گجراتی کو سمندر میں ڈوبتے ہوئے دیکھا، دہلی کے ہمایوں بادشاہ اور سلطان محمد فاروقی (خاندیس) کی چندروزی بہار بھی آپ کی نظروں سے گذری ،اکاون سال کے دور میں سلطان محمود ثالث کوقتل کر دیا گیا، جب آپ نے عمر کی اٹھاون منزلیں طے کیں تو سلطان احمد ثانی کو سابرمتی کے کنارہ مردہ پڑا پایا، دنیائے فانی کی خزاں کے ستر موسم گزرنے پر سلطان مظفرسوم ایک قیدی کی حیثیت سے اکبر کے دربار میں کھڑا نظر آیا، اوراس صدی کے اختتام پر اکبر کے جاہ وجلال کا بھی نظارہ کیا، آپ نے اس علم وفضل اور کثیر مقلّدین ومریدین کے باوجود کبھی کسی سیاسی کام میں دخل نہیں دیا، اور نہ حکام وعمّال سے ملنے کی کوشش کی ،آپ کی آخری عمر میں اس قدر جلد جلد سیاسی انقلابات برپا ہوئے اور انسانی خون کو جس طرح بے دریغ بہتے ہوئے ملاحظہ فرمایا، قدرتی طور پر اس سے بے حد متأثر ہوئے ہوں گے، دنیا کی اسی بے ثباتی نے تصوّف میں جو رنگ آمیزی کی ہوگی اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو اس بادۂ عرفان کا جرعہ کش ہو، تاہم ظاہر بینوں کے لیے شرح قلید مخازن اور شرح جام جہاں نما، ایک ایسا مصفّا آئینہ ہے جس میں اس کی جھلک بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ (تذکرۃ الوجیہ: ۹۲)

الغرض آپ نے اس عالم فانی سے اٹھاسی سال کی عمر میں بروز یکشنبہ صبح صادق کے وقت اُنتیس محرم الحرام ۹۹۸ھ میں رہگزائے عالم بقا ہوئے، آپ کی تاریخِ وفات لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ہے جس سے ۹۹۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔

العلامة الجليل المحدث العظیم طاهر الفتنی الغجراتی

فی ضوء شخصیته ومآثره العلمیة

۲۰۰۷ء میں ایم۔ایس۔یونیورسٹی بروڈہ کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا تھا، لہذا حضرت علامہ پٹنیؒ کی حیات وخدمات اورمآثرعلمیہ پرعربی زبان میں یہ تحریر پیش کی تھی۔

نیز مجمع الفقہ الاسلامی ہند اور جامعہ ملیہ دہلی کے اشتراک سے جنوری ۲۰۱۶ء میں ”التراث العربی فی الهند“ کے عنوان سے لوگوں کومختلف موضوعات پر مقالہ لکھنے کی دعوت دی گئی تھی، بندہ کے نام ”مجمع بحار الأنوار لمحمد بن طاهر الفتنی“ موضوع تھا، اس مقالہ میں غرائب الحدیث کی تاریخ، مذکور کتاب کا تعارف، اور خصائص وامتیازات پیش کیے گئے۔

اب یہ دونوں مقالے جمع کر کے پیش کیے جارہے ہیں۔

العلامة الجليل المحدث العظيم
طاهر الفتنى الغجراتى
فى ضوء شخصيته ومآثره العلمية

الحمد لله رب العالمين،والصلاة والسلام على رسوله الأمى الرؤوف الأمين وعلى آله وأصحابه ومن تبعه باحسان الى يوم الدين ،امابعد !

فان الحديث النبوى الشريف يمتلك مكانة مرموقة فى اعدادية روحانية ينشأ ويترعرع فيها اعضاء أسرة بنى آدم ، وتقوى شجرات الدين الاسلامى حتى تثمر وتؤتى أكلها كل حين باذن ربها. و لكن كلما ضعفت صلة أبناء بنى آدم بالحديث النبوى الشريف و كتب الحديث والسنة و معرفتهم بها على كثرة وجود الدعاة الى الله ، والمشتغلين بتزكية النفوس وتهذيب الأخلاق والزهد فى الدنيا و العمل بالسنة وطالت هذه الفترة غزت المجتمع الاسلامى، الزاخر باصحاب الاختصاص بالعلوم الاسلامية ، المتبحرين فى العلوم الحكمية والأدبية ، وفى عهد غلبة الاسلام وحكم المسلمين، بدعات طريفة و تقاليد عجمية و أعراف دخيلة حتى كاد يكون نسخة من مجتمع جاهلى، وصدقت النبوة المحمدية والحديث النبوى الصحيح " لتتبعن سنن من كان قبلكم شبرا بشبر، وذراعا بذراع "وخفت صوت الاصلاح وخبا مصباح العلم .

ومن شاء منكم فليستعرض الاوضاع الدينية و واقع حياة المسلمين فى

الـقرن العاشر الهجرى فى الهند، القرن الذى كادت صلة الأوساط الدينية و العلمية فى شبه القارة الهندية تنقطع عن علم الحديث الشريف ومصادر السنة الصحيحة ، و كانت تعيش فى عزلة عن مراكز العلم الدينى وتدريس الحديث الشريف، فى الحجاز واليمن، ومـصر و الشام ، وأصبحت مقتصره على كتب الـمذهب وشروحها وتدقيقاتها وكتـب الأصـول و الـحـكمة كيف فشت فيها البدع و عمت المنكرات ، و استـحـدثـت أشـكـال متـنـوعة لـلـعبـادات والـقربات ، وراجت سجدة التحية واتـخـذت القبور مسـاجـد واوقدت عـليهـا السـرج، و كثـرت الاعيـاد الدينية والاحـتـفالات فى ايام وفيات الاولياء والـصالحين وعمرت المشاهد واصبحت كـعبة الـقـاصـديـن حتـى قيـض الله تعالى لهذه البلاد مصلحين وعلماء ربانيين كالامام احمد بن عبد الاحد السرهندى والشيخ المحدث على بن حسام الدين المتقى والشيخ محمد طاهر بن على الفتنى الغجراتى الذين انكروا على شعائر الشرك والتقاليد غير الاسلامية الهندية انكارا شديدا حتى قاموا بتنقية بلاد الهند من شوائب الشرك و الوثنيه التى غرق فيها أهل الهند الى آذانها .

فـالشيخ محمد بن طاهر بن على الفتنى الغجراتى قام بالعزم على قلع جـذور البـدع والـخـرافـات التـى عـمّت فى منطقة غجرات حتى تم له النجاح الكامل فى هذا الحفل الميمون.

ترجمة المؤلف:

قـد تـولـد الشيـخ الـعالم الكبير المحدث اللغوى العلامة محمد بن

طـاهـر بـن عـلـى الـحنفى الگجراتى سنة ثلاث عشرة وتسع مائة بـــ" فتن"من بـلادگـجـرات ونشـأ بهـا، وحـفظ القرآن الكريم وهو لـم يبلغ الحنث، واشتغل بـالـعـلـم والـدراسة عـلـى استـاذ العصر "ملا مهنه " والشيخ الناگورى والشيخ بـرهـان الـديـن الـسـمهودى ، ومولانا يدالله الـسـوهـى، ومـا الى ذلك من علماء بـارعين، وفضلاء حاذقين فى عصرهم ومكث كـذلك نحو خمس عشرة سنة حتى بـرع فـى فـنـون عديدة وأحرز قصب السبق من بين جميع اقرانه فى كثير منها ، ورحل الـى الحرمين الشريفين سنة اربع و اربعين و تسع مائة فـخطر بالحج والزيارة واقام بها مـدة ، واخذ عن الشيخ ابى الحسن البكرى و الشهاب احمد بن حجر المكى، و الشيخ على ابن عراق ، والشيـخ جار الله بن فهد ، والشيخ عبيد الله السرهندى والشيخ عبـد الـلـه العيد روس والشيخ برخوردار السندى ، ولازم الشيـخ عـلـى بن حسام الـديـن الـمتقى، وأخذ عنه كما ذكر الشيخ نفسه فى كتابه مـجمع بحار الانوار ثم رجـع الـى الهـنـد وقصر همته على القيامى بالتصنيف والتدريس، و كان طريقته الاشتغال بعمل المداد اعانة لكتبة العلم بها.

قـال الـحـضـرمـى فـى " النور السافر" أنه كان على قدم من الصلاح والـورع والتبحر فى الـعـلـم، قـال: وبرع فى فنون عديدة وفاق الاقران حتى لم يـعـلـم أن أحدا من علماء گجرات بلغ مبلغه فى فن الحديث ،كذا قال له بعض مشائخنا .

وكـان رحـمـه الـله من البوهر ة الـمتـوطـنيـن بـكجرات الذين اسلم

اسلافهم على يد الشيخ على الحيدرى المدفون بـــ"كنبايه "ومضى لاسلامهم نحو سبع مائة سنة ، وعامتهم يكسبون المعاش بالتجارة وانواع الحرف كما يدل عليه اسم البوهرة، وهى مشتقة من بيوهار(BEWHAR) فى لغة اهل الهند معناه التجارة ، وهم فى العقائد على مذهب الشيعة الاسماعيلية وبعضهم سنّيون ارشدهم الى طريق اهل السنة جعفر بن ابى جعفر الگجراتى وكان اسماعيليا هداه الله سبحانه ، فقام بنصر السنة وقمع البدعة جزاه الله عنا وعن سائر المسلمين و الشيخ محمد بن طاهر بن على نفعنا الله ببركاته كان من اهل السنة والجماعة .

وكان سماحة العلامة الفتنى رحمه الله تعالى عزم على قمع المهدوية التى راجت فى عصره وعمت المدن والقرى، فعهد ان لا يلوث على راسه العمامة حتى تموت تلك البدعة التى عمت بلاد غجرات وكادت ان تستولى على جميع جهاتها .

فلما فتح اكبرشاه التيمورى بلاد گجرات سنة ثمانين وتسع مائة، واجتمع بالشيخ محمد بن طاهر عممه بيده ، وقال له "على ذمتى نصرة الدين، وكسر الفرقة المبتدعة وفق ارادتك" وولى على گجرات "مرزا عزيز الدين"اخاه من الرضاعة فاعان الشيخ ، وازال رسوم البدعة ما أمكن، فلما عزل مرزا عزيز ، وولى مكانه عبد الرحيم بن بيرم خان، اعتضد به المهدوية ، وخرجوا من الزوايا ،

فنزع الشيخ عمامته وسافر الى آگراه ، وتبعه جمع من المهدوية سرّا ،و هجموا عـليه فى ناحية أُجّين فقتلوه انزل الله تـعـالى عليه شآبيب رحمته وتغمده الله تعالى بغفرانه .

وقـد قيـل عـنـد ما عثر ابو الفضل وحزبه على ذهاب سماحة العلامة الـفتـنـى الـى مـديـنة آكره لهدف قمع البدعة المهدوية وهزم حزب ابى الفضل واعوانه، وعلم ان سـمـاحة المحدث له عزم اكيد على القيام بارجاع الملك اكبر الـى ديـنـه الـقـديـم الـديـن الاسـلامـى فاعتراهم الحزن البالغ والخوف الشديد ،فـاجتـمع ابوالفضل والفتنى والـمبارك وانصارهم ، وقالوا: أن الشيـخ سماحة العلامة رجل بارع له يـد طـولى فى فن الحديث وله مقام مرموق فى اعين الزهاد والمصلحين فنحن نفشل فى ميدان العمل والعلم بين العلامة . فلذا نحن فى حاجة ملحة الى بعث رجال عزموا على قتل الشيخ المحدث الفتنى رحمه الله تعالى.

صلاحه و ورعه:

و كـان الشيـخ الـمـحدث الفتنى رحمه الله تعالى زاهدا فى الدنيا، مسارعا الى الـعـلـم والـحـديـث وفورا فى الملأ ،متعمقا فى الفنون، صالحا عابدا متصلبا فى الـديـن، ورعـا تـقيـا فيتـجـلى ورعه وتقاه من المنام الذى رأى فيه استاذ الشيخ الـفـتـنـى سيـد ولـد آدم مـحمداﷺ فى اليوم السابع والعشرين من شهر رمضان المبارك يوم الجمعة فتسائل النبى الكريم ﷺ فى المنام قائلا فداك ابى وامى من فـضـلك اخبـرنى، من هو افضل الناس فى هذا العصر؟ فاجاب النبى الكريم ﷺ عـنـه ”انـت أيها الشيخ على المتقى“ثم سأل: ثم من؟ فقال النبى ﷺ”محمد بن

طاهر الهندى. (تلميذك البار)

فى تلك الليلة الميمونة رأى الشيخ عبد الوهاب صاحب الشيخ على المتقى فى المنام ان النبى الكريم ﷺ موجود بين يديه ؛ وهو يتسائله: من أفضل اليوم؟ فقال:استاذك الشيخ على المتقى،ثم سأل: ثم من؟ فقال: محمد بن طاهر الهندى .

فاصبحا سالمين غانمين ثم حضر الشيخ عبد الوهاب الى استاذه الشيخ على المتقى وبدأ يقدم السوال عن المنام الذى رآه فى البارحة حتى تقدم الشيخ وقال: الرويا التى رأيتها انا ايضا رأيت مثلك .

هذه الرؤيا تدل على صلاح الشيخ الفتنى وورعه وتقاه وكان الشيخ متصلبا فى العقيدة والدين حتى يحب من أحب السنة و يبغض البدعة ويبغض من أبغض السنة و يحب البدعة ، وكان الشيخ قائما بالليل صائما فى النهار ، عازما على القيام بحدود الشريعة الاسلامية الغراء ما امكن.

مصنفات :

قد قام المؤلف بتأليف كتب كمثل "المغنى فى ضبط الاسماء لرواة الانباء " و " قانون الموضوعات "و" تذكرة الموضوعات " و" التوسل" (فى فن اسماء الرجال) و" اربعون حديثا " (چهل حديث) و" التعليق على التوضيح والتلويح" و"التعليق على صحيح البخارى" و" التعليق على صحيح مسلم"و" التعليق على مشكاة المصابيح" و" التعليق على مقاصد الأصول" و " خلاصة الفوائد فى فن الصرف" و "دستور الصرف" و "رسالة احكام

البئـر“و”رسالة امساك المطر “ و”رسـالة فـضيـلة الصحابة“ و ”رسالة كحلية“ و ”رســالة نهـروالة “و ”سـوانـح الـنبـى ﷺ “ (وضـع بــالعربية وذكر فيـه احوال النبىﷺ سنة بعد سنة) و”سوانح النبىﷺ باللغة الفارسية“و”شرح العقيدة فى عـلم الكلام“و”طبقات الحنفية“و”عدة المتعبدين “ و”كفاية المفرطين“(شرح لـكتـاب الشـافية فـى علم الصرف و نسخة لم وجدت فى مكتبة پير محمد شاه فـى مـديـنة احـمـدآبـاد) قـد صـنف فى عام ٩٦١ من الهجرة و ”مختصر الاتـقـان“ (اختـصـر الـمؤلف فيه كتاب الاتقان فى علوم القرآن للعلامة جلال الـديـن السيـوطـى رحمه الله تعالى) و”مختصر المستظهرية “و” مقاصد جامع الاصول “ (محتويا على احاديث الصحاح الستة) ”ومنهاج السالكين“ جمع فيه احـاديـث التـى يـفتقر اليها من يسلك درب السلوك ”و نصاب البيان“ (فى علم الـمـعانى) و ”نصاب الميزان فى علم المنطق“ و ”نصيحة الولاة والرعاة والرعية . (تذكرة المحديثين من: ص:١٥٥الى :١٥٧)

مـن هـذه الكتب الممتازة الممتعة اربعة كتب له قد نالت قبولا عاما بصورة عامة شاملة فى اوساط العلم والثقافة. وهى فيما يلى :

(١) مجمع بحار الانوار فى غرائب التنزيل ولطائف الاخبار

(٢)تذكرة الموضوعات

(٣) المغنى فى ضبط الاسماء لرواة الانباء

(٤) قانون الموضوعات

نلقى الضوء قريبا على مجمع بحار الانوار فى غرائب التنزيل ولطائف

الاخبار فی سطور غابرة نذکر فیه تعارف هذا الکتاب ومزایاه ومنهج المؤلف فیه –ان شاء الله – وجهود العلماء فی غرائب الحدیث، وفی هذه الاونة نرید ان نسلط الضوء علی بقیة الکتب المشهورة المقبولة، منها:

تذکرة الموضوعات:

ان کتاب تذکرة الموضوعات هو الاخر یحتمل اهتماما بالغا ومقاما مرموقا فی حلقات العلم والثقافة و قد یفوق هذا الکتاب کتابی العلامة الامام الشوکانی والعلامة علی بن سلطان محمد القاری الشهیر "بمُلا علی القاری" فی هذا الفن الرشیق حجما وضخامة، قد قام بالتصنیف فی عام ثمان وخمسین وتسع مائة من هجرة النبی الکریم ﷺ ،قد تضمن تذکرة الموضوعات الاحادیث الموضوعات بالاضافة الی تناول اقوال ائمة الفن و النقاد فی شانها لئلا یجترئ احد فی افراط نسبة الاحادیث الی ممارسة الوضع أو الضعف وانقطع الی التنبیه فی مقدمته علی أن أحدا من الائمة والمصنفین اذا عزا حدیثا أو خبرا الی عملیة الوضع أو الضعف فلا یعتبر احد موضوعا أو ضعیفا الأأن یقوی قوله باقوال الأئمة الآخرین. (المحدثین: ص:١٦٠)

وذکر سماحة المؤلف الفتنی عدیدا من العناوین ثم احتوت تلک العناوین العدیدة الاحادیث الموضوعات المخترعة ، بذل المؤلف رحمه الله تعالی جهوده المکثفة فی تحقیق وتصنیف هذا الکتاب وراجع عددا معظما من الکتب الأخری فی هذا الفن ، وقد طبع الکتاب وصدر عن مکتبة مصر .

المغنى فى ضبط الأسماء لرواة الأنباء:

قد سبق هذا الكتاب المسمى بـ"المغنى فى ضبط الرجال " عدد وجيه من الكتاب للعلماء المتقدمين والمتأخرين فى هذا الفن ولكن هذه الكتب التى الفت وجمعت مع ضخامة حجمها ووفرة ثمارها لم تكن تسد حاجات جمهرة المتشاغلين بعامة كتب الأخبار والأحاديث والاصول من ناحية الوقوف على ضبط الأسماء المشبهة المعقدة بأسهل طريقة فى اسرع وقت ممكن مع جنى انفع ثمار حتى برز سماحة الشيخ الفتنى محمد بن طاهر المحدث رحمه الله تعالى فى منصة الشهود و أحس باهمية بالغة لهذا الفن الشريف ،وتجسّس فتور وعجز همم المتشاغلين بالحديث الشريف وعاين معاناة عدد وجيه من الطلاب والعلماء بما يعوقهم عن العثور من اعدادهم مرجعا مختصرا يغنيهم عن المطولات فى هذا الفن ، فقام وشمر عن ساق جده لوضع هذا الكتاب العجاب ، وانه حقا لعطر منزرع مما انتشر وتشتت فى أسفار السافلين العظام فهو أجدر بان يلقب" لب اللباب" ، ولا شك ان هذه المحاولة محاولة مكثفة و عصارة مسعى حثيث متواصل و سهر واصب وجهد دؤوب ويقظة شاملة من عالم ثقف فطن أريب وفور العثور على مصادرنا درة فريدة فى فن علوم الحديث بصورة شاملة تامة وفى شرح غريب الحديث وضبط الاسماء والألفاظ بشكل عام ملموس .

وقد كرّس المؤلف رحمه الله تعالى جهوده المضنية لتاليف هذه الرسالة الوجيزة باشارة أستاذه ومربيه الشيخ على المتقى، فقد جائت رسالة أفيد وأنفع و نالت قبولا شاملا غيرخافى على أعضاء اسرة العلماء حتى

عـمـت وانتشـرت فـى أقـاصـى البـلاد وأدانيها شرقا وغربا ويذكر سماحة المؤلف فى خاتمة كتـاب" مجمع بحار الأنوار " هذا كله من مسودى المسمى "بـالـمـغـنـى " و هـو كتـاب جـليـل تـلقته الامة بالقبول والمدح، وقد قال الشاه عبدالحق المحدث الدهلوى رحمه الله تعالى متحدثا عن هذا الكتاب 'انما الرسالة الاخرى المسماة "بالمغنى " تضمنت تصحيح اسماء الرجال للأخبار فحسب ولـم يذكر المؤلف احوالهم قط وهى رسالة وجيزة جدا ولكنها مفيدة للغاية. وهذا الـكتـاب " الـمـغـنـى " قـد ألـفه المؤلف قبل (مجمع بحار الانوار) اقتصر فيه على الـضبط فقط بالنسبة للرجال الواردة فى الكتب الستة و غيرها ، أعم من أن يكونوا رجـال الأسانيد أو ورد لهم ذكر فى غضون المتون، وبالنسبة للأمكنة والبلدان الـواقعة فى متون الأحاديث، والـكتـاب ــ بـحقٍ ـ يشتمل على جانب مهم من كتـابـه (الـمـجـمع) ، حيث لم يتعرض المصنف فى المجمع لضبط الكلمات التى يتـصـدى لشـرحها الا نادراً ، ولا لضبط الأعلام الواردة اثناء كلامه، لأن نـاحية الـضبط فيها قد صارت مفروغاً عنها ، وقد نبه هو على ذلك فى مقدمة (الـمـجـمـع) فيـقول: واعلم أنى لا أذكر فيه ضبط اسماء الرجال، والمواضع عـلى الاستيفاء، اكتفاءً بما صـدر مني فيما مضى من كتاب "المعنى فى ضبط الرجال ".

وبـدهـي أن شـرح الـغـريـب لا يتـم للناظر في الكتاب الا اذا استوثق بضبطه ، فـالـمستقي من هذا البحر الزاخر المواج لا يشفي غليله حق شفاء الا اذا جـعـل بيـنه وبين هذا البحر ذاك النهر العذب الفرات ، المسمى(بالمغني)

وهذا الذى اضطر المؤلف أن يجعل فى خاتمة (المجمع) نوعاً برأسه فى ضبط بعض أسامى الرواة على وجه الكلية ملخصاً من كتاب (المغنى) .

قانون الموضوعات :

هذا الكتاب المسمى بـ "قانون الموضوعات" هو الأخر نافع لم يصحح العزم على تحقيق الرسوخ فى علوم الحديث الشريف، وقد تناول سماحة المؤلف الفتنى فيه الرواة الكذابين والوضاعين المهجورين و مارس ان يلاحظ فى ذكرهم ترتيب حروف هجاء وأقام فى الاخير فصلين ضامين على الكنى والانساب. فقد ذكر الرواة باسمائهم بالاضافة الى ذكر اوصافهم فى ضوء اقوال أئمة الحديث والنقاد فى شئونهم يتجلى به كونهم فى قائمة صفاف المحدثين او المتروكين وقد برزت هذه المحاولة الممثلة بـــ "قانون المضوعات" اثر كتابه "تذكرة الموضوعات" حتى صرح سماحة المحدث الفتنى فى مقدمة قانون الموضوعات نفسه . (تذكرة المحدثين: ص: ١٦١)

فعصارة القول أن سماحة المحدث الفتنى رحمه الله تعالى قدّم خدمات جليلة واثر فذة للأجيال المسلمة القادمة فى العصور الآتية وشمرعن ساق جده لقلع البدع والخرافات من المجتمع البشرى بصورة شاملة ومن مجتمع غجرات بشكل خاص حتى قلع البدعة المهدوية من جذورها وقد أعان على هذه العملية الخيرة ملوك الهند منهم السلطان "اكبر" والى دهلى، فانه قام بربط الامامة على رأس الشيخ محمد بن طاهر الفتنى ، وقال "على نصرة الدين المبين، وكسر فرقة المبتدعين وفق عزمك عليه" ، وفوض هذا الأمر المهم الى اخيه من الرضاعة مرزا عزيز كوكا المشهور بـــ لقب "اعظم خان" .

ولـكـن لـم يحالفه التوفيق الى زمن عديد حتى عُزل وقام مقامه "عبد الرحيم خـان خـانـه "الذى كان شيعيا ، اعتضدت وارتوت به شجرة البدعة المهدوية ، فـأشـاع هذه البدعة ثانيا الى نهاية المطاف انتقل سماحة المحدث الى السـلـطـان "اكبر" وهو "باكبر آباد" آنذاك اقلاعا لهذه البدعة مع فئة من تـلاميـذه الـعـازميـن على القلع ، ولكن من سوء الحظ اندرج بعض المهدويين مـختـفيين فـى هـذه الجماعة ، و لم يزالوا يكلئونه ليغتمنوا فرصة لقتل الشيخ حتـى وصل سماحته الى مدينة "أُجين" فسنح لهما لفرصة لقتل الشيخ حتى استشهـد رحمه الله تعالى عام ستة وثمانين وتسع مئة من الهجرة فنقل جثته الى وطـنه المألوف"بفتّن" گجرات فـصـلى عليه عشرات آلاف من المسلمين وبكت عـليـه السـماء والأرض ودفنوه هناك "فتّـن "بـمـقـبـرة اسلافه .انزل الله تعالى عليه شـآبيـب رحـمتـه وتغمده الله سبحانه بغفرانه .وقد رجـع الناس الى بيوتهم وذرفت عيونهم الدموع بل الدماء قائلين .

مضت الدهور وما أتين بمثله ـ ولقد أتى فعجزن عن نظرائه.

مجمع بحار الأنوار :خصائصه ومزاياه:

قد علمت ان أنواع علوم الحديث –كما قال الحازمي – كثيرة تبلغ مـائة ، كـل نـوع منها علم مستقل ، ولو أنفق الطالب فيه عمره لما أدرك نهايته ، ومـن أهـم أنـواعه : علم غريب الحديث، ويعنون به ما وقع في متن الحديث من لـفـظة غـامـضة بعيدة من الفهم لقلة استعمالها ، وهو كما قال النووي : فن مهم يـقبـح جهـلـه بـأهـل الـحـديـث، والخوض فيه صعب، حقيق بالتحري ، جدير

بـالتـوقي، وكان السلف يتثبتون فيه أشد تثبت ، فقد روينا عن أحمد (بن حنبل) أنـه سئـل عـن حـرف منه فقال: سلوا أصحاب الغريب، فإني أكره أن أتكلم في قول رسول الله ﷺ بالظن. (تدريب الراوي:ص:٩٣، والآداب الشرعية:٢:٦٤)

وقـد عـرفـت – أيّـدك الله وإيّانا بلُطفه وتوفيقه –: أن رسول الله ﷺ كـان أفـصـح الـعـرب لسـانًا وأوضحهم بيانًا ، وأعذبُهم نُطقًا ، وأسدّهم لفظًا ، وأبيـنهـم لهـجة، وأقومَهم حُجة، وأعرفهم بمواقع الخطاب، وأهداهم إلى طُرق الـصـواب، تأييدًا إليها، ولُطفاً سماويًا ، وعنايةً ربّانية، ورعاية رُوحانية، حتى لقد قـال له عليٌّ بن أبي طالب كرّم اللّٰه وجهه – وسمعه يخاطبُ وفد بني نهد –: يا رسـول الـلـه، نـحن بنو أبٍ واحد، ونراك تكلم وفود العرب بما لا نفهم أكثره ! فـقـال: "أدبـنـي ربي فأحسن تأديبي، ورُبِّيت في بني سعد". فكان ﷺ يُخاطب الـعـرب على اختلاف شعوبهم وقبائلهم، وتباين بطونهم وأفخاذهم وفصائلهم، كلًا مـنهـم بـما يفهمون ، ويُحادثهم بما يعلمون . ولهذا قال – صدق الله قوله –: "أمـرتُ أن أخـاطب الناسَ على قدر عُقُولهم"، فكأن الله عزَّ وجلَّ قد أعلمه مـا لـم يكن يعلمُه غيره من بني أبيه ، وجمع فيه من المعارف ما تفرّق ولـم يوجد فـي قـاصـي الـعـرب ودانيـه. وكـان أصـحابه رضي الله عنهم ومن يفدُ عليه من العرب يعرفون أكثر ما يقوله، وما جهلوه سألوه عنه فيوضحه لهم .

واستـمـرّ عـصره ﷺ إلى حين وفاته على هذا السَّنن المستقيم. وجاء العصر الثاني – وهو عصر الصحابة – جاريًا على هذا النَّمط سالكًا هذا المنهج،

فكان اللسان العربي عندهم صحيحًا محروسًا لا يتداخله الخلل، ولا يتطرَّق إلى الزّلل ، إلى أن فُتحت الأمصار، وخالط العربُ غيرَ جنسهم من الروم والفرس والحبش والنَّبط ، وغيرهم من أنواع الأمم الذين فتح الله على المسلمين بلادهم، وأفاء عليهم أموالهم ورقابهم ، فاختلطت الفرق وامتزجت الألسُن، وتداخلتِ اللغاتُ ونشأ بينهم الأولاد، فتعلموا من اللسان العربي ما لا بدَّ لهم في الخطاب منه، وحفظوا من اللغة ما لا غنىً لهم في المحاورة عنه، وتركوا ما عداه لعدم الحاجة إليه ، وأهملوه لقلة الرَّغبة في الباعث عليه، فصار بعد كونه من أهمّ المعارف مُطَّرحًا مهجورًا ، وبعد فرضيّته اللازمة كأن لم يكن شيئًا مذكورًا. وتمادتِ الأيام والحالة هذه على ما فيها من التّماسك والثَّبات ، واستمرَّت على سَنن من الاستقامة والصلاح ، إلى أن انقرض عصرُ الصحابة والشأنُ قريب، والقائمُ بواجب هذا الأمر لقلَّته غريب. وجاء التابعون لهم بإحسان فسلكوا سبيلهم لكنهم قلّوا في الإتقان عددًا ، واقتفوا هديهم إن كانوا مَدُّوا في البيان يدًا، فما انقضى زمانُهم على إحسانهم إلا واللسانُ العربيُّ قد استحال أعجمياً أو كاد، فلا ترى المُستقِلَّ به والمحافِظَ عليه إلا الآحاد.

هذا والعصرُ ذلك العصرُ القديم ، والعهدُ ذلك العهدُ الكريم ،فجَهِل الناسُ من هذا المُهِم ماكان يلزمهم معرفته ، وأخّروا منه ماكان يجب عليهم تقدِمَته.

فلما انحسرت السليقة العربية وخالطت العجمة الألسنة مسّت الحاجة الى ضرورة فهم الحديث والكشف عن معانيه ، فدعت العلماء الى التصنيف فيما به تتحقق هذه الغاية، وعنى العلماء بالتصنيف فى شرح الغريب

عناية كبيرة ، و كان اول من صنف فيه ابوعبيدة معمر بن المثنى (٢١٠هـ) ثم لم يـخـل عصر وزمان ممن جمع في هذا الفن وانفرد فيه بتأليف حتى جاء إمام هذا الشـان مـحـمـد بـن طـاهر الفتني فصنف كتاب"مجمع بحار الأنوار فى غرائب التنزيل ولطائف الأخبار."

يـعتبـر العلماء هذا الكتاب من احد المصادر المهمة لمعرفة المعاني ، و كثرت المستفيدون من هذا الكتاب وذلك يرجع الى عظم مادته وحسن ترتيبه فهـو ايضا مرجع عامة الباحثين. وانما ذلك لأمر : أن كل مبتدئٍ بشيئ لم يسبق إليـه ، ومبتـد ع لأمـر لـم يتـقـدم فيـه علمه ،فإنه يكون قليلا ثم يكثر ، وصغيرا ثم يكبر.

خطة البحث :

وانا اكتب بحثا فيما يلى حسب العناوين التالية :

مقدمة .

تعريف علم غريب الحديث ونشأة التأليف فيه وتطوره .

تقسيم كتب غريب الحديث .

منهج المؤلف في مجمع بحار الأنوار.

اسلوبه في شرح المادة .

منهجه في ضبط الكلمات والحروف .

منهج الإستشهاد .

مزايا هذا الكتاب.

ثناء العلماء على هذا الكتاب.

مقدمة :

معرفة معاني هذه الالفاظ (الغرائب) علم مهم بالنسبة للمحدث، كی لايكون زاملة لأخبار لايدرى ما يرويه ، وقد نبه العلماء على وجوب التحري والتوفي في بحثه لئلا يقع المعترض له في تحريف الكلم عن مواضعه والقول على الله بغير علم .

سئل الامام أحمد عن حرف من الغريب فقال: "سلوا أصحاب الغريب، فإني اكره أن أتكلم في قول رسول الله ﷺ بالظن فأخطئ ". (مقدمة ابن الصلاح : ص:٢٣٤ مع التقييد والإيضاح)

وسأل أبو قلابة الأصمعيَّ اللغوي الجليل قال : قلت : يا أبا سعيد، ما معنى قول رسول الله ﷺ "الجار أحق بسقبه"(البخاري كتاب الشفعة) فقال : أنا لا أفسر حديث رسول الله ﷺ ولكن العرب تزعم أن السقب: اللزيق".

وقال أبوعبيد القاسم بن سلام (٢٢٤هـ) عن كتابه غريب الحديث:"إني جمعت كتابي هذا في أربعين سنة ، وهو كان خلاصة عمري". (النهاية: ٦/١)

و لأهمية هذا الفن الشريف ومنزلته قد عني العلماء بالتصنيف في شرح الغريب عناية كبيرة .

تعريف علم غريب الحديث:

الـغـريـب فـي اللغة: ترددت عبارات علماء اللغة في معنى الغريب بين الغياب والبعد والغموض والخفاء.

قـال الـخـليـل بن أحمد : "الغربة: الاغتراب من الموطن وغَرَب فلان عـنـا يـغرُب غَرْبًا : أي تنحى، وأغربته وغرّبته : أي نحيته، والغريب : الغامض من الكلام". (العين:٤/٤١٠-٤١١)

وقال ابن دريد: "ويقال غرّب الرجل تغريبًا إذا بعّد، ومنه قولهم أغرُب عني: أي أبعد، ويقال: هل من مغرّبه خبر: أي هل من خبر جاء من بعد، وأحسب أن أشتاق الغريب من هذا". (جمهرة اللغة: ١/٢٦٨)

قال الزمخشري: تكلم فأغرب إذا جاء بغرائب الكلام ونوادره، تقول: فـلا يـغـرب كـلامـه ويـغـرب فيه وفي كلامه غرابة، وقد غربت هذه الكلمة أي غمضت وخفيت فهي غريبة ومنه مصنف الغريب". (اساس البلاغة:٤٤٧)

وبهـذا يتبيـن أن لفظ الغريب يطلق على عدة معاني حسب مايضاف إليـه فـإن أريـد الغريب من الكلام ، فإنما هو الغامض البعيد عن الفهم، وإن أريد الـغـريب من الناس ، فهو من رحل عن وطنه وغاب عنه، كما يطلق لفظ الغريب ويـراد بـه كـل أمـر جـديـد خـالف الـمألوف من قول أو فعل، وبهذا علم معنى الغريب لغةً.

أمـا مـعـنـاه اصطلاحًا: فإن الغريب عند علماء المصطلح ينقسم إلى قسمين:

(أ) الغريب من جهة السند.

(ب) الغريب من جهة المتن ، وهو المراد هنا...وتعريفه موافق لما تقدم من معناه اللغوي فهو ما وقع في متن الحديث من لفظة غامضة بعيدة عن الفهم لقلة استعمالها.(مقدمة ابن الصلاح: ٢٢٩-٢٣٦،تدريب الراوي : ١٦٣-١٦٧)

ثم ليعلم أن الغريب من الكلام يقال به على وجهين ذكرهما الخطابي رحمه الله . (غريب الحديث للخطابي: ٧١/١)

الوجه الأول: أن يراد به بعيد المعنى غامضة، لايتناوله الفهم إلا عن بعد ومعاناة فكر.

الوجه الثاني: أن يراد به كلام من بعدت به الدار ونأى به المحل من شواذ قبائل العرب ، فإذا وقعت إلينا الكلمة من لغاتهم استغربناها، وإنما هي كلام القوم وبيانهم.

تطور التأليف في غريب الحديث وجهود العلماء فيه:

يعد الربع الأخير من القرن الثاني الهجري هو عصر تدوين الغريب، وهذا إنما يعرف بالقرائن، وإلا فإنه لم يصرح بتاريخ تأليف أي كتاب من كتب الغريب.

ويدل على هذا التاريخ التقريبي أن أبا عبيد القاسم بن سلام (ت:٢٢٤) مكث في تأليف كتابه أربعين سنة ، وعرضه بعدها على من عرضه من العلماء والأمراء، (تاريخ بغداد: ٤٠٦/١٢-٤٠٨) ثم هو كذلك يرحل إلى الحج

بعد قدوم بغداد وبعد أن صنف ما صنف من كتب ، ولا يخفى أن أبا عبيد قد اعتمد في تصنيف كتابه على من سبقه ممن ألف في هذا الفن كالنضر بن شميل؛ وأبي عبيدة والأصمعي وغيرهم.

وبهذا يتبين أن بدايات التأليف في غريب الحديث في الربع الأخير من القرن الثاني الهجري تقريبًا .

ففي نهايات هذا القرن الثالث شهد هذا العقد من الزمن تطورًا لعلم الغريب ، فألف النضر بن شميل، وأبو عبيدة معمر بن المثنى وكذلك من الأوائل محمد بن المستنير قطرب (ت:٢٠٦هـ) ، والفراء (ت: ٢٠٧)، والأصمعي (ت: ٢١٦) ، وكان كتابه أكبر ما الف في تلك الفترة قبل أبي عبيد وتابعه جملة من علماء اللغة والفقه، مثل أبي عمرو الشيباني إسحاق بن مرار (ت: ٢١٠هـ) ، وأبي زيد سعيد بن أوس بن ثابت (ت:٢١٥هـ) ، وغيرهما من العلماء الذين جمعوا أحاديث وشرحوا ما فيها من غريب، وعامة هذه الكتب يتناقل بعضها عن بعض ، فلم يكن أحدهم ينفرد عن غيره بكبير حديث لم يذكره الآخر ، ولم يزل الأمر على ذلك حتى قيض الله لهذا العلم أبا عبيد القاسم بن سلام (ت:٢٢٤هـ) ، فألف كتابه المشهور الجامع بين الشرح اللغوي والتوجيه الفقهي ، فتلقاه اللغويون والمحدثون والفقهاء بالقبول وصار قدوة لمن أراد التأليف بعده.

ثـم تـعـقـب كـتـاب أبـي عبيـد واستدرك على كتابه في كتاب سماه "إصـلاح الـغـلـط الواقع في غريب الحديث لأبي عبيد" ولم تحمل لنا المصادر اسـم مـن ألف فـي هـذا الفن بعد أبي قتيبة إلا اسم معاصره إبراهيم الحربي (ت: ٢٨٥هـ) ،حيث ألف كتابًا كبيرًا في الغريب.

وتـعـددت بـعده المؤلفات في الغريب وسميت اسم غريب الحديث فـألف فيـه الـمبـرد (ت:٢٨٦هـــ) وثـعلب (ت:٢٩١هــ) ، وابن كيسان (ت: ٢٩٩هـــ) وكتـابـه نـحـو ٤٠٠ ورقة، وجـميع كتب هؤلاء في عداد المفقود ، وجـاء بـعـدهـم الـقـاسم بن ثابت السرقسطي (ت:٣٠٢هـ) الذي ألف كتاب الـدلائـل فـي غـريب الحديث، وجاء كتابه فاستدرك على كتابي أبي عبيد وابن قتيبة فـكـان كتـابـه نـاهجاً منهجهما ملتزمًا طريقتهما، وكان الكتاب هذا غزير الـمـادـة عظيم الفائدة، ولكن لم يطلع عليه مؤلفو الغريب في الغريب في الغرب والشـرق، ولـم يستفيدوا منه ، ولذا ترى الخطابي (ت: ٣٨٨هـ) بعد مدة طويلة عـاد يستـدرك عـلى ابن قتيبة ، ولو كان اطلع على كتاب السرقسطي لاستدرك عليه ، وجاء بعده جملة ممن ألف في الغريب وجميع كتبهم في عداد المفقودة، ومـن هـؤلاء : أبو بكر محمد بن القاسم بن الأنباري (ت: ٣٢٨هـ) وأبو موسى الحامض (ت:٣٠٥هـ) ، وابن دريد (ت: ٣٢١هـ) وسمى كل واحد من هؤلاء كتابه باسم غريب الحديث ، ثم بعد هؤلاء جاء الخطابي (٣٣٨هـ) فألف كتابه المشهور غريب الحديث وسلك فيه مسلك أبي عبيد وابن قتيبة.

وبـعـد كتاب الخطابي انتهت مرحلة التأليف على المسانيد ، ثم جاء بـعـد ذلك علماء قصدوا التسهيل والتقريب فجردوا كتبهم عن الإسناد ورتبوها بتـرتيب حروف المعجم، وعامة الكتب تشير إلى أن إمامهم في هذا الترتيب هو أبو عبيد الهروي (ت: ٤٠١هـ) ألف كتابه الغريبين ورتبه على حروف المعجم ، وخـالف فـي ذلك يـاقـوت فـي مـعـجـمه حيث قال: أن شمر بن حمدويه (ت: ٢٥٥هــ) ألف كتـابًـا فـي الـغـريب ورتبه على حروف المعجم ، (معجم الأدباء: ٢٧٥/١١) والجمهور على الأول .

وأخيـراً ظهـر كتـاب مـجـد الدين ابن الأثير (ت: ٦٠٦هـ) المسمى الـنهـاية فـوافـق اسـمـه مسـماه ووصل هذا الفن إلى قمته ومنتها في تأليف هذا الـكتاب ، فلم يعرف بعده في هذا الفن كتاب مستقل يذكر ،سوى ما ذكر لابن الـحـاجـب (ت: ٦٤٦هـ) أنه ألف كتابًا في غريب الحديث في عشر مجلدات ولا يعرف عنه غير هذا.(كشف الظنون:١٢٠٥/٢)

ثـم جـاء مـحـمـد بن طاهر الفتني الهندي (ت:٩٨٦هـ) فألف كتابًا جـامـعـاً بيـن غريبي القرآن والحديث ، وسماه **مـجـمع بحار الأنوار في غرائب التـنـزيل ولطائف الأخبار** وقـد ضـمـنـه كتاب النهاية كاملًا ، مع إضافته لبعض المواد والكلمات والشروح والتفاسير.

وقـد عـلـمت أن كتب الغريب قد مرت بمراحل عدة، منها المسندة، ومنها المؤلفة على حروف المعجم ، ومنها العام ، ومنه المختص بغريب كتاب

خـاص أو حـديث خاص، وعلى هذا نستطيع أن نقسم كتب الغريب إلى خمسة أقسام :

القسم الأول: كتب الغريب المؤلفة على المسانيد:

وأشهر المؤلفات على هذه الطريقة :

(١) غريب الحديث لأبي عبيد القاسم بن سلام الهروي (ت:٢٢٤هـ).

(٢) غريب الحديث لابن قتيبة عبدالله بن مسلم الدِيْنوريَّ (ت:٢٧٦هـ).

(٣) غـريـب الـحديث للخطابي حَمْد بن محمد أبي سليمان الخطابي(ت: ٣٨٨).

هذه هي أهم الكتب المؤلفة على المسانيد ، وهناك غيرها من الكتب المسندة.

القسم الثاني: كتب الغريب المؤلفة على حروف المعجم:

(١) كتـاب الـغـريبين لأحمد بن محمد الهروي ، أبو عبيد (ت: ٤٠١هـ).

(٢) الـفـائـق فـي غـريـب الحديث، لمحمود بن عمر بن أحمد أبي القاسم الزمخشري (ت: ٥٣٨هـ).

(٣) الـمـجـمـوع الـمغيث، لأبي موسى الأصبهاني (ت: ٥٨١هـ)، وكان الهدف من تأليفه لهذا الكتاب هو استدراك ما فات الهروي في الغريبين.

(٤) الـنهـاية فـي غـريـب الـحـديث والأثر ، لأبي السعادات مجد الدين بن

محمد الجزري (ت: ٦٠٦هـ) ، وهو من أحسن الكتب المؤلفة في هذا الفن.

(٥) **مجمع بحار الأنوار في غريب التنزيل ولطائف الأخبار** ، لمحمد بن طاهر الصديق الهندي الفتني الكجراتي(ت:٩٨٦هـ) ، ولقد طبع هذا الكتابة عدة طبعات، وآخرها وأحسنها طبعة بتحقيق أبي الفضل عبدالحفيظ البلياوي ، ومراجعة الشيخ العلامة حبيب الرحمن الأعظمي ، وتقع هذه الطبعة في خمس مجلدات.

القسم الثالث : كتب الغريب المؤلفة على أبواب الفقه :

(١) كتاب لأبي عدنان عبدالرحمن الأسلمي وعنوانه : ماجاء من الحديث المأثور عن النبيﷺ مفسراً، وذكر القفطي أنه مرتب على أبواب الفقه فقال: "وعمل أبو عدنان النحوي البصري كتاباً في غريب الحديث، ذكر فيه الأسانيد وصنفه على أبواب السنن والفقه ، إلا أنه ليس بالكبير" . (إنباه الرواة: ١٤/٣)

(٢) جمل الغرائب ، لنجم الدين أبي القاسم محمد بن أبي الحسن ابن الحسين النيسابوري الغزنوي المعروف بـ"بيان الحق" وهذا الكتاب مخطوط ، (دراسات في غريب الحديث: ٣٥٦) وهو مرتب على أبواب الفقه .

القسم الرابع : كتب الغريب الخاصة بغريب بعض المصنفات:

(١) مشارق الأنوار على صحاح الآثار ، للقاضي عياض بن موسى

ابن عياض بن عمرو(ت:٥٤٤هـ) ، وهو كتاب يبحث في غريب الموطأ والصحيحين ، ولأهمية هذا الكتاب وقيمته العلمية عكف عليه جمع من أهل العلم لاختصاره وتهذيبه.

(٢) تفسير غريب الموطأ للأحنف أحمد بن عمران (ت: قبل ٢٥٠هـ) .

(٣) تفسير غريب ما في الصحيحين ، للحميدي محمد بن فتوح (ت:٤٨٨هـ).

(٤) كشف مشكلات الموطأ لابن السيد عبدالله بن محمد البَطَلْيَوْسي (ت:٥٢١هـ).

(٥) شرح غريب جامع الأصول لابن الأثير (ت: ٦٠٦هـ).

القسم الخامس : كتب الغريب الخاصة بغريب بعض الأحاديث:

(١) بغية الرائد لما تضمنه حديث أم زرع من الفوائد ، للقاضي عياض والكتاب مطبوع (ت:٥٤٤هـ).

(٢) شرح خطبة عائشة أم المؤمنين في أبيها ، لأبي بكر بن الأنباري (ت:٣٢٨هـ).

(٣) منال الطالب في شرح طوال الغرائب لابن الأثير مجد الدين المبارك ابن محمد (ت: ٦٠٦هـ) ، والكتاب مطبوع . (ينظر: التأويل في غريب الحديث للدكتور علي بن عمر السحيباني في مواضع متفرقة من :ص:٧٤إلى ١١٦)

منهج المؤلف في مجمع بحار الأنوار

(١) وضع المؤلف مقدمة لهذا الكتاب وألحق الكتاب خاتمة . ذكر فيها اربعة فصول، الفصل الاول فى علوم الحديث واصطلاحاته ، والفصل الثاني فى ضبط بعض اسانيد الرواة، والفصل الثالث: في ادب الكتابة وبعض فوائد السير وتواريخ السادات وفى آخره تكملة .

وبعد المقدمة أتى على الكتاب – وهو صلب الكتاب – واورد الغرائب يذكر فيه من يخرجه من علماء الحديث و الغريب ويتوجه الى شرح الفاظه وبيان معانيه ، وقد جعل المصنف النهاية لابن الأثير أصلاً حيث قال: "ثم إني إنما جعلت كتاب ابن الأثير أصلا"، (تكملة مجمع بحار الأنوار: ٣١٩/٥) وجاء ترتيب الالفاظ فى النهاية على حروف المعجم ولهذا نجد انه يبدأ كتابه بباب الهمزة مع الباء حتى آخر الحروف . ثم حرف التاء مع الهمزة حتى آخر الحروف؛ هكذا راعى تقديم الحرف الثالث فالرابع. هذا من ناحية ترتيب المحتويات.

والشيخ بيّن ترتيبه في الكتاب ، فقال:" فجعلت كتاب النهاية لابن الأثير أصلا له ، فلا أذكر منها إلا ما ليس له تعرض دونه ؛ ولم أغادر منه إلا ماندر أو شاع بينهم وانتشر ؛ وأضم إلى ذلك ما في ناظر عين الغريبين من الفوائد ، وما عثرت عليها من غير تلك الكتب من العلم وغرائب القرآن وافياً".(٢٤/١)

وقال أيضا : "اعلم أني اصطلحت هنا وفي الأصل على أني أكتب

أول كلمة من حديث بحمرة ليتميز عما تقدم إلا أن يتميز بحمرة علامات الكتب، وأتبع أصله في ترك حرف العطف على لفظ فيه في أول كل مادة من الباب ، وفي عطف ما بعده إلى تمام تلك المادة، وأيضا قد نسيت في بعض ما ذكرته الأصل المنقول عنه فأعلمته بلفظ الغير". (تكملة مجمع بحار الأنوار:٥/٣١٩)

(٢) واما من ناحية الادب وغيره من الفنون، فعامة كتابه انما هو تفسير لغريب حديث رسول الله ﷺ وآثار السلف، وهذا لايعنى انه لم يشرح غيره، بل شرح الفاظا غريبة واردة في القرآن وفي الشعر العربي و كذلك في الامثلة..

وانا اذكر امثلة من الادب العربي وقد راعى الادب والبلاغة وغيرهما من الفنون في هذا الكتاب، وأوضح احيانا اصطلاح الادب والبلاغة فمن امثلتهما:

قال الشيخ الفتني: كتب كتابا عنده : غلبت رحمتي ، اما حقيقة عن كتابة اللوح بمعنى خلق صورته فيه، او الامر بالكتابة، او مجاز عن تعلق الحكم والاخبار به، والضدية الحقيقية محال في حقه تعالى فهو استعارة تمثيلية . (ماده: كتب، ص:٣٧٤،ج:٤)

وقال فيمادة : تمم (٣٧٢/٥) :بشر المشائين فى الظلم بالنور التام.....هو تلميح الى قوله تعالى: ربنا اتمم لنا نورنا .

وقال في مادة صلا (٣٤٩/٣) : التشبيه في : "كما صليت" ليس من

بـاب الـحـاق الـنـاقـص بـالـكامل؛ بل بيان حال ما لا يعرف بما يعرف. وقيل: التشبيه في أصل الصلاة ،لا في قدرها.

وفي ماد ة صور (٣/٣٦٦) ذكـر الـحـديـث: "خلق آدم على صورته". واورد اقـوال الشـراح الـمـختـلفة في توضيحه وتاويله، وقال في آخره: فالكلام على التمثيل والاستعارة والاضافة على الحقيقة.

وفي مادة كتب (٤/٣٧٠) : مـن نـظـر في كتاب اخيه بغير اذنه فكأنما ينظر في النار، هو تمثيل: أى كما يحذر النار فليحذر هذا الصنع.

(٣) ولـم يذكر الحديث كاملا فهو يورد قطعة من الحديث التي ورد الـغـريـب فيها خلافا لما فعله ابوعبيد، وابن قتيبة، بل يذكر احيانا إسم الحديث، مثـلا: فـي حـديـث صـلـوة الضحى، و في حديث الفتنة (مـادة بهز: ١/٢٣٥) وفي حـديث اهل الجنة (مـادة بهش،١/٢٣٦) وقـد يـذكر راوي الحديث، يقول مثلا: في حديث ابن عمر، وفي حديث فلان بن فلان.

اسلوبه في شرح المادة:

مـرت الـمادة في هذا الكتاب بمظاهر واساليب لأجل شرحها، ومن ذلك مثلا:

- الاختصار، والمصنف لـم يذكر التفصيل، بل اكتفى في الاختصار فحسب، ومثاله مادة تقد، وتقف، وتوت، وجهبذ.

- والتـفـصيـل، مثـالـه: و"قـال بـعض الـنـاس" و"فـمـن تـرك

الصلوة......فقد كفر".

- والاستقصاء، وهو على انواع، فتارة الاستقصاء في الشرح اللغوي، مثاله: ازب (١/٧١) واسبذ (١/٧٤) واصاب (١/٨٠) وافد (١/٨٥).

وتارة في بيان الاقوال الواردة في بيان الكلمة او معناها، ومثاله: ارم وارممت (١/٦٨) وافف (١/٨٥) وآكلة (١/٨٨) والق (١/٩٣) واسيف (١/٧٥).

او في بيان ما تروى به الكلمة فيقول: هي بالمهملة وتروى بالمعجمة ونحو ذلك، ومثاله: "مؤزلة" (١/٧٣) و"اع" (١/٨٤) و"بهرج" (١/٢٣٦) فيقول: وهو غير عربي، وقيل: كلمة هندية.

وفي مادة "شنن" (٣/٢٦٣) فشنّه عليه، بمعجة في اكثرها، وبمهملة في بعضها.

- والاحالة، اى يقول تارة: فيما تقدم، وتارة أخرى: فيما سيأتي، مثاله: بلم (١/٢٢٢) وبلا (١/٢٢٥).

وقال فى مادة خنس (٢/١٢٠): فانخنست منه، وروي اختنست بتاء ونون على المطاوعة، وروي: فانتجست منه بجيم وسين. وسيجيئ.

منهجه في ضبط الكلمات والحروف:

ان وقـوع التـحـريف والتصحيف والغلط في كتب اللغة محتمل فيها اكثـر مـن غيـرهـا ، ولـذلك يـعـمـد الـلـغـوى الـى ضبط تلك الكلمة المحتملة لـلتـحـريف، ومـن هـؤلاء الشيـخ الـعلامة الفتني رحمه الله، فقد اعتنى بالضبط مخافة التحريف، او التبديل، او الغلط...

وطريق الضبط عنده فيما يلي :

....ضبط حركات الالفاظ، وقد يظن ظانّ ان ضبط الحرف بالشكل كـاف بالغرض المطلوب، لكنه في الحقيقة لا يفي بالغرض المطلوب، لا سيما وان الكتاب سيكون في متناول النساخ فيتغير شكل الحرف من الضم الى الفتح ، او بـدل وقوعها على الحرف الاول الى الاوسط او العكس ، وهذا مما يوجب الـضبـط لهـذا الـنـوع وإرداف عبـارـة بعد الكلمة المراد ضبطها تبين المقصود وتبعد الالتباس ، ومن صور هذا الضبط ما يلي:

- ذكـر بـعض اوصاف الكلمة مثلا يقول بالمد والتحريك، او بالمد والتشديد ، او بالمد والقصر ،او التخفيف والتثقيل وهكذا.

ومثاله :فى مادة صمم (٣٥٩/٣) : فتنة صماء بكماء عمياء صماء ، هو بمهملة ومد.

وفى مادة : طول (٤٨٦/٣) : وفي حديث آدم: طوالا، بضم طاء وخفة واو اي طويلا، هو بالتخفيف رواية والمشددة اكثر مبالغة.

- الـضبـط بـالميزان الصرفي: كأن يقول مثلا هذا على وزن تفعل او

على وزن فعل او فعيل او فعلان.

ومثاله: قال فى مادة صلا (٣٤٨/٣) أتى بشاة مصلية ، هى بوزن مرمية.

وفي مادة خنز (١١٩/٢) والخنزوانة وهى فُعُلُوَانة لا فُنُعُلانة على ما قيل .

وفي مادة خير (١٣٠/٢) اطلب منك الخيرة بوزن العِنَبَة.

■ توضيح النحو وتركيبه، مثاله:بيد، فذكر: قيل : معناه على انهم ، وروى بأيد اى بقوة....، وقيل بمعنى من اجل انهم، والمختار انه بمعنى لكن، والاستثناء من تاكيد المدح بما يشبه الذم. (مادة بيد، ٢٤١/١)

وفي مادة بيع (٢٤٤/١) فبائع خبر محذوف، والغدو سير اول النهار، وقيل: فبائع اى: مشتر..... فمعتقها خبر بعد خبر، او بدل من الاول بدل بعض .

وفي مادة "تره" (٣٧٠/٥) "كان عليه ترة" فقال: يجوز رفعها ونصبها فاسم "كان" ضمير ما ذكر، و "عليه" إما يتعلق بترة او خبر، ويجوز كون ترة مبتدأ ، وعليه خبره، واسمها ضمير القعدة...والجملة خبر كان وضمير احد اسميه.

وفي ماد ة :صوب(٣٦٣/٣) من يرد الله به خيرا يصب منه، يصب بصيغة مجهول، وضمير نائبه لمن ، وضمير منه لله ، اي: يصير مصابا بحكم الله، او نائبه الجار والمجرور وضمير منه لمن.

▪ وصف حركة الحرف كأن يقول مثلا: بكسر السين او بفتح الراء او بضم النون او بسكون الفاء.

مثاله: في مادة صلا (٣٤٨/٣) : رأيت ابا سفيان يصلى ظهره بالنار، اي يدفئه، هو بفتح ياء وسكون صاد.

وفي مادة : صنع (٣٦٠/٣) في حديث عمر: انظر من قتلني الصنع؟ الصنع هو بفتح صاد ونون.

وفي مادة صوب (٣٦٤/٣) ولم يصوبه: بضم ياء وفتح صاد وكسر واو مشددة.

وفي مادة خنز (١٢٠/٢) خنزب: يروى بالكسر والضم ، ويقال بفتح خاء وزاي وبضم خاء وفتح زاى. ونقل عن الطيبي : هو بكسر معجمة وزاي ويفتح.

منهجه في الاستشهاد :

سار المؤلف في غالب الكتاب على عرض غرائب الحديث، وتوضيحها، ولكنه يذكر ايضا الشواهد في مواضع ليبرهن على صحة معنى او بيان اصل كلمة او اثبات قاعدة نحوية وكانت الشواهد كما يلي:

▪ الاستشهاد بالقرآن ، ومثال ذلك: امّة . (مادة: امم، ١٠٧/١)

فقال ، معناها: الرجل الجامع للخير والدين، والصنف من الناس ،

وأتباع الانبياء، والطريقة المستقيمة ، والمدة من الزمان ومنه : وادّكر بعد امة، اى قرن. استشهد لإثبات آخر المعنى بالآية المذكورة.

وبعث نبي بدين الله الكبر هو جميع الكبرى، ومنه : انها لإحدى الكبر. (مادة كبر، ٣٦٥/٤)

■ واحيانا يستشهد بقراء ات القرآن ايضا، مثال ذلك: "وادكر بعد امة" بضم همزة ، وميم مشددة ، ومعناها قد مرت سابقا، فقال الشيخ الفتني: وقرئ : امه بفتح همزة وميم خفيفة وبهاء ، اى : نسيان . (١٠٧/١) فلإثبات معنى ثانٍ أى النسيان استشهد بقراءة القرآن .

و"والذى تولى كِبُره" ....هو بالكسر قراءة السبعة .(مادة كبر، ٤٦٥/٤)

■ ويستشهد بالحديث وامثلته كثيرة.

■ والاشعار : مثال ذلك: ذكر في مادة خطم (٧١/٢) : اصل الخطم في السباع مقاديم انوفها وافواهها ، ومنه شعر كعب

كأن من فات عينيها ومذبحها ÷ من خطمها...............

أى انوفها .

وذكر في مادة"غيل" (٨٨/٤) : اسد غيل ، هو بالكسر شجر ملتف يستتر فيه كالأجمة ، ومنه شعر كعب:

ببطن عثر غيل دونه غيل

وفي مادة "كفأ" (٤١٨/٤) ذكر الكفء معناه النظير والمساوى،

واستشهد بهذا:

وروح القدس ليس له كفاء

أى ليس لجبريل نظير.

وذكر في مادة"حمم" (٥٦٦/١) الحمام الموت، وقيل : قدر الموت وقضاؤه واستشهد بهذا الشعر:

هذا حمام الموت قد صليت

أى : قضاؤه .

هذا منهجه في الاستشهاد بالآيات والاحاديث والاشعار.

■ ويتبين من خلال مطالعة هذا الكتاب، ان الشيخ الفتني تطرق في كتابه هذا الى بعض المسائل الفقهية والاصولية ضمن غرائب الحديث. ومثال ذلك :

(١) ذكر في مادة "بوح" (٢٣٠/١) بوح بفتح موحدة وخفة واو وبمهملة اى ظاهرا، والمراد به المعاصى اى لا تنازعوا الولاة الا ان تروا منهم منكرا محققا فانكروه ، واما الخروج عليهم فحرام بالاجماع وان ماتوا فسقة، واجمع اهل السنة على انه لا ينعزل بالفسق وينعزل بالكفر والبدعة.

وفي مادة"جهد" (٣٩٧/٥ ، التلمكة) قال: والاجر في الخطاء ليس عليه بل على اجتهاده لانه عبادة، وهذا اذا لم يأل جهده، واجمعوا على ان الحق واحد في اصول الدين الا عبيد الله بن الحسن العنبري وداود الظاهري فصوبا

جميع المجتهدين.

(٢) وفى مادة صلا (٣٤٧/٣): " صـل على محمد" وقيل : لما أمر الله تـعالى بالصلاة عليه ولـم نبلغ قدر الواجب منه أحلنا عليه ، وقلنا: صل أنت لأنك أعـلم بما يليق به ، واختلف هل يجوز لغيره، والصحيح خصوصه به ، الخطابي : بمعنى التعظيم خاص، وبمعنى الدعاء والتبريك لا، نحو اللهم ! صل على آل أبي أوفى، أي : ترحم وبرك، وقيل: هو أيضا خاص ولكنه آثر غيره فلا يجوز لغيره.

(٣) وفى مادة طوع (٤٧٠/٣): "وفيـه أنه لايشترط للمجتهد مذهب مـدون، وإذا دونـت الـمذاهب فهل يجوز للمقلد أن ينتقل من مذهب إلى آخر؟ إن قـلـنا: يلزمه الاجتهاد في طلب الأعلم ، وغلب على ظنه أن الثاني أعلم ينبغي أن يجوز بل يجب، وإن خيرنا ينبغي أن يجوز أيضاً ، ولو قلد مجتهداً في مسائل وآخـر فـي أخـرى واستـوى الـمـجتهـدان عـنده وخيرناه فمقتضى فعل الأولين الـجـواز لـكـن منعه الأصوليون للمصلحة ، وحكي عن بعضهـم أن من اختار من كل مذهب ما هو أهون يفسق.

(٤) وفـي مادة"بنا" (٢٢٦/١) قـال: فـي حديث عائشة : كنت العب بـالبنات اى التماثيل التي تلعب بها الصبايا، فيه جواز ذلك ، وهن مخصوصة من الصور المنهي عنها لما فيه من تدريب النساء في صغرهن لأولادهن، وقد اجازوا بيـعهـن وشـراء هـن ، وعـليـه الـجـمهـور ، وقيل: انه منسوخ بحديث النهي في الصور.

(٥) وفي مادة "ثبت" (٣٧٤/٥،التكملة) قال: واتفق كثير على التلقين ، وروى بعض فيه حديثا ليس بقائم الإسناد ولكن اعتضد بشواهد.

وقد تكلم في هذا المثال على اسناد الحديث ايضا، وهذا الجرح والتعديل لم يوجد في الكتاب الا قليلا، وهو ايضا لم يستعمل الفاظ الجرح والتعديل على الرجال، بل يشير الى ضعف الحديث او السند.

وهكذا اشار في مادة"ترب" (٣٦٩/٥) فقال: اذا كتب احدكم كتابا فيتربه فإنه انجح . وقال بعد شرحه: والحديث منكر.

واحيانا يذكر حكم الحديث، فقال: لا تكتبوا عني غير القرآن (مادة: كتب، ٣٧١/٤) وهو منسوخ بحديث إذنه فيها وبإجماع الأمة على جوازها.

مزايا هذا الكتاب :

معلوم لدى اهل الحديث ان الشيخ محمد بن طاهر الفتني قد اعتمد في كتابه هذا كثيرا على ما في النهاية كما مر فيما سبق ورمز للنهاية بـ "نه" . والمؤلف الف هذا الكتاب والتزم فيه ان لايغادر شيئا مما في النهاية الا ما ندر او شاع بينهم واشتهر.

ويضم الى ذلك ما وجده في ناظر عين الغريبين من الفوائد ، فجاء كتابه جامعا لما الف قبله فى غريب الحديث، وزاد عليه انه تعرض لما لم يتعرض له من صنف قبله الا نادرا، وهو خواص تراكيب الحديث ولطائفها والوجوه الغريبة فيها. وقد ذكر الشيخ حبيب الرحمن الاعظمي مزاياه فى

تقديم هذا الكتاب ،وقد ذكر الشيخ العلامة الأعظمي مثالا واحدا وانا ازيد عليه امثلة اخرى، واذكر بعد عبارات الاعظمي رقم الصفحة والجزء ، وبعد امثلة اخرى اذكر ان هذا المثال في اي مادة وقع ، ورقم الصفحة والجزء ، ان كان صحيحا فمن الله وان كان غيره فاستغفره.

(١) ان الناظر في غيره من الكتب بعد وقوفه على المعنى الوضعي ربما عنّ له اشكال فى معنى الحديث فيحتاج الى الكشف عنه في شروح الكتب، وان هذا الكتاب يغنيه عن الرجوع اليها، لان المؤلف يسرد فيها ما ذكروه في الشروح . مثال ذلك"ويل للمتألّين" اقتصر ابن الأثير على بيان معنى "المتألي" وعقبه المؤلف ببيان السبب الداعي الى إحباط عمل المتألي، فان الطالب ربما يشكل عليه هذا. (تقديم مجمع بحار الأنوار: ١/١٣)

والإسلام ليأرز الى المدينة ، اقتصر ابن الأثير على بيان معنى "يأرز" اي ينضم اليها ويجتمع بعضه الى بعض فيها. ولم يذكر: في اىّ مكان يكون هذا او وقع هذا في الزمن السابق، وإن كان الراء بالكسر فما معنى صفة الايمان اولا وآخرا ، وقد ذكره المؤلف الفتني .(مادة: ارز، ص: ٦٦، ج:١)

و : موت الفجأة اخذة أسِف للكافر ، ذكر ابن الأثير معناه : اى اخذة غضب او غضبان، ومنه الحديث: انهم ان كانوا ليكرهون اخذة الأسف، ولم يذكر بأىّ طريق يظهر اثر غضب الله او غضبانه ، وعقبه المؤلف الفتني ببيان

طريق اثره. (مادة:اسف، ص: ٧٥،ج:١)

(٢) ومنها انه ربما تكون الكلمة معلوما مشهورا معناها الوضعي فيهملها اصحاب الغريب ولكن المؤلف يوردها لانها اطلقت في الحديث بنوع من التاويل فينقل من المصادر الموثوق بها ما قالوا في تأويلها ، مثال ذلك: "فيأتيهم الله" اهمله ابن الاثير ، وذكره المؤلف ونقل عن الكرمانى ان معناه "يظهر لهم" . (تقديم مجمع بحار الأنوار: ١٣/١)

وكذا "اتقوا" (مادة: بنا ، ص: ٢٢٧،ج:١) ذكره المؤلف ونقل عن الطيبي ان معناه : "احترزوا".

(٣) وربما ذكر المؤلف ما هذا شأنه يتذرع بذكره إلى شرح معنى الحديث. مثاله كلمة "إلا" زادها الشارح وشرح الأحاديث التى وقعت فيها ، وكانت تحتاج إلى شرح . (تقديم مجمع بحار الأنوار: ١٢/١)

وكذا "أمُ" (ص:٩٧،ج:١) و"إنْ" (ص: ١٢٠،ج: ١) و"أوُ" (ص: ١٢٦ ،ج: ١).

(٤) ومنها ان ابن الاثير أهمل ضبط الكلمة في الأغلب، والمؤلف لايتركه الا نادرا، مثال ذلك، "ابهر" اهمل ضبطه ابن الاثير ، وضبطه المؤلف .

(تقديم مجمع بحار الأنوار: ١٢/١)

و"ارنب" بنون موحدة، (ص: ٧٠،ج:١) و"اسكف" (مادة: اسك، ص:٧٦،ج:١) . وكذا "اطم والإطام" اهمل ضبطهما ابن الاثير، وضبطهما

المؤلف ، و"اعمق" . (مادة: اعم ،ص:٨٤،ج:١)

و"إفك وأفك" ضبط ابن الاثير اعرابا واحدا، وضبطه المؤلف ضبطا تفصيليا، فقال: الإفك والأفك، الأول بكسر فساكن ، والثانى بفتحتين يريد انهما واحد وهو كالكذب، وقيل : بفتحتين جمع أفوك ،وإفكهم بكسر فسكون. (مادة: افك، ص:٨٥،ج:١)

(٥) ومنها ان المؤلف فى بعض الاحيان يورد الكلمة بهيئتها التي وردت بها في الحديث تيسيرا على الطلبة او اعتقادا منه بأن الكلمة وضعت بهذه الهيئة بديّا ، ولم تشتق من أي كلمة أخرى ، مثاله: "اجادب" و"إثمد".

(تقديم مجمع بحار الانوار:١/١٢)

و"أحبش" (مادة:احب، ص:٤٨،ج:١) و"ارفد" (مادة: ارف، ص: ٦٨،ج:١) و "اسوار" (مادة اسو، ص:٧٨،ج:١) و "إشفا" (مادة: اشف، ص: ٧٩،ج:١) و "اظفر واظفار " (مادة: اظف، ص:٨٤،ج:١) ذكره ابن الأثير فى مادة "ظفر" و المؤلف فى مادة "اظف". و"أكدر" (مادة : اكد،ص: ٨٧ ، ج:١)

(٦) ومنها ان المؤلف يضيف الى ما ذكره ابن الأثير في مادة، ما لم يذكره من مشتقات تلك المادة وتصريفاتها مما ورد في الحديث، ومثاله ان ابن الاثير لم يذكر في مادة"برأ" : "استبرأ لدينه" فاستدركه المؤلف، وكذا استدرك

"أبرأ الى الله "و" فتبرئكم يهود". (تقديم مجمع بحار الانوار:۱/۱۲)

وكذا لم يذكر في مادة " احد" :"أحد الثلاثة" و " أُحُد" جبل شهير، فاستدركهما المؤلف.

وكذا في مادة " أخذ"، لم يذكر "تأخذ" و "مأخذها"، فاستدركهما المؤلف الفتني.

وفي مادة " اذن" ،لم يذكر ابن الأثير "مؤذنين" و"استأذنوكم" و "يوذن" و"لاتاذن" وذكره الشيخ الفتني.

وفي ماد ة "بشر" استدرك العلامة الفتني "تباشر" و"البشرى" و"ابشروا" و"بشارة " و"بشِّروا" و"يباشرني".

واستدرك في ماد ة"بصر ": "بصيرة" و"تبصره" و"مبصرا"و"لم يبصروا".

واستدرك في مادة "بعث " : "يبعث" و"لاتبعثون"

واستدرك في ماد ة"بغي " :"مهر البغي " و"لاتبتغي" و"ابتغوا"

واستدرك فى مادة " ترجم" : "أترجم" و"ترجمة الباب".

(۷) وكثيرا ما يزيد على ابن الأثير فى تفسير الكلمة، كما زاد عليه في تفسير "أبرأ" من عندي النووي.(تقديم مجمع بحار الانوار:۱/۱۲)

وزاد في تفسير "أزق: اي السهر، هو مفارقة النوم بوسوسة او خوف

او نحوها، من شرح المشكوة للطيبي.

لـمثـل هـذه الميزات والخصائص قد نال الكتاب شرفا عظيما وقبولا عاما فى أوساط العلم والدين و حلقات العلماء والطلاب،تتداوله ايدى العلماء والـطـلاب الـى يـومنا هذا ، و في الزمن الذي صنف فيه المصنف هذا الكتاب ايـضـا نال قبولا عاما والتفاتا خاصا بشكل واضح ملموس، فانتشرت عدد كبير من نسخ هذا الكتاب في بلاد الهند وخارجها، ولهذا الكتاب منة عظيمة وفضل كبيـر على كل من طـلـب الـعـلم واستفاد من فن الحديث النبوى ، وقد استطرد سـمـاحة المحدث الكبير حبيب الرحمان الاعظمي قـائلا : ان جهابذ العلماء صـرفوا عنايتهم الى هذا الكتاب صرفا بالغا، بهذا السبب نال الكتاب قبولا عاما شـامـلا فـي زمـن التأليف نفسه وانتشرت النسخ والنقول الى اقصى البلاد. وقد مـال اهـل الهند الى هذا الكتاب واهتموا به حيث لم توجد اية مكتبة اسلامية لم تحتوي على هذا الكتاب الجامع .قد يراجع جميع أهل العلم والفن هذا الكتاب عـنـد مـا تـمـس الحاجة اليه .وقد يحتمل مكانة مرموقة فى المصادر والمراجع وأرباب العلم ينقطعون الى الاستفادة منه .

سبب تأليف مجمع بحار الأنوار :

وقـد ذكر المحدث الفتني رحمه الله تعالى الاوضاع والظروف التى اعتـرته قبل التشاغل فى بداية كتاب حيث قال ذكراعن تاليف الكتاب: و

قـد عـنّ لـخاطري الفاتر أن همم أهل البلاد اليه فاترة ، والاعمار قاصرة ، والعدة معهم يسير ، والامرخطير، فمقتضى احوالهم ان يكون الكلام مقتصرا على حل الـغـرائب للقرآن والاخبار، ومتضمنا لما فيها من الرموز والاسرار، مشتملا على وجـوه العبر ونظم الفرائد ، محذوفا عنه ما لايحظي الا من تبحر في هذا الفن و تـأهـل لتـلك الـزوائـد ، مرتبا على ترتيب حروف التهجى ليسهل الوصول الى الـمـعانى ، ويسقط التكرار، ويبين المواضع والمباني، فحركني ذلك أن أصرف زبدة أوقـاتـي بـعـد مبـاحثة أصـحـابي الى ذلك الجناب، ليكون ذلك من قنية عمري ذخيرة لـلـمـآب ، واسـوّد عـلى ذلك المنهج شرحا للصحيحين وجامع الاصول ، وآخر للمشكاة ليسهل الوصول، ثم استطلت أن احمل الخلة رفعها، واكـلـفهـم جـمـعها، كراهة ما فيها من الاشياء المعادة ، وان كانت لاتخلو عن الافـادة ، فاردت ان استصفى منها الـمختصر، وانقى عن كل ماتكرر ، فجعلت كتـاب النهاية لابن الاثير أصلا له فـلا اذكـر منها الا ماليس له تعرض دونه، ولـم اغـادر مـنـه الا مـانـدر، أوشـاع بيـنهـم وانتشـر ، وأضم الى ذلك ما فى ناظرعين الـغريبين من الفوائد، وما عثرت عليها من غير تلك الكتب من الزوائد ليكون لـلـطالب فى أكثر الاحاديث و معظمها كافيا ، بل لحل العوائد فى فنون العلم وغـرائـب الـقرآن وافيا، واذا مايسر الله تعالى اتمامه على هذا المنهج أتوسل الى خدمة ذلك الجناب العالى شيخى الشفيق المشفق ذى المفاخر والمعالى قطب

الاوان، وغوث الزمان، وصفوة الرحمن ، نزيل الحرمين ، مجاور بيت الله ، مربي الانام ، مرشد الكرام ، اعني الشيخ علي المتقي ابن حسام افاض الله فيض تقواه على الداني والقاصي علي الدوام ليكون ذريعة لشفاعته يوم الفزع الاكبر في ذلك المقام ولاخذ اليد في يوم تزل فيه الاقدام.

ثناء العلماء على هذا الكتاب:

قد جاء في كتاب"تذكرة المحدثين" ان الكتاب"مجمع بحار الانوار"يمتلك مقاما عظيما قد ذكر المصنف الشيخ الفتني في مقدمة الكتاب علم الحديث وألقى الضوء على اهميته البالغة في الشريعة الاسلامية ، وهكذا القى الضوء على المصنفين القدماء وكتبهم عن غرائب الحديث ثم ذكر سبب تاليف كتابه "مجمع بحار الانوار"وبين أسلوبه الذى توخاه للقيام بتأليف هذا الكتاب والاصول والقواعد التي هي لازمة لمن أراد أن يستفيد منه و يفيد به .

وبالجملة أنه الى جانب كونه اجمع تاليف فى غريب الحديث كتاب ممتع فى شرح معانى الحديث وتفسير غامضه ، ولذلك ترى الشيخ عبدالحق المحدث الدهلوي يقول في ترجمة مؤلفه"ان له كتابا يتكفل بشرح الصحاح (الكتب الستة) يسمى مجمع البحار" .

ويقول العلامة السيد صديق حسن القنوجي يصفه: وبالجملة أن هذا الكتاب المستطاب جامع لغريبي القرآن والحديث لايحتاج واجده الى كتاب

آخر في هذا الفن، و كأنه شرح لكتب الستة المشهورة بالصحاح.

وقد جاء في "التاريخ الأحمدي" ان الكتاب "مجمع البحار" يضم بشرح الصحاح الستة المشهورة ، هكذا يقول مؤلف كتاب" گلزار ابرار" ان مجمع بحار الانوار هو شرح الصحاح الستة. والشيخ عبد الوهاب صاحب الشيخ علي المتقي يقول عن هذا الكتاب"ان مجمع بحار الانوار كتاب اللغة ولكنه كتاب شرح الأحاديث الآخر".

الدكتور زَبيد احمد يكتب عن هذا الكتاب :"ان مجمع بحار الانوار كتاب أنيق جدير بالمدح ، هذا الكتاب يضم جميع لغات القرآن والحديث الغريبة ،وقد رتبت الألفاظ وفق مواد الحروف التي وردت في القرآن والحديث من مادة واحدة قد ضمها كلها كتاب مجمع بحار الانوار للشيخ الفتني رحمه الله تعالى في موضع واحد حيث يجدها القاري فى مقام بلا تعب ولا نصب.

والجدير بالذكر أن الشيخ الفتنى يذكر اللغات فى الحديث الذى جائت فيها اللغات .وقد كتب وألف كثير من المؤلفات والمصنفات حول هذا الموضوع الانيق و لكن الكتاب مجمع بحار الانوار اجمع واحسن وانفع واوعى فيما أراه.

وقد رقم صاحب معجم المطبوعات فى كتابه :" هذا الكتاب أجمع وأنفع لكشف القناع عن فحوى الحديث و القرآن ".

واخيرا، قد ألقينا الضوء على مجمع بحار الأنوار في عدة سطور حسب استطاعتنا، هذا ، ونرى من اداء الحق والاعتراف الجميل ان نشكر أركان مجمع الفقه الإسلامي الهند، واركان الجامعة الملية بدهلي على انهم اتاح لنا الفرصة لهذا العمل العلمي .

هذا ، ونسأل الله الكريم ان يوفقهم ولنا للمزيد من أمثال هذه الخدمة ويجعل هذه خالصا لوجهه الكريم والحمد لله اولا وآخرا ، والسلام على سيدنا محمد وآله وصحبه أجمعين.